

شکرتاشا

شازیہ چوہدری



3	ٹکے داتماشا	- 1
33	خوبصورت غلطی	- 2
67	تمہیں اپنا بنا لیں	- 3
101	لو بہار آگئی	- 4
137	آگئے ہیں نکھار کے موسم	- 5
173	زندگی سوز و محبت کے سوا	- 6
215	کچھ رنگ نئے ہیں	- 7



ٹکے داتماشا

آج اتنے طویل سالوں میں مہ رخ اس طرح روئی تھی۔

نہ کوئی داویلا، نہ دہائی۔

نہ ہی پلو پھیلا پھیلا کر بدعائیں

نہ اپنا ”صبر“ پڑنے کی نوید

آج تو سر پہ دوپٹہ بھی نہ بندھا تھا۔۔۔

روئی بھی باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ تھی ورنہ اس سے پہلے وہ رو تو رہی ہوتی لیکن چند ہی آنسو

کل آنکھوں سے نکل کر چہرے کا رخ کرتے۔ جس کا سہ باب وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر بہ خوبی کر لیتی تھی۔

یہ آج تو آنسوؤں کا سیل رواں تھا جو ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

شدت گرہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ گلابی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ گزشتہ دو گھنٹوں سے ایک

انداز میں بیٹھی، گرد و پیش سے بے خبر روئے جا رہی تھی۔

آج اسے کسی دکھاوے کی ضرورت نہ تھی، ورنہ مہ رخ، ونا، اس کے مین، اس کا چلا نا ایسا ہوتا

کہ آس پاس کی عورتیں، ہمیشہ ہی بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھیں پر آج۔۔۔۔



بارہ سالہ ذیشان، سات سال کی صبا اور دو ماہ کی حنا۔ زندگی کتنی مکمل اور بھرپور لگ رہی تھی۔ آہستہ

ی سے بہاروں کی جانب جاتی ہوئی، ابھی کل ہی تو ظہیر حنا کو گود میں اٹھائے کہہ رہے تھے۔

”میری بیٹی بہت خوش قسمت ہے۔ جب سے آئی ہے۔ گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔ میری

تنے سالوں کی رکی ہوئی ترتی ہو گئی۔ مکان کا مقدمہ بھی ہم جیت گئے۔“ وہ کتنی محبت بھری نظروں سے

مانٹھے سے وجود کو دیکھ رہے تھے۔

”رقیہ! بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اب ان دو کمروں میں گزارا نہیں ہوگا۔“ وہ اب رقیہ کی طرف

بہہ تھے۔ ”ان گرمیوں میں آگے بیٹھک بنوا لیتے ہیں۔“ رقیہ کا جواب سنے بغیر وہ دوبارہ حنا کی طرف

بہہ ہو گئے تھے۔ تب تقدیر نزدیک ہی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”ابو جی! آپ نے کہا تھا کہ آج نیم بھولا ڈال کے دیں گے۔“ صبارتی لیے کھڑی تھی۔
 ”ارے ابو کی جان! آج گزرتو نہیں گئی نا۔ ابھی بھولا ڈال دیتے ہیں، اپنی گڑیا بیٹی کے۔
 انہوں نے اس کی چھوٹی سی ناک کو ہولے سے چھوتے ہوئے کہا۔
 ”لو بھئی، صبا کا بھولا تیار ہو گیا۔“ انہوں نے اس کو جھولے پر بٹھایا تو وہ خوش ہو گئی۔ ظہیر اس
 ہی اچھلاتے رہے۔ جب ہی رقیہ نے ان کو چائے کے لیے اندر آنے کو کہا۔
 ”بیٹا! کل سے ہم ساری شام اپنی بیٹی کو جھولا جھلا میں گے۔“ اس کے گالوں پہ پیار کر کے و
 آئے۔

ذیشان اپنے اسکول کے کام میں مصروف تھا۔ ”ابو! مجھے میتھس سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کچھ
 کرایا کریں۔“
 ”آج نہیں یار کل سے ان شاء اللہ۔ رقیہ کل سے روٹین کچھ اور سیٹ کرتا ہوں تاکہ بچوں کے
 زیادہ اہم مل سکے۔“
 ظہیر اور رقیہ نے تنکا تنکا اکٹھا کر کے آشیانہ بنایا تھا۔ زندگی کے گرم سرد کچھ کردہ اس موڑ تک
 تھے۔ رقیہ کے تو ماں باپ اس کے ہوش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ تایا کے پاس اس کو صرف
 اور چوت کی عیاشی میسر رہی۔ ظہیر کے والدین البتہ ان کی شادی کے کچھ عرصہ بعد فوت ہوئے تھے۔
 سے بڑے بھائی اور بہن کراچی میں رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح بالکل عام سی تھی۔ کہتے ہیں کہ آنے والے وقت کا سایہ پہلے پڑ جاتا ہے لیکن کم از کم
 اندر سے موڑ کا رقیہ کو بالکل اندازہ نہ تھا۔

وہ دونوں ہی سحر خیزی کے عادی تھے۔ اس صبح بھی دونوں نے نماز پڑھی تو رقیہ بچن میں چلی گئی
 ظہیر رات کی روٹی کے چھوٹے چھوٹے سے کر کے چڑیوں کو ڈالنے لگے، یہ ان کا برسوں کا معمول
 ان کی چھوٹی سی کوری دھو کر تازہ پانی سے بھری اور ذیشان کو جگانے لگے۔ صبا نے خبر سوری تھی۔ ا
 اٹھا۔ کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اسکول جانا ضروری تھا، لہذا ہولے ہولے اس کا سر دو تیز
 سہلایا تو وہ بھی اٹھ بیٹھی۔

اتنی دیر میں رقیہ ناشائستا پچکی تھی۔ بچن میں ہی بیٹھ کر چاروں نے ناشتا کیا۔ حنا بدستور سوری تھی
 ویسے ہی نوبت تک ہی اچھتی تھی۔ بچوں کو اسکول بھیج کر ظہیر بھی دفتر روانہ ہو گئے۔

رقیہ اب جلدی جلدی کام منٹا رہی تھی۔ حنا کے اٹھنے سے پہلے جتنا کام ہو جائے بہتر ہے۔ ا
 کر رہے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”آج تو مشین بھی ضرور لگانی ہے۔“ ظہیر کے آفس میں فنکشن ہے اور
 براؤن سوٹ میلا ہے۔“

اسی وقت ان کے دروازے کو کسی نے بہت زور سے پیٹ ڈالا۔ کچھ عجیب سی ملی جلی آواز
 آ رہی تھیں۔ رقیہ نے بڑی جلدت میں دروازہ کھولا۔
 وہ بعد میں مدتوں کبھی اس بات پر حیران، کبھی شاک اور کبھی افسردہ رہی کہ اس روز وہ و
 کھولنے کے بعد ظہیر کو خون میں نہائے، کسی اجنبی شخص کے بازوؤں میں بے جان لٹکے دیکھ کر وہ

وہ نہ گئی؟
 اس روز ظہیر نے اسٹاپ پر ابھی پاؤں دھرا ہی تھا کہ پیچھے سے آنے والی تیز رفتار بس ان کو کچلنے
 لے چلی گئی۔

آج ظہیر کو گزرے چوتھا دن تھا۔ تین دن سے تو محلے کے کسی گھر سے کھانا آ رہا تھا کہ رسم دنیا بھی
 ی۔ ظہیر کے بھائی، بہن آج رات کراچی روانہ ہو رہے تھے۔ ان کی گھر بیلو مصروفیات، گھر داری کے
 اٹھے، ملازمت، بچے، ان کی چھٹیاں۔۔۔ اس سے زیادہ بھائی کا عم منانے کی اجازت نہ دے رہے
 تھے۔ چلتے چلتے ظہیر کے بھائی نے اس کو ہزار ہزار کے کچھ نوٹ تھما دیے تھے۔ ہماری طرف سے کہہ کر۔
 رقیہ اب بالکل تنہا بیٹھی تھی۔ حنا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو منہ میں ڈال کر چوس رہی تھی۔ اپنے
 پ کی خوش نصیب بیٹی کی بد قسمتی پر ان تین دنوں میں سب نے خوب ترس کھایا تھا۔

صبا پہلے بھی شرارتی نہ تھی۔ اب کچھ اور سہم گئی تھی۔ ذیشان قدرے سمجھ دار تھا وہ یہ بات بہت اچھی
 روح سمجھ رہا تھا کہ اب صرف میتھ کے سوال نہیں زندگی کے ہر سوال کا جواب خود ہی تلاش کرنا ہے۔ اب
 ندگی ہوگی اور اس کی کڑی دھوپ، راہ میں کوئی شہر سایہ دار نہیں۔

”اب میں کیا کروں؟ نہ تعلیم نہ ہنر۔۔۔ کہاں سے زندگی کی ابھی ہوئی ڈور کا سرا تلاش کروں۔“
 قیہ سوچوں کے جانے کون کون سے تانے بانے بن رہی تھی۔ آنسو ایک تو اتر سے بے چلے جا رہے تھے
 ”رقیہ! اٹھو دیکھو یہ حنا کب سے رو رہی ہے۔ اس کو دودھ پلاؤ۔“ سلیہ خالہ کی آواز نے اس کو
 بونکا دیا۔ خالہ کے مہربان چہرے کو دیکھ کر وہ دوبارہ رونے لگی۔ نہ جانے کتنی دیر روئی رہی۔

”رقیہ! میرے بچے! پلی لے ان آنسوؤں کو، یہ رونا تو اب عمر بھر کا ہے۔“ خالہ کے لہجے میں جانے
 کن زمانوں کا تجربہ تھا۔

”رقیہ بیٹے! بچوں کو کچھ کھلایا ہے یا نہیں۔ میں نے کھانا باورچی خانے میں رکھا ہے۔ گرم کر کے
 ادھر ہی لے آؤ۔ میں بھی ادھر ہی کھاؤں گی۔ اٹھو شاباش، میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔“
 خالہ کو اٹھتا دیکھ کر رقیہ بھی نیم دلی سے اٹھ گئی۔ اندر رروں بچے اپنی کتابیں کھول کر بیٹھے تھے۔
 تے تے، میلے۔ اور سہمے ہوئے چہرے۔

خالہ نے ان دونوں کو منہ ہاتھ دھونے کو کہا اور اتنی دیر میں ان کے صاف کپڑے نکال لیے۔ بچوں
 کو صاف ستھرا کر کے اندر لے کر آئی تو خالہ دسترخوان بچھائے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

”میں نے آج اپنے دونوں بچوں کی پسند کا کھانا بنایا ہے۔ قیمہ مٹر اور چاول، چلو شاباش بچو اب
 جلدی سے شروع کرو۔ مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ خالہ، شاید بول کر ماحول کے ستارے اور
 دھشت کو کم کر رہی تھیں۔

بہر حال بچے ذہنی طور پر بہل سے گئے۔ کھانے کے بعد رقیہ تو دسترخوان سمیٹنے میں لگ گئی اور خالہ
 دونوں بچوں کو لے کر لیٹ گئیں۔ ان کو کہانی سنا کر سلا یا۔ پھر اٹھ کر رقیہ کے پاس آ گئیں۔ رقیہ بھی حنا کو
 سلا چکی تھی۔

”بیٹا! جب تک تمہاری عدت ختم نہیں ہوتی۔ میں رات کو ادھر ہی سویا کروں گی۔“ رقیہ مشکوری
 ہوئی۔

خالی نے صبح اٹھ کر ذیشان اور صبا کو اسکول بھیج دیا۔ خود سبزی لینے چلی گئیں۔ واپس آئیں تو رات وہیں بیٹھی تھی۔ آنسوؤں کے مٹے مٹے نشان اس کے سانولے، کمزور سے چہرے پہ بہت نمایاں تھے۔ ایک خانماں برباد عورت کی مکمل تصویر لگ رہی تھیں۔ ان کا دل دہل سا گیا۔

”حد ہوگئی رقیہ! تم نے ابھی گھر تک سیٹنا شروع نہیں کیا اور دوپہر سر پر آگئی ہے۔“ ان کے ناراضے انداز پر رقیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کو کام میں مصروف کر کے وہ گھر چلی آئیں۔

آج ظہیر کا دسواں تھا۔ دن بھی اتنے طویل بھی ہو سکتے ہیں۔ رقیہ کو اندازہ نہ تھا۔ بیٹی کے کٹم شب روز بھی اس نے گزارے تھے۔ لیکن ماں باپ اتنی کم سنی میں گزر گئے تھے کہ ان کی ٹھنڈی چھاؤ کا کچھ احساس نہ تھا۔ یہ یہاں تو چودہ سالہ رفاقت پل بھر میں ٹوٹ گئی تھی۔ ظہیر تو اس کی ذات کے موسم کا سا بھی تھا۔ بن گئے اس کے دل کی بات جاننے والا۔ وہ پہاڑ کی طرح کسی موسم کی سختی، زندگی کی کوئی شدت اس تک آنے ہی نہ دیتا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ بس یوں ہی بہاروں کے سنگ سنگ زندگی گزر جائے گی۔

دسویں کے بعد ظہیر کے آفس کے ایم۔ ڈی نے ذیشان کو پچاس ہزار کا چیک دیا جو کہ اس کے ساتھیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت جمع کیے تھے اور عدت کے دوران ظہیر کی پوری تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور بیس ہزار رقم نے اپنی طرف سے دیے تھے۔

اس رات بچوں کو سنانے کے بعد خالہ، رقیہ سے پوچھنے لگیں۔ ”اب کیا سوچا ہے زندگی کس طرح گزارنی ہے؟“

”خالہ! مجھے تو خود اس سوال کا جواب نہیں معلوم، میں خود سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں۔“ رقیہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

”بیٹا! ایک تو ان آنسوؤں کو اب آنکھوں کے اندر ہی ختم کر ڈالو۔ تمہارا سفر بہت مشکل ہے۔ مسمت کا نئے ہی کاٹنے ہیں۔ تمہاری ہمت تمہاری زاد راہ ہے۔ جس سے تم نے اپنے مشکل تر سفر کو آسار کرنا ہے۔“ خالہ اب نیکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔

”رقیہ! اس وقت تو تمہارے پاس رقم ہے پر اگر بیٹھ کر کھاؤ گی تو سال بھر بھی نہ چلیں گے۔ تعبیر تمہاری اتنی نہیں کہ کوئی ڈھنگ کی نوکری مل سکے پھر۔۔۔؟“ اب وہ رقیہ کی طرف متوجہ تھیں۔

”خالہ! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں اب گھر بیٹھ کر نہیں آ سکتی۔ لیکن ان الجھے ہوئے حالات کا کوئی سرا بھی ہاتھ نہیں لگ رہا۔ آپ کوئی مشورہ دیں۔“ رقیہ۔ سارا بوجھ خالہ پر ڈال دیا۔

”رقیہ بیٹا! پچھلے مہلے کی کچھ عورتیں بوتیک وغیرہ کے لیے کڑھائی اور سلائی کا کام کرتی ہیں معاوضہ بھی مناسب ہے۔ یہ دونوں ہنر تمہارے پاس ہیں۔ میں تمہیں کام لادیا کروں گی۔ مجھے تو اس کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آگے تمہاری مرضی۔“

”نہیں خالہ! مرضی والی عیاشی اب میری زندگی میں نہیں رہی۔ اب تو مجبوری ہے۔ آپ کل یہ کام مجھے لادیں۔“ اور یوں تھوڑے دن بعد زندگی کی گاڑی چلنا شروع ہوگئی۔ شروع میں تو ہر ٹانگے پر ظہیر کی یاد آتی۔ دھاگوں کے رنگ ان ہی بہاروں میں لے جاتے

انہیں گویا دھندلی ہی رہتیں۔ گھر میں بچوں کی مدھری چکار گونجا کرتی تھی پر اب ایک سانے کا راج نا۔ خاموشی صرف حنا کے رونے کی آواز سے ٹوٹی۔ رقیہ سوچتی کہ ایک ظہیر کے جانے سے جیسے ”رعنائی“ ل، ہی زندگی میں نہ رہی ہو۔

صبا ہر شام اس جھولے کے پاس کھڑی ہو کر اس پر کتنی کتنی دیر ہاتھ پھیرتی رہتی مگر جھولا نہ جھولتی۔ عی جو رقیہ کہہ دیتی ”شان! بہن! کو جھولا جھلاؤ“ تو وہ بڑی شدت سے منع کرتی۔ پتا نہیں وہ جھولا اس دلی سی پچی کے لیے کتنی نا تمام خواہشوں اور وعدوں کا عکس بن گیا تھا۔

☆☆☆

چار ماہ بعد عدت ختم ہوگئی تو وہ خالہ کے ساتھ خود جا کر آرڈر کا کام لینے لگی۔ وہ اب کچھ حوصلہ کر رہی تھی۔ اس کو خالہ کا ساتھ بڑا غنیمت لگا کرتا تھا۔ وہ ان پر بوجھ نہ بننا چاہتی تھی مبادا خالہ اکٹبا ہی نہ

لیکن روز و شب کی اس مصروفیت میں اس کے پاس بچوں کے لیے وقت نہ رہتا۔ وہ منتظر رہتے کہ اب امی ہمارے پاس آ کر سوئیں گی۔ ہمیں کوئی کہانی سنائیں گی، ہم سے پوچھ کر کوئی اچھا سا کھانا میں گی، یا پڑھائی میں کوئی مدد کریں گی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہ اسکول سے آتے تو رقیہ ان کا کھانا کر بوتیک جانے کو تیار ہوتی۔ منجھی حنا کوان کے حوالے کرتی اور کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر چلی جاتی۔ وہ نون کھانا کھا کر برتن بھی دھو لیتے۔ بھی حنا کے ساتھ کھینچ لگ جاتے یا سو جاتے۔

رقیہ اکثر واپسی پر ہی گھر کا رومرہ کا سودا سلف بھی لے آتی۔ واپسی پر وہ اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ تے ہی سو جاتی۔ شام کو دوبارہ سلائی یا کڑھائی۔

جن بچوں کے لیے وہ دن رات محنت کر رہی تھی۔ ان پر ایک پیار بھری نظر ڈالنے کی، ان کے ماتھے بوسہ دینے کی فرصت عموماً اس وقت ملتی جب وہ سو چکے ہوتے۔ وہ ان کے کمزور ہوتے وجود، کملائے

دئے چہرے دیکھتی تو بول جاتی۔ لیکن حالات کا گرداب جیسے اس کو گھمائے جا رہا تھا۔

”خالہ! میں کیا کروں۔ بچے بہت سہمے رہتے ہیں۔ باپ ویسے ہی خدا نے بلا لیا اور ماں سے جیتے محروم ہو گئے۔“ وہ سسک پڑی۔

”رقیہ بیٹے! میں آج یہ ہی بات تم سے کرنے آئی تھی۔ ظاہر کہہ رہا تھا کہ اگر بھابھی گھر میں کاپیاں ملیں وغیرہ رکھ لیں۔ میں اردو بازار سے لادیا کروں گا۔ اس میں بہت بچت ہے۔“

رقیہ نے انگلی دن خالہ کو دس ہزار روپے بینک سے نکلوا کر دے دیے۔ ظاہر جب اسٹیشنری لے کر یا تو رقیہ اتنا ڈھیر دیکھ کر دہل ہی گئی۔

”یا اللہ! میں کیوں کر بیچ پاؤں گی۔ میرے تو دس ہزار بھی گئے۔“ وہ یوں بھی بہت جلد ہمت رنے لگی تھی۔

”بھابھی! ادھر آئیں۔ ان کی قیمت سمجھ لیں۔“ ظاہر کی آواز پر وہ مرے مرے قدموں سے چلتے وئے آگے آئی۔ لیکن رقیہ کے وہ اندیشے، وہ سب خام خیال ہی رہے۔

ارد گرد پر چون کی دکانیں تو تھیں۔ اسٹیشنری کی نہیں۔ کچھ درمیانے طبقے کی اس آبادی میں خوف

ندابھی موجود تھا۔ کہیں اور سے خریدنے کے بجائے رقیہ کو ترجیح دیتے۔

دوبارہ بعد نئے تعلیمی سال کے شروع ہونے سے پہلے اس کو طاہر نے نزدیکی اسکولوں کے نصاب کے سیٹ لا دیے تھے یہ کام رقیہ کی توقعات کے برعکس منافع بخش تھا۔ اب وہ سلائی کڑھائی کا کام بیچور کے اسکول جانے کے بعد ہی کرتی۔ بعد کا سارا وقت بچوں کے لیے تھا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں وہ دلچسپی لیتی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتی۔ وہ ظہیر کی کمی تو پوری نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کی شدت کو کم کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتی۔

زندگی قدرے ٹھہرے ہوئے انداز میں آگے بڑھنے لگی۔

رقیہ چونک گئی جب چھوٹی سی حناون کلاس میں آگئی۔ کتنا وقت گزر گیا۔ ابھی کل کی بات تھی جب وہ ظہیر اس آٹکن میں اپنے بچوں کو بڑا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کتنے خواب مشترک تھے۔ وہ سال خوردہ سا جھولا، شکستہ سا اب بھی نیم پر لٹک رہا تھا۔ جس پر صبا دوبارہ کبھی نہیں بیٹھی۔ ہر اس کو چھو کر محسوس کرتی رہی۔ بارہ سالہ صبا کو وہ شفیق سا وجود، اب بھی اپنی تمام تر نرمیوں کے ساتھ دھندلا دھندلا سیاد تھا۔ اور اس سے کیا وہ ناتمام وعدہ۔ وہ بہت عرصہ اس شام کا انتظار کرتی رہی جس کا وعدہ اس کے ابو نے کیا تھا۔

ایک روز جب سچر نے اسکول میں بتایا تھا کہ جن کو اللہ تعالیٰ بلا لیتے ہیں، وہ دوبارہ کبھی واپس نہیں آتے تو اس کا ننھا سادل جیسے ڈوب سا گیا تھا۔

”سچر! اگر انہوں نے کوئی وعدہ کیا ہو۔ اس کو پورا کرنے کے لیے بھی نہیں۔“ اس نے قدرے شکستگی کے عالم میں پوچھا تھا۔

”نہیں بیٹا!“ سچر نے اس کو ترحم آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”بہادر بچے کسی وعدے کا انتظار نہیں کرتے۔“

تب صبا بہت کوشش کے باوجود سچر کو بتانے لگی کہ وہ تو بہت بزدل ہے۔ کتنے ہی آنسو اس کے اندر گر رہے۔ اسکول کا وہ دن اس کو بہت طویل لگا تھا۔ گھر آ کر وہ بہت روئی تھی۔ اسی طرح روتے روتے سو گئی۔ رقیہ کے بہت پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا۔

شام تک اس کو تیز بخار چڑھ چکا تھا۔ حنا اس گھر کی رونق تھی۔ ہنسی مسکراتی ماں کی لاڈلی اور بھائی بہن کی پیاری۔ اس کی شرارتوں سے ان کے گھر کا سناٹا ٹوٹا۔ اس کی ہنسی کی جلتنگ سے اس اداس سے گھر میں زندگی کا نغمہ گونجتا۔ زندگی کے گرم سرد چمکتے۔ یہ چھوٹا سا گھر ان اب قدرے آسانوں کی طرف آ گیا تھا۔ ایم۔ کام کرنے کے بعد ذیشان کو بینک میں اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ یہ بھی اس کو سلیمہ خالہ کے بیٹے طاہر کی کوششوں سے ملی تھی۔

رقیہ اکثر سوچتی کہ اللہ نے سلیمہ خالہ کو اس لیے رحمت کا فرشتہ بنا دیا۔

زندگی کی جدوجہد میں ان کا وجود اس کے لیے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ رہا۔ ہر کڑے وقت میں وہ اس کے ساتھ رہیں۔

جب وہ ہمت ہارتی تو سب سے پہلا ہاتھ جو اس کو مایوسی کی دلدل سے نکالنے آگے بڑھتا وہ ان ہی کا ہوتا۔

ذیشان اب پچیس سال کا ہو چکا تھا۔ صاوشیا لوجی میں ماسٹرز کر رہی تھی اور حنا آٹھویں میں تھی ذیشان نے ملازمت ملتے ہی اپنی ماں سے سلائی کا کام بند کرنے کی درخواست کی تھی۔ رقیہ کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی، کل کی وہ لڑکی ایک بھاری بھر کم عورت کے روپ میں ڈھل چکی تھی ان میں اب خود بھی ہمت نہ تھی۔ زندگی کا سفر تنہا کاٹنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس وادی پر خار نے ان کے روم روم کو تھکا ڈالا تھا۔ وہ بھی اب سستانا چاہتی تھیں۔

”خالہ! صبا کے ماسٹرز کرنے میں ابھی ڈیڑھ سال باقی ہے۔ میں ذیشان کی شادی کا سوچ رہی ہوں۔ مدت ہو گئی ہے ہمارے گھر سے خوشی کو رخصت ہوئے۔ شانی کی شادی سے ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔“

یوں سلیمہ خالہ اور رقیہ ذیشان کے لیے اچھی لڑکی کی تلاش میں مہر رخ کے گھر جا پہنچیں۔ مہر رخ چاروں بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ خوب صورتی وہ بھی اتنی افراط میں۔ ہر بہن سراپا غزل۔ خود مہر رخ سرودہ، سبیل بدن، غنچہ دہن، خوب صورتی کے ہر استعارے پر پورا تری، وہ تو گویا رقیہ کے دل میں ہی بس گئی۔ خالہ کو البتہ اس گھرانے کے رنگ ڈھنگ اچھے نہ لگے۔

”اے لو۔ پتا بھی تھا، ہمارے آنے کا پر سارا سامان بازاری اور وہ بھی ٹھنڈا اٹھار۔“

”خالہ! یہ تو کوئی نقص نہ ہوا۔“

”اور جو میں بہانے سے ذرا گھر کے اندر گئی۔ تو بہ تو بہ باورچی خانے میں ابھی تک ناشتے کے برتن بھی سڑ رہے تھے۔ کوڑے کی ٹوکری تو جیسے ابل رہی تھی۔ سارا گھر اوندھا پڑا تھا اور ماں بیٹیاں کیسے جگر جگر کر رہی تھیں۔ رقیہ بیٹا! اپنے ذیشان میں بھلا کی کیا ہے۔ بانکا بھلا، کماؤ۔ میری ماں کوئی اور گھر دیکھ لیں گے۔“ خالہ گھر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

رقیہ یہ احوال سن کر کچھ متذبذب میں پڑ گئی تھیں لیکن مہر رخ کی بھولی بھالی، شوخ سی صورت دل سے نکل نہ رہی تھی۔ رقیہ کو لگ رہا تھا کہ مہر رخ کے آجانے سے ان کے سنجیدہ سے بیٹے کی زندگی میں بہار آجائے گی۔ ان کا گھر جگمگ جائے گا۔

صبا اور حنا بھی بہت پرجوش تھیں۔ ایک طویل مدت بعد خوشی کی لہر ان کی زندگی میں دوڑ گئی تھی۔ ذیشان البتہ بہنوں سے پہلے اپنی شادی کے حق میں نہ تھا لیکن رقیہ نے اس کا ہر اعتراض مسترد کر دیا تھا۔ مہر رخ کے سلسلے میں خالہ نے دوبارہ بھی رقیہ کو روکا لیکن مہر رخ جیسے رقیہ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ ایک شام وہ خالہ کو دوبارہ ساتھ لے کر رشتے کے لیے ہاں کرائیں۔

چند دن بعد سادہ سی تقریب میں انہوں نے مہر رخ کو ذیشان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔

مفتی کے بعد تو ان لوگوں کی آمدورفت ایسے بڑھی کہ یہ لوگ بوکھلا ہی گئے۔ عموماً نو بجے ہی آجاتے اور رات کا کھانا کھا کر واپسی ہوتی مہر رخ بھی اکثر ہی ساتھ ہوتی۔

”یہ تو مان ہی نہیں رہی تھی۔ زبردستی ساتھ لائی ہوں۔ چلتے چلتے ہاتھ پکڑ کر رکشے میں بٹھایا ہے۔“

صبا کو اکثر ان لوگوں کی وجہ سے یونیورسٹی سے چھٹی کرنا پڑتی۔ مہر رخ کے آنے میں اس کو بھی زبردستی کا عنصر تو لگا ہی نہ تھا، بلکہ اس کے خیال میں تو وہ ذوق و شوق اور رغبت سے آتی تھی۔

جس روز وہ رکشے میں زبردستی بٹھائی گئی تھی۔ اس روز اس نے گھرے جانی اور زرد رنگ کا

نہایت شوخ سوٹ پہن رکھا تھا۔ جوتوں میں بھی یہی دورنگ نمایاں تھے۔ کانوں میں جامنی رنگ کے آویزے اور بالوں میں زرد کلپ۔

”اس گرمی میں کمال ہمت ہے بھابھی نے اس طرح کی ڈریسنگ کر رکھی ہے۔“ اس سے آگے کچھ اور سوچ نہ سکی۔ کمال یہ تھا کہ بہنوں میں سے کوئی تکلفاً بچن میں آکر جھانکتا بھی نہ تھا۔ پانی پی کر کسی بھی نزدیکی جگہ گلاس رکھ دیتیں جیسے کسی پینک اسپاٹ پر آئی ہوں اور پھر از خود ہی مینو بھی بتا دیا جاتا۔

”بھئی۔ سبزی اکیلے مزائیں دیتی۔ کرپلوں میں ڈر اساقیہ بھون لیں بہن۔“

”آئی! اس روز آپ نے پودینے کی چٹنی بہت اچھی بنائی تھی۔ آج بھی بنالیں۔“

اس بار وہ آئین تو صابون روٹی جا چکی تھی۔ رقیہ نے پہلے تو ٹھنڈے سے ان کی خاطر کی۔ پھر چائے اور بسکٹ وغیرہ بھی رکھ دیے۔ اب وہ سب فراغت سے بیٹھی تھیں۔ رقیہ سوچ رہی تھیں کہ کیا کریں۔ فریج میں آلو میٹن رکھے تھے۔ صبا کہہ کر گئی تھی کہ میں شام کو پکالوں گی۔ آپ آج آرام ہی کیجیے گا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ آخر سوچ کر قیہ چڑھایا اور ساتھ ہی چاول چنے لگیں۔

دودن سے بخار تھا جس کی وجہ سے کچھ کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی مہر رخ وغیرہ کو بتا بھی دیا تھا لیکن کوئی بچن میں آکر کھڑا بھی نہ ہوا۔ وہ چاول دم دے کر فارغ ہوئی تھی جب جنا اسکول سے آئی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ دیکھنے بھی صبا اور ذیشان سے بالکل مختلف تھی۔ ماں کو اس نے زبردستی دوسرے کمرے میں لٹا دیا۔ خود سلا دکاٹنے لگی۔ راستہ بنا کر مہر رخ کی چھوٹی بہن کو آواز دی۔

”سیسین! ڈرا پلیر روٹی ڈال دو۔ مجھ میں تو اب ہمت نہیں ہے۔“

”اور آئی؟“

”ان کو دوبارہ بخار چڑھ گیا تھا۔ دوائی دے کر لٹایا ہے۔“

”لیکن مجھے تو روٹی پکانی نہیں آتی۔“

”اس دن تو آئی کہہ رہی تھیں کہ میری تو چاروں بیٹیاں ایسی روٹی پکاتی ہیں کہ جو دیکھتا ہے، وہ بس عیش عیش ہی کر اٹھتا ہے۔“

”امی تو بس۔“ سیسین نے دانت کچکائے۔

اس گھرانے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر رقیہ اب جی ہی جی میں ہولا کرتیں۔ کبھی دل میں آتا کہ یہ رشتہ ہی ختم کر ڈالیں۔ پر یہ شریفوں کا شیوہ نہ لگتا۔

آج کل گھر میں بھی کام شروع کروایا ہوا تھا۔ مستری مزدور لگے تو گویا آسب کی طرح چٹ ہی گئے۔ قریباً ڈیڑھ ماہ بعد کام مکمل ہوا تو صاف ستھرا گھر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ رقیہ کو ظہیر کی بات یاد آ رہی تھی۔ ان کی کتنی خواہش تھی گھر میں کنسرکشن کروانے کی۔

رقیہ نے بولے ہوئے شادی کی تیاری شروع کر دی تھی جب ایک ملازمہ رخ کا فون آیا۔

”آئی! بری کے کپڑے خریدنے جایا کریں تو مجھے ساتھ لے لیا کریں۔ اصل میں میری سلیکشن بہت اچھی ہے۔“ رقیہ نے صبا کو بتایا وہ بھی حیران ہو گئی۔

”امی پلیر! آپ بھابھی سے کہہ دیں۔ اپنی سلیکشن کے ہنر وہ جہیز کے کپڑوں پر آزمائیں۔ ہم نے جینی کلر بری نہیں بنوائی۔“ حنا غصے میں بولی تھی۔

خالہ کے مشورے پر انہوں نے مہر رخ کی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے ہاں بری لڑکی کی مرضی سے نہیں خریدتے۔ ایسا رواج ہی نہیں ہے۔

ایسے ہی آہستہ آہستہ وہ سردشام بھی آگئی جب مہر رخ ان کے آنگن میں دلہن بن کر اتری۔ خوشی، مسرت، نے بہن عریصے بعد ان کے گھر پہ دستک دی تھی۔ مہر رخ پر دلہن بن کر ایسا روپ آیا تھا کہ ہر ایک کی نگاہ میں ستائش تھی۔ سب ہی رقیہ کے انتخاب کو سراہ رہے تھے۔ ذیشان پہلی بار اس قدر خوش تھا۔ صبا اور حنا کے تو پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ رقیہ بھی بہت خوش تھیں لیکن ظہیر کی یاد ان کو پریشان کیے ہوئے تھی۔

”آج اگر ظہیر بھی ہوتے تو کتنی مکمل خوش ہوتی وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا خوش ہوتے تھے۔ یہ تو ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوتی۔“ دھوپ چھاؤں کے اس امتزاج میں شادی، دلیہ سب کچھ ہو گیا۔ شادی کا پہلا ہفتہ گزر گیا۔

مہر رخ بنی مون پر سنگاپور جانا چاہتی تھی۔ ذیشان حیران ہی رہ گیا۔

”مہر رخ! میں اتنا مہنگا ٹرپ کیسے انور ڈکر سکتا ہوں۔“

ذیشان کا یہ کہنا قیامت ہو گیا۔ مہر رخ جو بولنا شروع ہوئی تو چپ ہی نہ ہوئی۔ اپنے بُرے نصیبوں کو کوسا گیا۔ اپنی ماں کے لئے لیے جنہوں نے مل اوزر کے رشتے مستر ذکر کے ذیشان جیسے ٹٹ پونجے کو پسند کر لیا۔ اب وہ بلند آواز سے رو رہی تھی۔ ذیشان افتاں و خیراں کھڑا کھڑا ہی رہ گیا۔ اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ کبھی ایسے سین کا حصہ ہوگا۔ اب تک اس کا واسطہ جن خواتین سے پڑا تھا، ان میں کوئی بھی اس فطرت کی نہ تھی۔ اس نے سہولت سے مہر رخ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کو اب کچھ سناٹی نہ دے رہا تھا۔

ادھر وہ بیٹوں ماں بیٹیاں بھی پریشان تھیں۔ ان کے اوسان خطا ہوئے جارہے تھے۔ ان کے گھر میں پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ تو سب ایک دوسرے سے بڑی نرمی اور سہولت سے بات چیت کرتے تھے۔ لڑائی کی تو کبھی نوبت ہی نہ آئی تھی۔

”امی! آپ بتا کریں۔ آخر کیا وجہ ہے کہیں بھائی نے تو کچھ کہہ نہیں دیا۔“

رقیہ کے تو اپنے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ مہر رخ نے قدموں سے گئیں۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ دستک دے کر اندر جانا ہی غضب ہو گیا۔ مہر رخ کی بکس کارخ ان کی سمت ہو گیا۔

”کھا گئیں ماں بیٹیاں سب کچھ۔ اللہ کی مار ہو ان سب پر۔ اس وقت تو بڑی بینک نیجر کی ماں بنتی تھیں۔“ وہ اب رقیہ کو کوس رہی تھی۔ ذیشان کمرے سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

اللہ اپنے بندوں کو ہر طرح سے آزماتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے بندوں کی آزمائش، مہر رخ کے ذریعے اللہ نے ان کو آزمایا تھا۔ ان کے صبر کو، ان کے ظرف کو، ان کے شکر کو۔ یہ فو بس اس آزمائش کی شروعات تھیں۔ ایک کے بعد دوسرا ڈرامہ۔ جس میں کبھی مہر رخ اکیلے ہوتی۔ کبھی اس کی مدد کے لیے اس کی ماں بہنیں موجود ہوتیں۔ ہاتھ مل کے پچھتاوے کا اظہار ہوتا کہ ہم نے تو صرف شرافت دیکھ کر ان کا لے پیلوں کو اپنی پھول جیسی بیٹی دے دی تھی پر دھوکا کھا گئے۔

صبا نے اسی تناؤ میں اپنے پیروں پر رقیہ نے اسٹیشنری کا کام دوبارہ شروع کر دیا تھا۔
 ”ماں بیٹیاں کھا گئیں مل کے، کسی کو ترس نہیں آتا کیلی جان پر۔“ یہ مردخ کے مخصوص جملے تھے۔
 ویسے وہ شدید تھکن اور کہیں نہ کہیں درد کی مریض تھی لیکن شاپنگ ایک ایسا جادوئی لفظ تھا جس
 سنتے ہی مردخ لمحوں میں ہر بیماری بھول کر، لپک چھپک بازار سدھارتی۔
 صبا کا زلت آیا تو اس کی فرسٹ پوزیشن تھی۔
 ”بھئی ہم سے تو نہیں ہوتی ایسی پڑھائی نہ رنگ رہے نہ روپ۔“ یہ مردخ کا اس کے زلت پر
 تبصرہ تھا۔

صبا نے کئی جگہ ایلائی کیا ہوا تھا۔ شاندار تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے چند ماہ بعد ہی لیکچر رشپ مل گئی۔ یہ
 خیران سب کے لیے ان ٹھکن آلود فضا میں جیسے تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔
 زندگی کے اس گھاؤ نے رقیہ کو بہت کم زور اور کم ہمت کر دیا تھا۔ ذیشان کو دیکھ کر اور بھی ہوا
 کرتیں۔ سدا کا سنجیدہ شانی اب ایک پریشان حال آدمی تھا۔ رقیہ نے بارہا اس کو علیحدہ گھر لینے کے لیے
 کہا تھا۔
 ”امی پلیز، میری بد قسمتی پر مہر نہ لگائیں۔ بڑھاپے میں آپ کو اور دو جوان بہنوں کو تنہا چھوڑ
 جاؤں، میری آخرت بھی خراب ہو جائے گی۔“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کہتا تو رقیہ چہرہ بدلتی۔
 ویسے بھی مردخ کو شوہر کی کسی ذمہ داری سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس کے تمام کام ابھی بھی صبا اور حنا
 ہی کرتی تھیں۔

حنابھی اب فرسٹ ایئر میں تھی۔ رقیہ کا کتنا دل چاہتا تھا، اپنے پوتا پوتی گودوں کھلانے کو، پر وہاں
 کوئی آثار نہ تھے۔ نہ ہی ان میں ہمت تھی پوچھنے کی۔
 ان دنوں جب ذیشان اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر چکا تھا۔ تقدیر ایک بار پھر اس پر
 مسکرا دی۔
 مردخ نے اس کو ماں بننے کی نوید دی۔ ذیشان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہو یا ماتم کرے۔
 یہ خبر سن کر اس نے طلاق کے کاغذات پھاڑ دیے۔ اس نے خود ہی جھجکتے ہوئے یہ خبر ماں کو دی کیونکہ اس کو
 معلوم تھا کہ مردخ نے تو ایسا کوئی تکلف نہیں کرنا۔

☆☆☆

اس شام صبا کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ رقیہ کی کوئی جاننے والی یہ رشتہ لائی تھی۔ فیروزی
 کڑھائی کے سوٹ میں صبا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ لڑکے کی ماں اور بہنیں آئی تھیں۔
 سانولی سی صبا ان کو بہت پسند آئی تھی۔ جب بیل کی تیز آواز نے ان کو چونکا دیا۔ مردخ کی ماں
 وراں کی چھوٹی بہن گل رخ تھیں۔

”بازار جانا تھا۔ سوچا مردخ کو ساتھ لیتے چلیں۔“ وہ خود ہی صفائیاں دے رہی تھیں۔
 گل رخ نے سرخ اور سیاہ نیٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کانوں میں سیاہ ٹوں والی بالیاں اس کے
 سرخ و سفید چہرے پر خوب بچ رہی تھیں۔ ایک ہاتھ میں سرخ اور دوسرے میں سیاہ چوڑیاں تھیں۔
 ”آئی! اگر آپ اتنی تیاری سے بازار جاتے ہیں تو شادی پہ تو غضب ہی ہوتا ہوگا۔“ حنا سبز مومن

لائٹ کے سوٹ میں پھسی آئی سے کہہ رہی تھی۔
 ”اے! ہٹو! تمہارے تو میں منہ نہیں لگتی۔“ وہ واقعی حنا سے کتراتے تھیں۔ کچھ انہیں ڈراٹنگ روم
 میں پہنچنے کی جلدی تھی۔
 ان کے قدم پڑنے کی دیر تھی جیسے ہر چیز بدل گئی، جیسے کسی پری نے اپنی جادوئی چھڑی گھما دی ہو۔
 ہنسی، مذاق، اونچے اونچے قہقہے، گل رخ کے ناز و انداز، اس کی ماں کا ان خواتین کے ساتھ بہنا پنا، صبا
 بالکل پس منظر میں چلی گئی۔

اگلے ہفتے گل رخ کی اسی لڑکے سے ملگنی ہو گئی۔ ”ہیرا چھوڑ کر بھلا وہ کونکہ کیوں لیتے۔“ یہ مردخ
 کا تبصرہ تھا جو اس نے صبا کے سامنے کیا تھا۔
 ”بھابھی! یہ ان کو بھی جلد پتا چل جائے گا کہ انہوں نے کونکہ چھوڑ کر کونکہ کی پوری کان خرید لی
 ہے۔“ حنا چپ نہ رہ سکی۔

”اے! بالشت بھر کی چھو کری! اپنی حد میں رہا کر۔“ مہ رخ تملاتی۔
 ”بھابھی! آپ بھی سن لیں۔ میں صبا نہیں ہوں۔ مجھے بگڑے ہوؤں کو ٹھیک کرنا بہت اچھی طرح
 آتا ہے۔“ حنا بامنے پڑی ٹوکری کو ٹھوکر مارتے ہوئے گزرتی۔
 صبا کو بھی بھی حنا پر بہت رشک آتا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اتنی ہی بہادر ہوتی کاش۔

☆☆☆

آج عکس اور نقش صبح سے ضد کر رہی تھیں کہ پاپا کے ساتھ پارک جانا ہے، دادو کے ساتھ نہیں۔
 ذیشان پہلے تو ان کو ٹالتا رہا لیکن وہ نہ مانیں۔ آخر اپنی فائل بند کر کے وہ تیار ہو ہی گیا۔
 ”صبا!“ اس نے کا پیاں چپک کرٹی صبا کو آواز دی۔ ”چلو پارک تک چلتے ہیں۔“

صبا کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن ذیشان کو انکار بھی نہ کر سکی۔ دونوں بہن بھائی، بچوں کو لے کر چلے
 گئے۔ مردخ کی سب سے چھوٹی بہن کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ وہ صبح سے وہیں گئی ہوئی تھی۔
 سیلہ خالہ کو آتا دیکھ کر رقیہ ہولے سے مسکرا دیں۔

”رقیہ! اتنا وقت گزر گیا پر تمہاری بہو اور ان کی ماں کا کوئی شوق بھی کم نہ ہوا۔ ماشاء اللہ اب تو عکس
 بھی سات سال کی ہو گئی ہے پر نانی اماں کا الہڑپن برقرار ہے۔“
 رقیہ بس مسکرا دیں۔ ”خالہ! سدا بہار تو آپ بھی ہیں۔“
 ”حنّا کا کوئی فون آیا؟“

”کل ہی آیا تھا۔ ٹھیک ہے، آپ کو سلام کہہ رہی تھی۔ خالہ سوچتی ہوں۔ صبا سے چھوٹی حنا، ایک
 بچے کی ماں بن گئی اور میری اتنے کنوں والی بیٹی، جانے کب اس کے مقدر کھلیں گے۔“

”رقیہ! اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ بہن اپنی کسی جاننے والی کا ذکر کر رہی تھی۔ انشاء اللہ وہ
 لوگ اسی ہفتے آئیں گے۔“ خالہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں تو رقیہ وہیں بیٹھی اپنے خیالوں میں گم رہیں۔
 رخشندہ اپنے ڈاکٹر بھائی کا رشتہ حنا کے لیے لائی تھی۔ رخشندہ، حنا کی چچن کی سہیلی تھی۔ پورا گھر انہ
 ہی بہت اچھا۔ ان لوگوں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ مردخ نے بہت زہرا لگا تھا۔

”نبھی۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا ”برڈھونڈنے کے لیے ہم سے تو نہیں جاتی دوستی۔“

”بھابھی! آپ کسی کو بھلا دوستی جیسا شرف بخش بھی کہاں سکتی ہیں۔“ حنا بھی تہیہ کر لیا تھا کہ مہ رخ کے آگے جب نہیں ہوتا۔

”اچھی پڑھائی ہے۔ ساتھ ساتھ خصم بھی ڈھونڈ لیا۔“

”عجبوری بھابھی! ہماری امی نے تو آپ کو ڈھونڈنے کے بعد تو یہ کر لی ہے۔“

حنا کے لیے ایسا الزام بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اس نے رقیہ کو انکار کرنے پر بہت زور دیا تھا لیکن صبا اور ذیشان نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

عکس اور اس سے سال بھر چھوٹی نقش کی پیدائش پر رقیہ کا خیال تھا شاید بیٹیوں کی آمد مہ رخ کو بدل دے لیکن مہ رخ شاید ریت سے بنی ہوئی تھی اس پر کسی بات کا کسی نیکی کا کوئی اثر نہ تھا۔ جیسی خشک اور بخر تھی ویسی ہی رہی۔

عکس اور نقش اپنی ماں کی ہر خوب صورتی اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔ نقش کی پیدائش پر شاید وہ پہلی بار اپنے رب کی شکر گزار ہوئی تھی کہ اس کی دونوں بیٹیاں دوھیال پر نہیں گئی تھیں۔

☆☆☆

جن لوگوں کا خالہ نے کہا تھا وہ اگلے ہی ہفتے آگئے۔ صبا اب اس نمائش پر یڈ سے تنگ آ چکی تھی۔ لیکن ماں کو وہ انکار نہ کر سکی۔ ثاقب کے گھر والے اچھے لوگ تھے۔ شائستہ اور سنبھلے ہوئے لیکن وہاں سے ابھی تک مکمل خاموشی تھی۔

اس روز خالہ، ان کے گھر افتان و خیزان داخل ہوئیں۔

”رقیہ تم تو بیٹی رہو ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر۔ سب پتا لگا آئی ہوں۔ پوچھو اپنی بہو۔ سے، یہ ثاقب کے گھر کون سی آگ لگا کر آئی ہے۔ خدا کی مار ہو اس پر۔“ خالہ اب اونچا اونچا بول رہی تھیں۔ جو مہ رخ کی راجدھانی میں ممنوع تھا۔ (کسی اور کے لیے)

مہ رخ تن فن کرتی کمرے سے باہر نکلی۔ ”بہت برداشت کر لیا ہے بڑھیا تجھے، خبردار! جو میرے گھر قدم بھی رکھا۔ اپنے گھر کھانے کو نہیں ملتا۔“

خالہ کوئی جواب دینا ہی چاہتی تھیں جب رقیہ کے ہاتھ کے دباؤ نے ان کو خاموش کر دیا۔ سفید چہرے کے ساتھ رقیہ خطرناک حد تک بیمار لگ رہی تھیں۔

”مہ رخ ان لوگوں کا صبر تجھے لے ڈوبے گا۔“ خالہ نے آہستگی سے کہا اور اٹھ آئیں۔

وقت کے تھال میں دن سکے بن کر گرتے رہے۔ شاہ خاور ہر روز اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرتا۔ چاند ہر رات چپکے سے ان کے آگن میں جھانکتا، نیم پہ چڑیاں صبح شام ہر موسم میں اپنے رب کی شاخواری کرتیں۔

”کاش میری زندگی میں صبا اپنے گھر کی ہو جائے۔“ یہ رقیہ کی زندگی کی سب سے بڑی دعا بن گئی عکس اور نقش کے خوب صورت وجود میں صبا اور بھی دھندلا جاتی۔ وہ جاتے دمبر کا کھرا آلود دن تھا صبح سے ایک بار بھی سورج کی کرنیں دھند کی دبیز چادر کو پار نہ کر سکی تھیں۔ رقیہ عصر پڑھ کر فارغ ہوئی

تھیں۔ سردی تھی کہ جوڑوں میں بیٹھی جا رہی تھی۔ صبا کچن میں چائے بنانے لگی تو رقیہ نے اس کو آواز دے کر پہلے ہٹ جانے کے لیے کہا اور پھر خود لحاف میں بیٹھ گئیں۔

ذیشان بینک کے کسی کام سے کراچی گیا ہوا تھا۔ اس نے کل شام واپس آنا تھا۔ مہ رخ اور بچیاں بھی اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھیں، انہوں نے بھی کل شام سے پہلے نہیں آنا تھا۔ تب ہی ڈور بیل کی تیز آواز نے جیسے ماحول کے ستارے کو توڑ دیا۔

”اللہ خیر کرے، اس کمر میں کون آ گیا۔“ وہ چادر لپیٹ کر باہر آئیں صبا دروازہ کھول چکی تھی۔

☆☆☆

وجاہت عباس ابھی اٹھ کر گئے تھے کہ مہ رخ دوبارہ بولنا شروع ہو گئی تھی۔

”پہلے ساری عمر ماں بیٹیوں کو بٹھا کر کھلایا۔ اب ان کے ہوتے سوتوں کی بھی خدمتیں کر دو۔“ وہ جانے برتن دھو رہی تھی یا پتھر رہی تھی۔

”عکس، نقش! تمہارے ہاتھ تو نہیں ٹوٹے تم ہی ماں کا خیال کر لو۔“ مہ رخ کی زبان کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔

”امی پلیز! آپ نے برتن نہیں دھونے تو نہ دھوئیں یہ جاہلوں کی طرح واویلا تو نہ کریں۔ میری فریڈ ز آنے والی ہیں۔“ نقش تمللاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

عکس، نقش ہر لحاظ سے ماں کی کاپی تھیں۔ انہیں ماں سے زبان چلانے میں کوئی جھجک نہ تھی۔ البتہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔

”پاپا! اگر آپ مسکرایا کریں تو بہت اچھے لگیں۔“ عکس اکثر کہتی تو ذیشان مسکرا دیتا۔

”نہیں ابو، آپ مسکراتے ہیں تو آپ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔“

وہ دونوں اکثر کہتی تھیں ”ابو! زندگی آپ پر بہت نامہر مان رہی ہے۔“

اپنی دونوں پھوپھیوں اور دادی کا بھی لحاظ کر جاتی تھیں کچھ یہ بھی ان سے ہمیشہ ہی بڑی محبت سے پیش آتیں۔ حنا کے جو بھی اختلاف تھے وہ مہ رخ سے تھے۔ اپنی بیٹیوں میں تو اس کی جان تھی۔

اس کھرا آلود دن میں آنے والے مہمان، رقیہ کے لیے مژدہ جانفز اثابت ہوئے۔ اس روز صبا کی کولیگ شمرہ اپنے بھائی کے لیے صبا کا ہاتھ مانگنے آئی تھی۔ وجاہت عباس کی پہلی بیوی مٹے کی پیدائش پر زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ جب تک دادی زندہ رہیں تو وجاہت کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن والدہ کے انتقال نے وجاہت کے لیے بہت سے مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ وہ جس مسئلہ کو گزشتہ پانچ سال سے ٹال رہے تھے اب ٹالنا ممکن نہ رہا تھا۔ ان کی شخصیت اور دولت کی وجہ سے کئی گھر ان کے طالب تھے لیکن وجاہت ایسا رفق چاہتے تھے جو کہ عرو وجاہت کے لیے ماں بھی بن جائے۔

ایک سال اسی تنگ دود میں گزر گیا تھا۔ شمرہ کے لیے دو گھروں کی ذمہ داری سنبھالنا، نوکری کے ساتھ ساتھ نہایت مشکل تھا۔ بھائی کی اجازت زندگی بھی سامنے رہتی۔ تب ایک روز وہ بیٹھے بیٹھے چونک ہی پڑیں۔ صبا ان کی بڑی اچھی دوست تھی۔

”صبا! وہ کون سا محاورہ ہے بچہ نفل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔“

صبا جو ابھی آکر بیٹھی تھی نا بچی کے عالم میں سر ہلا بیٹھی تھی۔

اگلے دن، سردی کی پروا کیے بغیر شرہ صبا کے لیے دست طلب دراز کی پہنچ گئی تھی۔

رقیہ کے لیے تو یہ نوید بہاراں تھی۔ شرہ کا گھر انہ ان کا جانا پہچانا تھا۔ اس وقت تو شرہ کو سوچ کر جواب دینے کا کہہ دیا بعد کے مراحل بہت آسان تھے۔ شرہ سے اس گھر کے حالات چھپے ہوئے نہ تھے۔ مدرخ سے سب کچھ چھپایا گیا تھا۔ بالا ہی بالا ذیشان نے سارے معاملات طے کر دیے تھے اور مدرخ کو محض ایک ہفتے پہلے ہی شادی کا بتایا گیا۔

شرہ نے جیز کے لیے بڑی شدت سے منع کیا تھا۔ لہذا صبا کو صرف زیورات کپڑے اور کیش ہی دیا گیا۔ مدرخ کو پہلے تو بہت تاؤ چڑھا لیکن ”دوہاجو“ سن کر کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔

”ہونہ! ہوگا کوئی بڑھا، اس کا لی چیزیل کے لیے۔“ شادی کے دن پہلے تو شاندار بری اور بھاری بھر کم زیورات نے مدرخ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا اور وجاہت عباس کو دیکھ کر تو مدرخ کے ضبط کا پیانا لبریز ہو گیا۔

اونچے، لمبے سرخ و سفید وجاہت کہیں سے بھی ایک بچے کے باپ نہ لگ رہے تھے۔ فیروزی لہنگے میں صبا آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ مدرخ کا ظرف اب مزید برداشت کا تحمل نہ تھا۔

”بس بہت ہو گیا ذیشان! مجھے کسی نے صبح سے پانی بھی نہیں پوچھا۔“ مدرخ ذیشان پر برس پڑی۔

”مدرخ! تمہارے گھر میں شادی ہے۔ تم خود میز بان ہو۔“

”میری ماں بہنوں کو کسی نے جوتے کی نوک پر نہیں رکھا۔“

”مدرخ! تم میز بان ہو۔ یہ تمہارا فرض تھا۔“ ذیشان رسائیت سے کہتے ہوئے آگے چلا آیا۔

مدرخ اسی وقت واپس گھر چلی آئی۔ اس نے عکس اور نقش کو البتہ نہیں کہا کیونکہ وہ اسی کی بیٹیاں تھیں۔ منہ پھٹ اور بدتمیز۔ انہوں نے مدرخ کی ایک نہیں سنی تھی۔ رخصتی کے سہ، صبا خود تو روئی سب کو بھی رلا دیا۔

آج اس کو وہ مہربان سا وجود بہت یاد آیا تھا۔ جس کے نہ ہونے سے زندگی کے ساتھ ساتھ روح بھی خار خار ہو گئی تھی۔ رقیہ البتہ ایک عجیب سی کیفیت میں تھیں۔ صبا کو وداع کر کے گویا وہ ظہیر کی نظروں میں بھی سرخ رو ہو گئی تھیں۔ ظہیر اگر ہوتے۔۔۔ یہ تو شاید رقیہ کی ہر روز کی سوچ تھی۔

مدرخ، صبا کے ویسے میں بھی نہ گئی تھی حالانکہ ذیشان اور رقیہ نے بہت اصرار کیا تھا۔

صبا کو بھابھی بنانے کا فیصلہ کتنا درست تھا۔ اس کا شرہ کو تو خیر پہلے ہی سے احساس تھا۔ لیکن بہت متاثر وجاہت اب اس قدر خوش تھے کہ خوشی ان کے روم روم سے ٹپکتی تھی۔ عمر قدرے بچکچپا لیکن جلد ہی صبا میں چھپی متانے اس کو بھی اسیر کر لیا۔

شادی کے دوسرے سال صبا کی گود میں علی آ گیا۔ بالکل عمر وجاہت جیسا۔۔۔

☆☆☆

عکس اور نقش کے رشتے بہت آتے تھے۔ عکس نور تھو ایز میں تھی جب عکس کے لیے خضر حیات کا پروپوزل آیا۔

ایم۔ بی۔ اے۔۔۔ قابلیت کے ساتھ ایمپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس، بیوہ ماں اور ایک چھوٹی بہن اور بھائی لیکن مدرخ کو اس فیملی کی جو چیز بہت اچھی لگی وہ تھے سب کے سانولے سلونے رنگ اور رمیانی کی شخصیتیں۔ یہ لوگ میری عکس کے آگے اور بھی معمولی لگیں گے۔“ یہ مدرخ کے ذہن میں آنے والی پہلی سوچ تھی۔ ”جیسے میری سسرال نے میرا دم بھرا ویسے ہی یہ لوگ عکس کا بھریں گے۔“ وہ لوگ تو پیام دے کر چلے گئے تھے لیکن مدرخ ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی۔

ٹاٹ میں ٹٹل کا پیوند اگر لگے تو ٹاٹ اور بھی کم مایہ لگنے لگتا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ جن نیک اور شریف لوگوں کی ہر نیکی کو وہ اپنے حسن کا خراج سمجھتی آئی ہے۔ سہی ان سے تو پوچھ لیتی کہ وہ اس کے حسن کے کتنے تابع ہیں تو شاید اس پر اپنی بد نصیبی پوری طرح واضح ہو جاتی۔

کاش ذیشان کبھی اس کو کہہ سکتا کہ ”ابتدائی چند دنوں کے علاوہ، ایک عمر گزر گئی مدرخ! میں نے تو تمہارا چہرہ دیکھا ہی نہیں، تم نے کیا پہنا، تم پر کیسا لگا مجھے کچھ خبر نہیں۔ میرا تو سارا دھیان صرف تمہاری بد صورت زبان، گھٹیا ذہن اور تنگ دل میں ہی لگا رہا۔“

رقیہ، حنا اور صبا نہ جانے کتنی بار اس گھڑی کو پچھتاتی تھیں جب وہ مدرخ کی صورت کی اسیر ہوئی تھیں۔ جب رقیہ نے خالد کا مشورہ بھی نہ مانا تھا۔

یہ لوگ بالکل ایک آئیڈیل سسرال کے سانچے میں فٹ ہو رہے تھے۔ مدرخ نے کسی کی ایک نہ سنی۔ عکس نے بہت مٹیں کیں کہ تم از کم اس کو گریجویشن تو مکمل کر لینے دیں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

مدرخ کی مشاورت کے لیے اس کی بہنیں تھیں جو جہالت میں اس سے بھی آگے تھیں اور یوں عکس، خضر حیات کے سنگ، آنکھوں میں سپنے سجائے، سسرال چلی آئی۔ زادراہ کے طور اس کے پاس بوڑھی دادی کی بیش بہا دعائیں تھیں۔ اپنے باپ کا دست شفقت تھا۔ اپنی پھوپھیوں کی نیک خواہشات تھیں اور ان سب پر حاوی مدرخ کی کامیاب شادی شدہ زندگی کے تجربات تھے جو اس نے اپنی تربیت کے زہریں دونوں بیٹیوں کے اندر اتار دیے تھے۔

☆☆☆

بہن مومن سے واپسی بھی ہو گئی۔ دعوتیں بھی ختم ہوئیں۔ کھیر پکوائی بھی ہو گئی لیکن عکس کا دلہنا پا برقرار تھا۔ خضر اس کو جگا جگا کر تنگ آجاتا لیکن عکس اٹھ کر نہ دیتی۔ ماں، بہن کو ناشتے کا کہنا خود اسے عجیب لگتا۔ لیکن ردا پہلے کی طرح ہر صبح اس کا ناشتا بنا کر رکھ دیتی۔ کالج جانے سے پہلے وہ جلدی جلدی کام نہ مٹا ہی ہوئی، اماں، جی، ماسی سے صفائی کروا تیں تو خضر جانے کیوں جھل سا ہو جاتا۔ حالانکہ کسی نے بھی اس کو کچھ نہ بتایا تھا۔

عکس بارہ بجے تیار ہو کر نہایت اہتمام سے ناشتا کرتی اس کے بعد فون سنہال لیتی۔ خضر کو اور اپنی لکونون کرنے کے بعد بی۔وی کار میوٹ سنہال کر اس دل جمعی سے پیٹھتی کہ دنیا مافیہا کی خبر نہ ہوئی۔ بلا لاکھ اماں کی خواہش ہوئی کہ بہو کو کسی کام کے لیے کہہ دیں لیکن محویت کا وہ عالم کہ توڑتے ہوئے از نو بنی جھجک جاتیں۔

کبھی جو کہہ دیتیں کہ ”یہاں ذرا ایک کپ چائے بنا دو، صبح سے سرد کھ رہا ہے۔“ تو چائے کے نام جو محلول سامنے آتا۔ وہ حلق سے اترنے سے صاف صاف انکار کر دیتا۔ چکن میں جا کر بہا کر آتیر سبزی کی ٹوکری بھی اٹھاتا تھیں۔

امید پر دنیا قائم ہے کے مصداق کہ شاید بہو کہہ دے ”اماں جی آپ کے سر میں درد ہو رہا۔ لائیں۔ سبزی میں بنا دوں۔“

”اماں جی!“ وہ یوں ہمہ تن گوش ہوئیں کہ جیسے پکارنے والا ان کو آپ حیات کا پتا بتانے ہو۔ آپ پلیز! پیاز چکن میں کھڑے ہو کر کاٹ لیں۔ آنکھوں میں تکلیف ہوتی ہے۔“

خضر حیات کے آنے سے پہلے دوبارہ تیار ہوا جاتا۔ سب کہتے تھے کہ فرحت بانو کی بہو نے معنوں میں بری اور جہیز کے جوڑے پہنے ہیں۔ وہ تو اپنا عروسی جوڑا بھی سات آنٹھ بار استعمال پہن چکی تھی جو اکثر خواتین محض ایک بار ہی پہن کر رہ جاتی ہیں۔

مہر رخ نے اس کو بار بار ذہن نشین کرا رہا تھا۔ ”پہن اوڑھ کر رہا کرو۔ شوہر اسی طرح قابو میں رہے ہیں، سانس بند کولنے دیا کرو۔“ شادی کے بعد عکس اور مہر رخ کی ہم آہنگی میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ عکس مال کے نئے تیرہ ہدف لگتے تھے۔

خضر ایک اچھا انسان تھا۔ لیکن وہ ذیشان کی طرح خاموش اور صابر نہ تھا وہ اب عکس کو سختی سے اسے کام کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ چھٹی والے دن عکس کو کھانا بھی پکانا پڑتا تھا۔

”عکس! پلیز تم پڑے تو موسم کے حساب سے پہن لیا کرو۔“ وہ اکثر ٹوک دیتا۔ جب محض کم دوست کے گھر جاتے ہوئے عکس، جڑاؤ سیٹ اور کوئی بھاری جوڑا نکال کر پہن لیتی۔

گرمی میں کسی کے گھر جاتے ہوئے ریشمی جوڑا پہن کر، عکس پسینہ پسینہ ہوتی رہتی لیکن مہر رخ۔ اس کو بتایا تھا کہ شوہر کا دل ریشمی کپڑوں پر بہت تیزی سے پھسلتا ہے۔

اس روز عکس خضر کو لے کر صبا کے گھر گئی تھی۔ گھریلو سادہ سے کپڑوں میں ملبوس صبا اور وجاہت دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ عکس نے شادی کے بعد کم ہی رابطہ رکھا تھا۔ عکس کو ڈیٹنگ سے وجاہت کے سامنے صبا بہت میلی میلی اور معمولی سی لگ رہی تھی۔

”عکس! تمہاری امی، میرا خیال ہے تمہاری میلی سے نہیں ہیں۔“ خضر واپسی میں کہہ رہا تھا۔

”تو اور کیا، ہماری میلی میں تو کسی کا ایسا رنگ روپ نہیں ہے۔“ وہ قدرے فخر سے بولی۔ ”آپ نے دیکھا نہیں ہماری پھپھو کو، گھر لڑکا کالج میں پرنسپل ہیں لیکن ڈریسنگ کانسینس ہی نہیں۔“ وہ نخوت سے مسکرائی۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے عکس بی بی! وہ گھر میں بناؤ سنگھار کر کے کوئی کامدار بھاری سا جوڑا پہن کر بیٹھی رہیں۔ ساتھ دو چار زیورات بھی ٹانگ لیں۔ گھر میں چاہے کتے لوٹ رہے ہوں۔ (عکس کو یہ طے اپنی ماں پر پر لگا) وہ تو اس سادگی میں بھی نمایاں ہو رہی ہیں۔ ان کا گھر کس قدر صاف اور چمک دار تھا۔ اور کھانا۔۔۔ کتنی جلدی انہوں نے کتنی چیزیں، گھر پر بنائیں۔ یہ مہمان کی اصل خاطر ہوتی ہے۔ بازار کی بنی ہوئی چیزوں سے میز بھر دینا تو کوئی مہارت نہ ہوتی (یہ دوسرا طنز بھی امی پر کر دیا تھا۔ آئندہ نہیں آ پھپھو کے گھر) اور عکس!“ خضر کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”وجاہت! انکل کی آسودگی دیکھی تم نے؟“ وہ اب قدرے شگفتگی سے کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے ہی روز عکس نے شام میں واویلا مچا دیا تھا کہ امی کی طبیعت خراب ہے، فون آیا ہے، مجھے ابھی ہے۔ بھام بھام وہ لوگ پہنچے تو مہر رخ بستر پر دراز تھی۔ سر پر پٹی ضرور بندھی تھی۔ (یہ پٹی شاید بی ساس صلیبہ کا ٹریڈ مارک ہے۔) خضر نے سوچا۔

”امی! نقش کدھر ہے؟“

”وہ اپنی کسی سپیلی کے گھر گئی ہے۔ جانیں رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے بھیجا ہے۔“ داماد، چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آتی دیکھ کر انہوں نے بات بنائی۔

اصل میں ان کی بہن نے اپنے پیر صاحب سے عکس کی سسرال کے دل خراش واقعات سن کر، ان کو خویزا اور چینی لاکر دی تھی۔ پہلا تعویذ نو چندی منگل کو کھلا نا ضروری تھا اور آج منگل ہی تھا لہذا عکس کو یا تھا۔

”عکس! میں ذرا دادی اماں کو سلام کر آؤں۔“ خضر اٹھ کھڑا ہوا تو دونوں نے شکر کا سانس لیا۔ لاکھ عام طور پر مہر رخ، خضر کو رقیہ کے پاس اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ خضر اٹھا تو مہر رخ نے عکس کو تعویذ دیا۔ ”ابھی پانی میں گھول کر پلا دے۔“

ایسے بہت سے پیروں اور بابوں کی کرامات کی وہ سب دل و جان سے قائل تھیں۔ باوجود کوشش کے خضر عکس کو جلدی اٹھنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ نقش بھی کافی دیر بعد واپس آئی تھی۔

”امی! آپ کو تو میں اچھا بھلا چھوڑ کر گئی تھی یہ پتی کیوں باندھ لی؟“ خضر حیات نے چونک کر عکس مہر رخ کی طرف دیکھا۔ جہاں پر خجالت کا کوئی نشان نہ تھا۔

ذیشان بھی کافی دیر بعد آیا تھا۔ اس جاہلانہ باحولی میں اس کی آمد، خضر کو تازہ ہوا کے جھونکے کا سانس دلا گئی تھی۔ رات کو ٹیبل پر انواع و اقسام کی ڈشیں تھیں۔

”خضر بیٹا! یہ بریانی لو، بریانی ہاؤس سے منگوائی ہے یہ باب لو، میں نے ذیشان کو فون کر دیا تھا۔“

”ای! ان کے بینک کے نیچے دوکان ہے۔ کیا غضب کا زائقہ ہے۔“

”یہ کھیر، یوسف والے بس کمال ہی کر دیتے ہیں۔“

سلاٹنگ بازار سے منگوا یا تھا۔ قورمہ اور روغنی نان بھی نزدیکی ہوٹل سے، محلے کے کسی بچے کو بھیج کر لگوائے گئے تھے۔

”آپ، آپ، آپ لوگ گھر پر کچھ نہیں پکاتے؟“ بددلی سے کھیر کھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”یہ آپ کے گھر کا رواج ہے مہمان کو اکیلا بٹھا کر خود خواتین باورچی خانے میں کم ہو جاتی ہیں۔ ہمان بیٹھا سوکھتا رہے، پر بازار سے کچھ نہ آئے۔“ عکس نے بڑے تفاخر سے جواب دیا تھا۔

مہر رخ کچھ دور بیٹھی تھی اس لیے نظروں ہی نظروں میں اس کو شاباش دی۔ خضر حیات انتہائی کوفت کے عالم میں اٹھا تھا۔

”سنو عکس!“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی بڑے سرد لہجے میں پکارا۔ ”آج کے بعد تم کبھی میری

فیمیلی کوڈ سکس نہ کرنا۔ تمہیں ان سے جو شکایت ہو وہ تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔“
”اور اگر کروں تو؟“

”عکس مجھے حد سے گزرنے پر مجبور نہ کرو۔“

گاڑی سے اتر کر عکس انتہائی غصے میں کمرے میں جانے لگی تھی۔

جب خضر حیات نے بڑی سختی سے اس کی کلائی پکڑی۔ ”چلو منہ سیدھا کرو۔ اماں جی کو سلا آئیں وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہی ہوں گی۔“

عکس تو سلام کرتے ہی واپس پلٹ گئی البتہ خضر کچھ دیر بعد اٹھا۔

”مجھ سے یہ امید قطعی نہ رکھنا کہ میں ان آنسوؤں سے مرعوب ہو جاؤں گا اور اپنے ناکردہ گناہ کی معافیاں تم سے مانگوں گا۔“ اس نے روتی ہوئی عکس کو مخاطب کر کے کمرے کی لائٹ آف کی کروٹ بدل کر فوراً ہی سو گیا۔

”یہ تعویذ تو الٹا ہی پڑ رہا ہے۔ صبح اٹھ کر چینی ضرور کھلاؤں گی۔“

عکس نے ناٹم پیس پر الارم لگایا کیونکہ صبح اٹھنے کی عادت نہ تھی۔ ناشتا بنا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ چائے میں چینی ملا کر اس کو ملا دی اور جب تک چائے پی نہ لی عکس وہیں منڈلاتی رہی۔ چائے پی کر آفس گیا اور عکس دوبارہ لیٹ گئی۔

رات دیر سے سوئی تھی اور صبح جلدی اٹھی تھی، لہذا فوراً ہی آنکھ لگ گئی۔ یہ گیارہ بجے کا وقت، جب کسی نے اس کو جھٹکے سے اٹھایا۔

خضر حیات نہایت غصے سے گھور رہا تھا۔ اسے اس وقت گھر میں دیکھ کر عکس کے اوسان ہی ہو گئے۔

”مجھے ناشتا دے کر اس گھر میں تمہاری ہرزہ داری ختم ہو جاتی ہے۔“ وہ دھاڑا۔

”خضر! میں کام ختم کر کے اماں سے پوچھ کر لیٹی تھی۔“ عکس کو جھوٹ بولنے میں کوئی ہچکچاہٹ تھی۔

جواب میں خضر اس کو اسی طرح کھینچتا ہوا ڈائننگ ٹیبل پر لے آیا جہاں ابھی تک ناشتے کے برتن اسی طرح پڑے تھے۔ پھر چکن جو ناشتے اور رات کے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ لی وی لاؤنج سکندر کا کمرہ چیز بے ترتیب پڑی تھی۔

”کون سا کام تم نے سمیٹا ہے؟“ وہ چیخ رہا تھا۔ ”تم نے از خود ہی سمجھ لیا ہوگا کہ تمہارے سو۔“

کے دوران اماں، ردا اور ماسی نے کام ختم کر لیا ہوگا۔ رات ہی طے ہو گیا تھا کہ امی اور ردا، سکندر۔

ساتھ حیدر آباد خالہ کے گھر جائیں گی اور ماسی کی بیٹی بھی کل شام بتا گئی تھی کہ آج اس نے نہیں آنا اور سب کچھ اماں اور ردا پر ڈال کر اطمینان سے سو رہیں۔ میں اپنی فائل لینے گھر آیا تو سب دروازے کھ

تھے۔ مین گیٹ بھی بند نہیں تھا۔

عکس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فوراً کون سا جھوٹ بولے۔ شرمندہ تو وہ قطعاً نہ تھی۔ کا

چھوڑ کر سو جانا اور تھوڑا بہت جو ضروری ہو وہ کر لینا۔ اس کے میکے کا روٹین تھا۔

”عکس! کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں خضر حیات ہوں ذیشان ظہیر نہیں۔“ وہ ایک قدم آگے

لرپلا۔

”رات کو میرے کچھ دوست کھانے پر آ رہے ہیں۔ ہر چیز گھر میں تیار کرنا اور ڈنر بہت عمدہ ہونا

ہی۔ گیٹ بند کر لو۔ میں اب رات کو ہی آؤں گا۔“

عکس نے گیٹ بند کیا اور لی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ خضر نے اس کو بولنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔

اپنی سنا کر چلا گیا تھا۔ یہ بھی عکس کے لیے بہتر ہی ہوا۔ لیکن کھانے کا مسئلہ ایک پہاڑ کی طرح اس کے

منہ تھا۔

اس معاملے میں وہ اپنی ہمہ صفت موصوف ماں کی بھی کوئی مدد نہ لے سکتی تھی۔ کیونکہ کھانے پکانے

وہ بالکل کوری تھیں۔ ایک بچنے والا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”صبا پھپھو کو فون کرتی ہوں۔“ اس نے سوچا۔ ”لیکن وہ تو کالج میں ہوں گی۔“ خود ہی نفی کر

لی۔

”کوشش کرنے میں تو حرج نہیں۔“ مرنے مرنے قدموں سے فون کی طرف بڑھی۔ صبا کے نمبر

سے دوسری ہی بیل پر صبا نے فون اٹھایا۔ صبا کی آواز سن کر اس میں جان پڑ گئی۔

”پھپھو! پلیز میری، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ آپ کو تو پتا ہے مجھے کوکنگ بالکل نہیں

آتی۔“ عکس اب روہا کی ہو رہی تھی۔

”عکس! تم پریشان نہ ہو۔ میں آتی ہوں۔“ چندرہ منٹ میں صبا آگئی تھی۔

”وجاہت گھر پر ہی تھے۔ اس لیے بچوں کا کوئی مسئلہ نہ ہوا۔“ وہ عکس کو بتا رہی تھی۔

”پھپھو! انکل آپ کو باہر ہی سے چھوڑ کر چلے گئے۔ اندر لے آئیں۔“

”عکس میں تو اپنی گاڑی لائی ہوں۔ میں نے سوچا اگر کچھ لانا پڑا تو لے آؤں گی۔ اب بتاؤ۔۔۔“

مر میں کیا کیا ہے اور مارکیٹ سے کون سا سودا سلف آتا ہے۔“ صبا کو وقت کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

”پھپھو! مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ کون کون سی چیزیں گھر میں ہیں۔ دیکھنا پڑے گا۔“ عکس جھل سی

ئی۔ ”عکس بالکل بھابھی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔“ صبا نے قدرے افسردگی سے سوچا۔ کچن کافی

ندی حالت میں تھا۔

”پھپھو! عکس نے فریزر کھولا۔ ”چکن اور قیمہ دونوں ہیں۔ دودھ بھی فریزر میں ہے۔“ کسٹرڈ

لا موجود تھا۔ صبا نے سب سے پہلے کسٹرڈ کے لیے دودھ گرم ہونے رکھا۔ عکس کو پھل کاٹنے پر لگا باور

د برتن دھونے لگی۔ کسٹرڈ بنا کر اس کو ڈائننگ ٹیبل پر ٹھنڈا ہونے رکھ دیا۔ اور کبابوں کے لیے قیمہ، مگر

ماچڑ ہادیا۔

”عکس! تم اب سلاڈ کاٹ لو۔“ اس نے چکن چڑھاتے ہوئے کہا۔ پانچ بجے تک صبا کباب،

رمد، چکن کڑھائی اور کسٹرڈ بنا چکی تھی۔ پلاؤ کی تیاری تیار تھی۔

”عکس! اب میں جاتی ہوں۔“ اس نے چکن کڑھائی کے لیے ہری مرچ کاٹتے ہوئے کہا۔

”چا دل تو تم پکا لو گی نا! اگر ابھی پکا لیے تو ٹھنڈے ہو جائیں گے۔“

”بھپھو! آپ کھانا کھا کر جائیں نا۔“
 ”نہیں بیٹا! بہت دیر ہو جائے گی۔ سنو عکس! خضر کا دھیان رکھا کرو وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔“
 خضر دھڑکتے دل کے ساتھ ہی اپنے دوستوں کو لایا تھا۔ اس نے انہیں ہوں ڈنڈا کرانے کی پیشگی
 کی تھی لیکن انہوں نے بھی گویا بھی کے ہاتھ کا کھانا کھانے کی قسم کھائی تھی۔
 ”اچھا ہے۔“ خضر نے غی سے سوچا۔ ”کھا کے آئندہ تو نہیں کہیں گے۔“
 اس کی توقعات کے برعکس ڈرائنگ روم صاف تھا۔ دوستوں کو بٹھا کر اندر آیا تو عکس ٹیبل پر،
 سیٹ کر رہی تھی۔

”عکس! کچھ بنایا بھی ہے یا نہیں۔“ وہ قدرے غلٹ میں بولا۔

”سب کچھ تیار ہے۔ آپ فریش ہو جائیں۔“

”کچھ اور تو نہیں منگوانا۔“

”نہیں، ہر چیز تیار ہے۔“

دوستوں نے کھایا تو وہ انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ خضر سے تو مارے حیرت کے کھایا بھی نہ
 جا رہا تھا۔

”سنو! دوستوں کے جانے کے بعد اس نے کچن سمیٹی عکس سے کہا۔ ”تھک گئی ہوگی۔ صبح

لینا۔“

پر عکس نے آج اپنا سکہ جمانا تھا لہذا برتن دھو کر اور کچن صاف کر کے ہی کمرے میں آئی۔

☆☆☆

کچھ دن دونوں کے تعلقات بہتر رہے لیکن پھر وہی کھنچاؤ۔

عکس کے وہی رنگ دھنگ، ناز و انداز اور جھوٹ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

خضر کے گھر والوں نے عکس کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ توقعات کا دروازہ بند کر دینے کے بعد
 کو عکس سے کچھ شکایت نہ تھی۔ اور عکس یہ سمجھتی رہی ”آخر دب گئے۔ ہونہہ! شکلیں اپنی دیکھتے نہیں؟
 اور۔“ وہ اکثر خفارت سے سہتی۔

اس کو اب بھی مہ رخ کے تیرہ ہدف نگوں پر بہت بھروسہ تھا۔ ساتھ ساتھ مختلف طرح کے تعویذ
 دھاگے بھی آزمائے جاتے۔ جن کے لیے وہ بھی تو خضر سے جھوٹ بول کر پیسے لیتی اور کبھی چپ چار
 اس کی جیب سے نکال لیتی۔

ان ہی بے زار سے دنوں میں عکس کو ماں کے رتبے پر سرفراز ہونے کی خوش خبری ملی تو خضر کچھ
 سا گیا۔

بہت سال پہلے حضرت علی کا قول پڑھا تھا کہ ”ایمان کے بعد، اچھی بیوی سب سے بڑی نعمت
 ہے۔“ اور آج جب عکس اس کی آئندہ نسل کی امین بننے جا رہی تھی تو قول آج بہت اچھی طرح سمجھ آ رہا
 آیا نے اب بڑے پیار سے عکس کو سمجھانا شروع کیا۔ لیکن وہ عکس ہی کیا جو بات سمجھ جائے۔ اگر
 کچھ نرم پڑی بھی تو ماں کا کچھ حراس کو دوبارہ ریت میں تبدیل کر دیتا۔

”عکس، ایک بار جھک گئی تو تمام عمر جھک کر ہی رہنا پڑے گا۔ مجھے دیکھ۔ ذیشان کی مجال نہیں جو
 تھے ایک لفظ بھی کہہ سکے۔“

اور یہ فلسفہ عکس کو کوئی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ جو جھکے نہ اسے ٹوٹ جانا پڑتا ہے۔

ردا کے سسرال والے شادی کا تقاضا کر رہے تھے اور فرحت چاہتی تھیں کہ ساتھ ہی وہ سکندر کے
 رض سے سبک دوش ہو جائیں۔

”ردا، دعا کیا کرو، سکندر کے لیے کوئی نیک شریف لڑکی مل جائے۔“ وہ اکثر کہا کرتیں۔

فرحت خود بھی اللہ سے یہ التجا کرتیں۔ خضر کی مشکل زندگی خود ان کے لیے امتحان بنی ہوئی تھی۔
 کتنے کتنے دن گزر جاتے۔ عکس ان میں سے کسی کو مخاطب نہ کرتی۔ گھر میں اس کا قیام ایک مہمان کی مانند
 نا۔ کون آ رہا ہے۔ کیا پکنا ہے، صفائی، دھلائی کسی چیز سے کوئی غرض نہ تھی۔ خضر اپنے کپڑے دھو بی سے
 حلو اتا تھا۔ ردا کے بے حد اصرار پر بھی وہ دھو بی کو ہی دے آتا تھا۔ عکس اپنے کپڑے خود دھو لیتی تھی۔ بیڈ
 نیس اور تولیوں کے لیے عکس، مینے کے اواخر میں ایک بار شین لگاتی تھی۔

عکس، صرف ایک چیز میں مہ رخ سے مختلف تھی۔ مہ رخ کو اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی
 ذیشان سے محبت نہ تھی۔ وہ اب بھی ذیشان کا، اس کی ہر چیز کا بڑی شد و مد سے مذاق اڑاتی تھی۔ اتنے
 برسوں کی رفاقت کے باوجود اس کے بخر دل میں محبت کی کوئی کوئیل نہ بھوٹی تھی۔ ذیشان اس کی
 اجدہانی تھی جس کو وہ بہت آسانی سے پا مال کر لیتی تھی کیونکہ وہ اس راجدہانی کی ملکہ تھی۔

”ارے! یہ ہم ہی ہیں جو نباہ گئے۔“ وہ اکثر ترنگ میں آ کر یہ دعا بھی کرتی تھی۔

لیکن عکس اس جگہ اپنی ماں کا کوئی رنگ نہیں لے سکی۔ اس کو خضر سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی
 محبت میں سہرا ڈوبی ہوئی تھی۔

جب بھی اس کے تنہالی میں محفل جمتی جس میں اسے علاوہ دنیا کے ہر فرد کا مذاق اڑایا جاتا۔ بہت
 سے نیک شریف لوگوں کے نیچے ایسے ادھیڑے جاتے۔ لیکن عکس، وہاں پر کسی کو اجازت نہ دیتی کہ مذاق
 کا کوئی لفظ بھی خضر حیات کی ذات تک آپہنچے۔

☆☆☆

اس روز خضر کی خالہ آئی ہوئی تھیں۔ ردا کی بات ان کے ہاں طے تھی۔ ردا بھی بی۔ اے کر کے
 فارغ تھی۔ خالہ اب شادی کی تاریخ طے کرنا چاہ رہی تھیں۔

”آپا! بس کچھ دن اور ٹھہر جائیں۔ ردا کو بیاہ دیا تو اس گھر کا کیا ہوگا۔ سکندر کے لیے کوئی اچھی سی
 لڑکی دیکھ لینے دیں۔ بس پھر سکندر کی بھی ساتھ ہی کر دوں گی۔“

خضر وہیں بیٹھا تھا۔ خالہ بھی چپ ہو گئیں۔ بہن کی مجبوریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ خضر خود کو مجرم سا
 محسوس کرنے لگا۔

ای کتنی آس سے عکس کو بیاہ کر لائی تھیں۔ بیوگی کی ایک طویل اور صبر آزمائش کا نتیجہ تھی۔
 ”اب تو ذہن کو گھر سوئپ کر دو کام کرنے ہیں، آرام اور عبادت۔“ وہ اکثر کہا کرتیں۔ لیکن عکس
 کے حوالے سے دیکھا گیا یہ خواب ریت کا گھر وندہ ثابت ہوا۔

شادی کے دو سال پورے ہو چکے تھے۔ لیکن اس کی بے نیازی ہنورتھی۔ اس کے دل میں اس گھر
سناں اور دیور کے لیے محبت کی رقم بھی موجود نہ تھی۔
”عکس تو ہمارے لیے نیکر ثابت ہوئی۔ نہ پھل نہ سایہ۔“ یہ خضر کی اب ہر وقت کی سوچ تھی۔
خضر کو اب ذیشان کے روپ میں اپنا مستقبل نظر آتا تھا۔ اجڑا اور دیران۔ ایک پریشان حال خضر
جس کا دنیا کی کسی خوشی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

☆☆☆

اس روز ذیشان کے گھر دعوت تھی اس کی ترقی کے سلسلے میں۔ خضر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ذیشان
اور قیہ نے خود اصرار کیا تھا لہذا وہ مجبور ہو گیا۔ ان دونوں کی وہ بہت عزت کرتا تھا۔ عکس تو صبح سے ہی چلا
گئی تھی وہ البتہ شام ڈھلے پہنچا۔ گھر کے دیگر افراد میں سے تو کوئی جانے کو مانا ہی نہیں۔
عکس کی خلا میں مح اپنے بچوں موجود تھیں اور اس کی دونوں پھوپھیاں بھی موجود تھیں اپنی فیما
سمیت۔ خضر کو قدرے خوشگواریت کا احساس ہوا۔ وجاہت سے مل کر اس کو ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا۔ از
کی شانستہ بیوی، مہذب بچے اس کو ہمیشہ رشک میں مبتلا کر دیتے تھے۔
”نقش! اس نے اپنی سالی کو بلایا۔“ ماشاء اللہ بڑی گید رنگ ہے لیکن دیکیں وغیرہ نظر نہیں
آ رہیں۔ خالی پانی پی کر جانا پڑے گا۔“ اس نے قدرے خوش گواریت سے کہا کیونکہ مہر رخ بھی بڑی
سہولت سے پی بھی تھی۔

”وہ خضر بھائی! آج کو کنگ حنا اور صبا پھپھو نے کی ہے۔ ابو کی خواہش تھی کہ۔۔۔“ اس نے
دھیسے سے اور قدرے شرارتی انداز میں کہا۔ ”بہت دن ہو گئے گھر کا بنا چھا کھانا نہیں کھایا۔“
چونکہ یہ ان کی ذمہ داری تھی، لہذا مہر رخ اور فیما کی از خود ہی مہمان خصوصی بن کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے
بیٹھے تھے۔

”ہونہ! خود ہی کریں بہت نیک پروین بنتی ہیں نا۔ دیکھ لیں گے کیسے پکتا ہے اتنا کھانا۔“ مہر رخ
اپنی بہن سے کہہ رہی تھی۔
صبا اور حنا بچن میں ہی تھیں۔ نقش نے البتہ برتن وغیرہ ضروریات کیے تھے۔ بریانی کو دم سے اتار
کر حنا نے توار کھ دیا اور روٹی پکانے لگی۔

بڑے بڑے دیکھ بچن میں دھرے تھے۔ مٹن بریانی، چکن قورمہ، بیف کے پسندے، کوفتے،
ماش کی دال، رائیہ سلاڈ اور ساتھ ساتھ گرم گرم روٹیاں۔ کھانا ایسا کہ بس کھاتے جاؤ۔ عکس کے تخیال کو نہ
چاہتے ہوئے بھی تعریف کرنا ہی پڑی۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر ماسی کو فوراً دھونے پر بھی لگا دیا۔
کھانے کے بعد خوشبودار قیہ نے اس پر تکلف اور مزے دار دعوت کو جارحانہ لگا دے۔
صبا اور حنا بھی اب فراغت سے بیٹھ گئی تھیں۔ گوکہ بیٹھے ایک ہی جگہ تھے لیکن گھر روپ علیحدہ تھے۔
عکس نقش اپنے تخیال کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

”خضر! کتنا برا لگ رہا ہے آپ جب سے آئے ہیں۔ انکڑ کے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ
خالو جان کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔“ اس نے اپنے مسکین صورت خالو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”عکس! میرے لیے یہ اطلاع ہے کہ تمہارے خالو کو ”پوچھنے“ جیسے آزادانہ فعل کی اجازت مل گئی
ہے اور باقی دادے نہیں کب سے اچھے برے کی فکر ہونے لگی؟“ اس جواب پر عکس تن فن کرتی دوبارہ
ماں کے پہلو سے جا لگی۔

”اے نقش!“ اس کی خالہ گل رخ کی پاٹ دار آواز نے تمام تر حاضرین کو متوجہ کیا تھا۔ ”یہ کیسا میٹھا
سا پانی گھول کر میرے آگے رکھ دیا۔ بھی! بڑی کوشش کی پر اندر نہیں جا رہا۔ اٹھالے اس کپ کو یہاں
سے۔“ نقش نے مڑ کر کپ کو دیکھا۔

”افوہ خالہ! پورا کپ خالی کر دیا اور اب کہہ رہی ہیں کہ میرے اندر نہیں جا رہا۔ خالی کپ یہیں رکھ
دیں ٹیبل پر۔“ نقش ان ہی کی بھانجی تھی لگی لپٹی رکھے بغیر دوسرے کو منہ پر سنانے والی۔

”سب ہی کے چروں یہ مسکراہٹ دوڑ گئی تو گل رخ قدرے جل ہی ہو گئی۔
”مہر رخ نے ذرا تیز نہیں سکھائی اپنی بیٹیوں کو۔“ وہ اپنی دوسری بہن لالہ رخ۔ کرکان کے پاس
منہ کر کے جانے کون سے زمانے کے قصے لے بیٹھی۔

دس بجے کے قریب خضر نے جانے کی اجازت چاہی۔
”خضر! میں کل آ جاؤں گی۔“ عکس اٹھلاتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔ ”بہت تھک گئی ہوں۔“
”تھکن، بیٹھ بیٹھ کر۔۔۔ یہ کام تو تم نے گھر جا کر بھی کرنا ہے۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ قدرے
درشت سا ہو کر بولا تو عکس جل ہی ہو گئی۔

اسی وقت صبا وجاہت کے پاس چلی آئی۔ ”وجاہت! کل چھٹی ہے۔ بہت دنوں سے امی سے
ڈھنگ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ حنا بھی رک رہی ہے اگر آپ۔۔۔“ اس کی بات پوری ہونے سے
پہلے ہی وجاہت بول اٹھے۔

”ارے بیگم! ہم سے کیا پوچھتی ہیں۔ ہم تو خادم ہیں، آپ صرف یہ کہیں کہ بندے کے لیے کیا حکم
ہے؟“ وہ شگفتہ سا ہو کر بولے تو صبا کے ساتھ ساتھ خضر بھی ہنس پڑا۔

”آپ گھر جائیں۔“ وہ کہہ کر چلی گئی اور عکس کے لیے یہ سب قیامت تھا۔ اس نے فوراً اپنی ماں کو
اطلاع دی۔

وہ فوراً ہی دوڑی چلی آئیں۔ ”غضب خدا کا، اب میری بیٹی کو نیکنے رکنے کے لیے دودھ نکلے کے
لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا۔“ ان کی زبان سن کر صبا نے شکر ادا کیا کہ وجاہت جا چکے تھے۔ خضر
اپنی ساس کے تیور دیکھ رہا تھا۔ ”دیکھو خضر! میری بیٹی بھاگ کر نہیں گئی تھی تمہارے ساتھ۔“ (اف وہی
گھٹیا سوچ) خضر نے ان کی جانب دیکھا۔ ”کہ تم اس کو یوں کانتوں پر گھسیٹو، ایک رات رکنے کی ہی
اجازت مانگی تھی نا اس نے اپنی مجبور ماں کے گھر۔ جواب میں میاں! تم نے اس کو کیسی کھری کھری
سنادیں، کان کھول کر سن لو۔ میری بیٹی بھاری نہیں ہے مجھ پر۔“

ذیشان جو ڈرائنگ روم میں تھا وہ بھی باہر برآمدے میں آ گیا۔ مہر رخ کی بہنیں اور ان کے بچے
بھی جو تماشا تھے۔ ان کے لیے یہ معمول تھا۔

”خدا خیر کرے آج خضر کے تیور کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔“ یہ صبا اور حنا کی سوچ تھی۔
 ”امی! آپ جائیں۔“ انہوں نے پریشان سی رقیہ کو کہا۔ ”عکس کو خضر کے ساتھ جانے کو کہیں۔“
 اس سے پہلے کہ رقیہ آگے آئیں خضر نے بڑی حقارت سے مدرخ کو مخاطب کیا۔
 ”خاتون! اگر میں آپ کی بیٹی کو کانٹوں پر گھسیٹتا ہوں تو آج سے آپ کو ہمیشہ کے لیے اجازت ہے اپنی بیٹی کو پھولوں والے راستوں پر چلانے کی۔ کاغذات آپ کو چند روز میں مل جائیں گے۔“ وہ کہہ کر رک گیا۔

وہ سب اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی، یہ کسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔
 ماحول کے ستارے کو سب سے پہلے مدرخ نے توڑا۔

”ہونہ! ٹٹ پونجا، دیکھ لوں گی۔“
 وہ عکس کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی تھی۔ باقی مہمان تھوڑی دیر بعد چلے گئے تھے۔ ذیشان اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھا تھا عکس اب زرارہ زور رہی تھی۔ مدرخ اور نقش اس کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”چو کھٹ یہ تاک نہ رگڑوائی تو میرا نام بھی مدرخ نہیں۔“ خضر گھر پہنچ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں آگیا۔ خلاف توقع وہ اپنے آپ کو کافی پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ”شاید یہی نوبت نقدیر ہے۔“ سونے سے پہلے یہ اس کی آخری سوچ تھی۔

صبح اس کی جلدی آنکھ کھل گئی۔ چھٹی کی وجہ سے بستر چھوڑنے کا ارادہ نہیں بنا۔ اس نے اپنے پہلو میں خالی بستر دیکھ کر سوچا ضرور۔

”تو تمہاری واپسی ہوگئی عکس! وہ لمحہ آگیا جس کے آنے کا مجھے اب یقین ہو گیا تھا۔ لیکن عکس! تم جیسی خود پسند، بدتمیز عورتیں بس دور سے ہی اچھی لگتی ہیں لیکن گھر بسانے کے لیے نہیں ہوتیں، نہ ہی یہ خود غرض عورتیں اس قابل ہوتی ہیں کہ ایک سسل کی امین بن سکیں۔“ ایسی ہی الجھی سوچوں میں اس کی آنکھ دوبارہ لگ گئی۔ دوبارہ جاگا تو دن چڑھ آیا تھا۔ نہادھو کر وہ نیچے اترا تو ردالہ آج میں اخبار پڑھ رہی تھی۔ امی جان کارپٹ پر چادر بچھائے بنزیاں کاٹ رہی تھیں اور سکندر ریوٹ پکڑے ٹی وی میں مگن تھا۔ آج خضر بہت عرصے بعد اپنے آپ کو اس منظر میں بالکل فٹ محسوس کر رہا تھا ورنہ عکس کی روش نے اس کو اپنے پیاروں کی نظروں میں جل سا کر دیا تھا۔ گو کہ کسی نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا لیکن خضر از خود ہی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ بطور بڑے بیٹے اور بھائی، عکس کی وجہ سے بہت جگہ اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ خالی پیسے دینے سے تو سارے حقوق ادا نہیں ہوتے۔

”وہ کارپٹ پہ ہی امی کے پاس بیٹھ گیا۔“ ردالہ! اس نے بہن کے ہاتھ سے اخبار لیا۔ ”چھٹی کے شایان شان زبردست سانا شتا ہونا چاہیے۔“

اس کو بہت خوش گوار حیرت ہوئی کیونکہ خضر اب اکثر خود ہی ناشتا بنا لیتا تھا۔ وہ لاکھ کہتی لیکن وہ پیار سے ٹال دیتا۔ چائے کا پانی جو لمبے پر رکھ کر انڈا اٹلتا، سلاٹس ٹوسٹر میں سیکنٹا اور وہیں کھڑے کھڑے کھا لیتا۔ چائے چھٹی والے دن کمرے میں، ورنہ کچن ٹبل پر ہی لیتا۔

تھوڑی ہی دیر میں ردالہ اس کی پسند کا ناشتا گرم گرم پراٹھے اور ہری مرچوں والا آلیٹ بنا لائی۔ چائے پی کر وہ کارپٹ پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

”حیرت ہے ابھی تک بھائی کو آواز نہیں دی بھابھی نے اور نہ ہی کمرے سے اٹھا پنچ کی آوازیں آرہی ہیں۔“ ردالہ گوگو کے عالم میں سوچ رہی تھی جب خضر نے اس کو مزید حیران کر دیا۔
 ”امی! آپ اور ردالہ تیار ہو جائیں آج چھٹی، چچا جان کے گھر گزاریں گے۔ سکندر! تم گھر پر ہی ہونا۔“ سکندر جو انتہائی محویت سے کرکٹ کا میچ دیکھ رہا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

”ردالہ! میں آدھ گھنٹے میں نیچے آ رہا ہوں۔ تم لوگ تیار ملنا۔“ وہ کہہ کر اوپر چلا گیا۔
 ”ردالہ! یہ خضر کو کیا ہو گیا ہے اور بہو کیا سارا دن اوپر اکیلی رہے گی میں خضر کو کہہ نہ آؤں کہ اس کو بھی ساتھ لے لے۔“ وہ اٹھنے کو تھیں جب ردالہ ان کو دوبارہ بٹھا دیا۔

”انوہ! امی جان! آپ بھی کس دنیا میں بس رہی ہیں۔ دو سال میں ابھی آپ کی خوش فہمی باقی ہے۔ یہاں ابھی وہ ہنگامہ ہوگا کہ پورا حملہ سنے گا اور آج بد توں بعد جو بھائی مسکرارہے ہیں، ریلیکس ہیں۔ وہ اسی پریشان حال موڈ میں دوبارہ چلے جائیں گے۔“

”لیکن!“ وہ ابھی گوگو کے عالم میں ہی تھیں جب سکندر بول اٹھا۔
 ”امی! ردالہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ گھر آئی خوشی کو کیوں واپس کر رہی ہیں۔“
 چچا کے گھرانے کے ساتھ ان کے تعلقات بہت خوش گوار تھے۔

چچا کے تو عزیز بھائی کے بیوی بچے تھے۔ لہذا چچا کے تینوں بیٹوں اور ان تینوں بہن بھائیوں کے مابین محبت، احترام، شرارت ہر طرح کا رشتہ تھا۔ خود بانو بھی سیدھے سبھاؤ کی، قاعدے قرینے والی خاتون تھیں۔

وہ سب ہی ان لوگوں کو خاص طور پر خضر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ خضر نے تو اب ملنا جلنا قریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ ان سب کے بے حد منع کرنے کے باوجود سعیدہ نے چائے بنا ہی لی اور ساتھ میں گاجر کا حلوہ۔ لڑکوں نے تو پھر کرکٹ پیٹ سنبھالے اور وہ میچ جما کہ مغرب کے بعد ہی ختم ہوا۔ امی اور چچی آج کافی دنوں بعد اکٹھی ہوئی تھیں لہذا خاندان بھر کے حالات حاضرہ سے لے کر خضر کا اچانک یہاں آنا تک ہر چیز ہی زیر بحث رہی۔ چچا جان گاہے بگاہے اس محفل میں آتے جاتے رہے۔ ردالہ نے کچھ وقت تو چچا کی لائبریری میں گزرا اور پھر کچن کی راہ لی کیونکہ یہ ہمیشہ ہی ہوتا تھا کہ ردالہ کو دیکھ کر چچی پھر کچن میں قدم نہیں رکھتی تھیں اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتی تھیں۔
 ”ارے بچے، اب خود ہی دیکھ اور پکا۔“

وہ بہت دنوں بعد ایک یادگار دن تھا۔ رات کو فرایڈ مچھلی، مٹر پلاؤ، رائسہ سے خوب انصاف ہوا۔ رات گئے ان کی واپسی ہوئی تو ایک اچھے دن کی سرشاری ان پر طاری تھی۔

وہ لوگ بھی لاؤنچ میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ سکندر نے ان کو چونکا دیا۔ ”بھابھی تو صبح سے ابھی تک کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں۔ نہ ہی میری ہمت ہوئی کہ دروازہ بجا کر پوچھ سکوں۔“
 وہ ماں بیٹی تو وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ عکس کی ضدی اور خود سر طبیعت سے وہ باخوبی واقف تھیں۔ کہیں

اس نے غصے میں کوئی غلط حرکت ہی نہ کر ڈالی ہو۔

”ارے خضر! دیکھتے کیا ہو، اٹھو، بھونٹیک بھی ہے۔“ پریشانی نے ان کو ہولا دیا تھا۔

”امی جان! اطمینان رکھیں وہ ٹھیک ہے۔ رات وہ اپنی ماں کے گھر سے ہی واپس نہیں آئی تھی۔ خضر کے سکون میں سرموق فرق نہ آیا تھا۔

”تو تم یہ بات صبح بھی تو بتا سکتے تھے۔“

”امی! اس میں چھپانے والی کوئی بات ہی نہیں، وہ اب ہمیشہ وہیں رہے گی۔“ خضر بڑے آرا سے اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا۔

ردا جو سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں جا رہی تھی پھر دوبارہ بیٹھ گئی قدرے لائق سے بیٹھے ہوئے سکندر نے پٹیا کر بھائی اور پھر ماں کی جانب دیکھا جو کہ مکمل حیرت اور صدمے کی حالت میں تھیں۔ ”خضر کیا کہہ رہا ہے تو؟“

”امی جان! آپ یقین کریں یہ فیصلہ میں نے وقتی اشتعال میں آکر نہیں کیا۔ میں بہت دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔ رات کی بات سے البتہ قدرے جلدی ضرور ہوگئی۔“ رات والی بات کی ان سب کو کوئی خبر نہ تھی تب خضر نے مختصر بتایا۔

”بیٹا! عکس ابھی بچی ہے آہستہ آہستہ سمجھ جاتی۔“

”جیسے اس کی والدہ سمجھ گئی ہیں۔“ خضر اب بہت تلخ ہو رہا تھا۔ ”میں نے عکس کو ہر طور سے سمجھایا۔ لیکن خود سری، ضد خود نمائی اس کی تربیت کا حصہ ہے۔ وہ کسی طور اپنی روش سے ایک انچ بھی نہ سرکی۔ وہ ریت کی بنی ایک خوب صورت صورت ہے۔ جس پر کسی نرم جذبے کا اثر نہیں ہوتا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ عکس میری آئندہ نسل کی امین نہیں بنی۔ ورنہ یہ فیصلہ کچھ دشوار ضرور ہوتا۔“

”لیکن خضر؟“ امی نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے بات بچ میں ہی کاٹ دی۔

”امی جان! بچ کہیں۔ ذیشان ظہیر کو دیکھ کر آپ کو نہیں لگتا کہ وہ آپ کے بیٹے کا مستقبل ہے۔“

خضر بہت مایوسی کے عالم میں یہ سب کہہ کر اوپر چلا گیا۔

وہ تینوں سکتہ کے عالم میں وہیں بیٹھے رہے۔ ایک خوش گوار دن کا بہت تلخ انجام تھا۔

☆☆☆

مہ رخ کے کان پر جوں تک نہ رہی تھی۔ عکس اگر رات کو پریشان تھی تو اب بہت پرسکون تھی۔ حنا اور صبا صبح ہی اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اس پوری صورت حال میں بولنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔ صبا نے ہی حنا کو ڈراپ کرنا تھا۔ جب راستے میں حنا نے صبا سے کہا انہیں اپنے طور پر خضر کے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہیے۔ صبا خود بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔

مہ رخ نے صبح ہی فون پر اپنی چھوٹی بہن کو مطلع کر دیا تھا اور خود اس کے گھر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ دونوں بہنوں کا ارادہ ایک بے حد مانے ہوئے عامل کے پاس جانے کا تھا۔ جس کی قابلیت کے چہرے ان کے حلقے میں عام تھے۔

”عکس! میری بچی!“ مہ رخ نے گھر پہنچ کر چند بڑیاں اس کو تھماتے ہوئے کہا۔ ”جیسے میں کہوں ویسے کرنا، نہ خضر نے تیرے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو میرا نام بھی مہ رخ نہیں۔“ عکس کے

چہرے پر بھی اب اطمینان ہی اطمینان تھا۔

ذیشان اور رقیہ کے لیے تو یہ سب کچھ قیامت تھا۔ رقیہ تو بے آواز روئے جا رہی تھیں۔

”یا اللہ! کوئی اور دن دکھانے سے پہلے مجھے اٹھالے۔“ آج سے پہلے رقیہ نے بھی بڑی سے بڑی پریشانی میں بھی موت کی آرزو نہ کی تھی۔

ذیشان نے بینک سے واپسی پر عکس کو اپنے کمرے میں بلایا۔ روٹھی روٹھی ہی عکس آکر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”عکس بیٹا! پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ گھر بننے تو بہت مشکل سے ہیں لیکن ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ میاں بیوی کے درمیان اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے لیکن اس کو انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ اٹھو، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ وہ بھلے لوگ ہیں۔ کھلے دل سے خوش آمدید کہیں گے۔“

”عکس!“ وہ ابھی اپنی بات مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ مہ رخ ایک جھٹکے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمر پر ہاتھ رکھے وہ بڑی خوشخوار نظروں سے ذیشان کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے میاں! بند کرو اپنی یہ پیاری۔ میری بیٹی کی درویشیاں تم پر بھاری پڑ گئیں۔“ اس کی بات سننے ہی خاموش بیٹھی عکس زور و شور سے رونے لگ گئی۔

”یہ لہتیں کسی اور کو دینا۔ جب تمہیں اپنی اولاد کی پروا ہی نہیں تو کاہے کو اندھے کنویں میں دھکیلتے ہو۔ جن جتنوں سے مجھ دکھیااری نے انہیں پال لیا ہے ان ہی سے آئندہ بھی کوئی راہ ڈھونڈ لوں گی۔“ اب کے اس نے عکس کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔

”ارے خدا کی مار ہو ان لوگوں پر۔ میرا صبر بڑے ان بد بختوں پر۔“

مہ رخ کا بے آنسوؤں کے رونا شروع ہو گیا تھا۔ گھر کے ستارے میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

ذیشان چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

”کاش میں بزدلی کی حد تک شریف نہ ہوتا۔“

”کاش میں اب بھی دوبارہ گھر نہ لوٹ پاؤں۔“ اس نے ایک آس بھری نظر آسمان پر ڈالی اور ہولے ہولے قدم اٹھانے لگا۔

مہ رخ کو اپنے عامل پر پورا یقین تھا، وہ عکس سے کہہ رہی تھی۔ ”بس چند روز کی بات ہے دیکھنا کیسے ڈم ہلاتا آئے گا۔“ تب پوسٹ مین نے عکس کے نام کی رجسٹری حوالے کی۔

عکس تو خوف اور صدمے کے مارے بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ مہ رخ بھی حیرت زدہ تھی۔ نقش نے اس لفافے کو کھولا۔

اس کے بدترین اندیشوں میں بھی یہ کہیں نہ تھا لیکن عکس کو پہلی طلاق وصول ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس کے خرجے کا چیک تھا۔

خضر تو عکس کے روم روم میں بسا تھا۔ اس کی شوخیاں، شرارتیں، گستاخیاں، اس کی رفاقت۔ وہ تو خضر کے علاوہ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اب بھی اس کا یہی خیال تھا کہ خضر اس کو منا کر لے جائے گا۔ لیکن یہ رجسٹری اس کے سارے خوابوں کو زیرہ زیرہ کر گئی تھی۔

اسی شام صبا، خضر کے گھر پہنچ گئی۔ وہ لوگ بھی بے حد پریشان تھے۔ ایسے فیصلے شریف لوگوں کو

ہمیشہ ہی ناگوار لگا کرتے تھے خواہ وہ بہوؤں کے لیے ہی کیوں نہ ہوں۔

”خضر!“ صبا نے اس سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا عکس اتنی ہی مجرم تھی کہ ایک دم تم نے زندہ کا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔ تم نے ایک بار بھی ہم میں سے کسی کا نہیں سوچا کہ ہمارے دل پر کیا گزرے گی۔ تمہاری بیوی بھی اور تم نے اس کو۔۔۔ اس کو کسی کیسٹرن زدہ جیسے کی طرح خود سے علیحدہ کر دیا۔ ایسا کون جرم اس نے کیا جو ناقابل معافی ٹھہرا۔ خضر کیا عکس بد کردار تھی؟“ صبا نے چپختے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آئی! میں جانتا ہوں کہ آپ سب کو میں ہی مجرم اور قصور وار لگ رہا ہوں۔ لیکن صرف ایک با میری جگہ خود کو رکھ کر سوچئے! پھر آپ کو لگے گا کہ میں نے جو کیا درست کیا۔ آپ کہہ رہی ہیں کہ وہ میرے وجود کا حصہ تھی۔ ہاں! ایک ہمیشہ دکھ دینے والا میرے وجود کا حصہ۔ وہ میری رفیق تو کیا اپنی اس نے مجھے میرے دوسرے رشتوں سے بھی دور اور علیحدہ کر دیا۔ اس کی کوتاہیاں، بد کمیزیاں مجھے ہر ایک کی نظر میں اس طرح شرمندہ کرتی کہیں کہ میں نے اپنے رشتے داروں سے ملنا چھوڑ دیا۔ آئی! میاں بیوی کے رشتے میں تو بہت لطافت ہوتی ہے لیکن میرے لیے تو یہ ایک بدترین تجربہ تھا۔

میری ذیولنی صرف اس حد تک تھی کہ میں عکس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتا رہوں اور وہ مجھے بتاتی رہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہم سب اس ذیولی سے کس قدر کم تر درجے پر فائز، عام شکل و صورت والے انسان ہیں۔

وہ کبھی اگر پریشان ہوئی بھی تو جانتی ہیں کس بات پر کہ اگر ہمارے آنے والے بچے شکل و صورت میں اپنے خاندان میں چلے گئے تو کیا ہوگا؟ آپ پلیر ایک بار اس سے پوچھیے گا کہ میرے گھر والوں کے کس حق کو کس فرض کو اس نے ایک دن بھی ادا کیا ہو یا میرے لیے اس نے خوشی سے کبھی کوئی کام انجام دیا ہو اگر کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اپنی طبیعت پر جبر کیا ہو۔“

اس شام صبا بہت دیر وہاں بیٹھی رہی۔ جانے سے پہلے بھی اس کو احساس تھا کہ ان اچھے لوگوں کو عکس اور مد رخ نے جی بھر کر ستایا ہوگا لیکن خضر اس حد تک بے زار ہو گیا ہے اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ یہ ایک ہاری ہوئی بازی تھی۔ اس نے اب آخری بار عکس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

عکس ایک تباہ حال عورت کی تصویر بنی کمرے میں بیٹھی تھی۔ مد رخ فون پر گرج برس رہی تھی اور کسی کو بتایا جا رہا تھا کہ خضر نے شرافت کا غلط فائدہ اٹھایا ہے اور اب وہ بھی اس گونا گوں چنے چوادیں گے۔ ”ارے پورے سات لاکھ روپے مہر لکھوایا تھا میں نے، ان ٹٹ پونجیوں کو پتا لگ جائے گا جب پیسے دینے پڑیں گے۔“

صبا عکس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر ہولے سے اس سے پوچھا۔ ”میری جان! اب کیا ارادے ہیں۔ کچھ سوچا ہے تم نے؟“ عکس دوبارہ سے رونے لگی۔

”پھو! خضر تو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے پھر میرے ساتھ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”عکس! میں کل خضر سے مل چلی تھی۔ وہ اب بھی تم سے بہت محبت کرتا ہے لیکن تمہاری کچھ غلطیوں نے اس کو اس اقدام کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ خود اس کے گھر والے اس بات پر خضر سے بہت ناراض ہیں۔ تمہاری ساس نے تو کہا ہے کہ وہ گھر چھوڑ کر ہی چلی جائیں گی اگر خضر نے دوسری

طلاق بھی۔“

”ہونہ! یہ سارا کیا دھم! اس بڑھیا اور اس منحوس چڑیل کا ہے۔“ عکس کے منہ میں بالکل اپنی ماں کی زبان تھی۔ صبا نے قدرے سختی سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اتنی بڑی شوگر کھا کر بھی وہ سنبھلی نہ تھی۔

”عکس! خضر کو تم سے یہی شکایت ہے کہ تم نے اس کے کسی رشتے، کسی خوشی، کسی غم کو کبھی نہیں اپنایا۔“

”میں کیا کرتی۔ ان لوگوں نے مجھے بھی اپنا سمجھا ہی نہیں۔“

”چلو مان لیا انہوں نے نہیں اپنایا۔ تم کوشش کرتیں، اپنا دل بڑا کرتیں، خضر سے محبت کے صدقے میں ہی ان لوگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کرتیں۔ ان سے ٹھٹھنے ملنے کی کوشش کرتیں۔ تم تو خود وہاں پر سب سے بڑی مہمان بن کر رہ رہی تھیں۔ اس دو پہر جب تم نے دعوت کے لیے کھانا بنایا تھا، عکس! تمہیں کچن میں کسی مسالے، کسی برتن، کسی کینٹ کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔“

عکس تھوڑی سی شرمندہ ہوئی۔ ”پھو! مجھے کھانا پکانے کا شوق ہی نہیں ہے۔“

”بیٹا! کھانا پکانا محض شوق نہیں، ضرورت ہے۔ جیسے سانس لینا، کیا تم یہ کہو گی کہ مجھے سانس لینے کا شوق نہیں۔ بلاوجہ کی مشقت لہذا میں سانس ہی نہیں لیتی۔ دیکھو عکس، میاں بیوی کا رشتہ بہت بڑی سانچھ ہے۔ ایسی سانچھ داری جو دنیا کے کسی اور رشتے میں نہیں ہوتی، تب ہی تو ہمارے مذہب میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔

بد قسمتی سے بہت سی عورتیں اس رشتے کو پانی پت کی جنگ سمجھ لیتی ہیں کہ جو جیتے گا اسی کو بادشاہی ملے گی۔ بیٹے! اس رشتے میں جو ہارتا ہے وہ فاتح ہوتا ہے۔ بس ایک بار اپنا آپ خضر کے آگے ہار کے تو دیکھو، تم دیکھنا جیت تمہاری ہوگی۔

اس شرط پر کھیلوں گی، پیار کی بازی جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا تیری

”عکس! ایک بات کہوں تم نے کبھی غور کیا۔ بھابھی اور بھائی کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دونوں بلا ضرورت ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے شیر کرنے کے لیے کوئی جذبہ، کوئی لمحہ، کوئی موضوع نہیں ہے۔ وہ ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے قطبین کے فاصلے پر ہیں۔ عکس! تم نے بھائی سے زیادہ تنہا انسان دیکھا ہے۔ کبھی تم نے دیکھا کہ بھائی کی نظر جب بھابھی پر پڑتی ہے وہ کتنی خالی ہوتی ہے۔ اس نظر میں محبت کی کوئی جوت نہیں ہوتی، اس نظر میں کی رفاقت کا کوئی بد ہم ساد یا بھی روشن نہیں ہوتا۔

عکس! ایک بار ضرور سوچنا کیا مد رخ بھابھی دنیا کی سب سے ہاری ہوئی عورت نہیں ہیں۔“

مد رخ ایک جھٹکے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”او بی بی! جاؤ ہمیں نہ سمجھاؤ۔ اپنی راہ لگو۔“ اس نے صبا کو بہت حقارت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت تم خضر کی سگی ہونا! جاؤ۔۔۔ اس سے کہو کہ ہمیں ایک ایک کر کے طلاق نہ بھیجے۔ اکٹھی دے۔ بڑا جگر ہے مد رخ کا اور ہاں ساتھ ہی مہر کی رقم بھی بھجوا دے۔ نہ عدت کے اگلے دن امریکہ پلٹ لڑکے سے عکس کی شادی کروائی تو میرا نام بھی مد رخ

نہیں۔“ اب کے اس نے اپنا ہاتھ منہ پر پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”عکس! تم بھی اٹھ کے تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ آج شام کو آئیں گے۔“
 صبا تو صبا خود عکس بھی حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کم فہمی اور جہالت کا مظاہرہ خود عکس کے
 وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

حیرت کے جھٹکے پر قابو پا کر عکس ایک جھٹکے سے اٹھی۔

”امی! آپ کی ہمت کیسے ہوئی اس سوچنے کی بھی۔ میں خضر کی بیوی ہوں اور آپ مجھے دیکھنے کے
 لیے لوگوں کو بلارہی ہیں، امی! مجھے بہت گھن آرہی ہے آپ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ آپ مجھے
 بھی اپنی طرح سمجھتی ہیں نا کہ ایک مدت بعد بھی ابو کی محبت کی ایک رفق آپ کے دل میں نہیں ہے۔“
 اب عکس غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

”اتنے سالوں زندگی کی بساط پر اپنی مرضی کے مہرے چلا چلا کر اپنی بیٹی کو بھی ایک مہرہ ہی سمجھ بیٹھ
 ہیں جس کے ذریعے چند شریف اور اچھے لوگوں کے منہ پر آپ بدنامی کی کاک مل سکیں۔“ وہ بھی تو مددگار
 کی بیٹی تھی۔ منہ پھٹ، بد لحاظ لیکن آگہی کے لمحے نے خوش قسمتی کے در اس کے لیے وا کیے تھے۔ یہاں و
 مردخ سے جیت گئی تھی۔

مردخ پہلے تو ششدر ہی رہ گئی تھی۔ اب ذرا سنبھل کر دوبارہ پلٹی۔ ”ہائے ہائے میری بچی! کہ
 اول فول بک رہی ہے۔ صبا! تجھ پر اللہ کی بار۔ کیا کر دیا تو نے میری بچی کو۔ ارے رقیہ بیگم، ارے
 ذیشان۔“ وہ رواہی وادیلار شروع کرنے کے لیے میدان میں آگئی تھی۔ عکس نے اس کو سختی سے روک دیا۔
 ”خبردار امی! جو اپنی گندی زبان سے ان اچھے لوگوں کا نام لیا۔ جن کی شرافت، نیکی کو آپ نے
 ایک تماشا بنائے رکھا اور از خود سمجھتی رہیں کہ آپ نے میلہ ٹوٹ لیا ہے۔ کاش امی! مجھے یہ بات پہلے سمجھ
 میں آ جاتی کہ لوگ آپ سے اور ہم سے کیوں گریز کرتے ہیں، وہ ہماری خوب صورتی سے جلنے نہیں بلکہ
 ہماری بدسیرتی سے خوف کھاتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے، میری سرال کے، ہمارے محلے کے، ہر جگہ
 کے لوگ آپ کی زبان میں ان کا لے پیلوں سے جھک کر ملتے ہیں۔“

میرا شوہر، صبا پھپھو کو ایک آئیڈیل عورت سمجھتا ہے امی!“ وہ اب اونچا اونچا رو رہی تھی۔ ”آپ کی
 زندگی تو نکلے دام تماشا ہے آپ دنیا کی سب سے باری ہوئی تہا اور بد صورت عورت ہیں۔“
 مردخ اب منہ کھولے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو راجدھانی کی ملکہ تھی۔ اس کے پاس پامالی کا ہر
 حق محفوظ تھا پھر اس کی بیٹی یہ کون سا آئینہ دکھا رہی تھی۔

”آپ اس دنیا میں اللہ کا امتحان ہیں جو وہ اپنے نیک بندہ سے لیتا ہے۔ امی! کاش ابو، خضر کی
 طرح کا کوئی فیصلہ کر لیتے تو آج ایسی برباد زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔“

”پھپھو! وہ صبا کی طرف پلٹی۔“ آپ اور دادی، مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔ ان کو بتا آئیں کہ
 میری غلطیاں قابل معافی نہیں لیکن ان کے ظرف اعلیٰ ہیں، مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اس تماشے کا حصہ
 نہیں بننا۔ میں نکلے کی عورت نہیں بننا چاہتی بلکہ محبتوں کو جیت کر انمول ہونا چاہتی ہوں۔“

خوب صورت غلطی

”یہ کیا بات ہوئی میں لاہور میں رہتی ہوں۔ اور جاب اسلام آباد میں ملی ہے۔“ مارہ نے
 ہائٹنمنٹ لیٹرائی کو دکھاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”امی! میں رہوں گی کہاں؟“

”ارے بھئی! تمہارے چچا کا گھر جو ہے۔ تمہاری دادی اماں بھی ان ہی کے پاس رہتی ہیں۔“
 ”اگر وہاں میرا دل نہ لگا تو۔۔؟“ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ضرور لگے گا۔ احمد، ارسل، ندا، ردا اور راجیہ سب تمہارے کزن ہیں۔ دیکھنا وقت گزرنے کا پتا
 بھی نہیں چلے گا۔“

مارہ عدم دلچسپی سے جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

راولپنڈی اسٹیشن پر وہ بے زار سی کھڑی اپنے استقبال کے لیے آنے والے بندے کو ڈھونڈ رہی
 تھی۔

”مارہ! ارے بھئی ادھر دیکھو، میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں، شکر ہے تایا ابو نے تمہاری فوٹو
 گراف پوسٹ کر دی تھی۔ لاؤ اپنا سامان دو۔“ مارہ نے چونک کر گردن موڑی۔

سیاہ جینز اور لائٹ بلو شرٹ میں ملبوس گندی رنگت اور چمکتی سیاہ آنکھوں میں لا پرواہی اور بے
 نیازی کا تاثر لیے وہ نوجوان ارسل ہی ہو سکتا تھا۔

”السلام علیکم ارسل۔“ وہ شائستگی سے گویا ہوئی۔

ارسل کی آنکھوں میں حیرت اور دلچسپی ایک ساتھ جاگ پڑی۔

”واؤ۔۔۔“ اس کے ہونٹ دائرے میں کھینچ گئے۔ ”تم نے بنا تعارف کے نام بوجھ لیا۔“
 ”آنا جانا بے شک لڑکپن میں ختم ہوا، مگر بچپن تو ہم سب کزنز کا اکٹھے گزرا تھا۔“ وہ سادگی سے
 سکرائی۔

”تایا ابو لاہور جاب ملنے کے بعد بس لاہور کے ہی ہو کر رہ گئے۔ کبھی سال بعد چکر لگایا بھی تو
 کیلے، تائی جان بھی اکیلی ہی آئیں۔ کیونکہ کبھی تمہارے اگیزام ہو رہے ہوتے تھے تو کبھی تم اپنے کورسز

میں مصروف ہوتی تھیں اور کبھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تھی۔“ ارسل نے شکایتی انداز میں کہ اس کا سامان لے کر اسٹیشن کے Exit گیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔
 ”تو آپ لوگوں نے کون سا چکر لگایا۔ بھولے پھٹکے چچی، چچا یا اجیہ آپنی چلی آتی تھیں سال سال اور کسی کو فرصت نہ مل سکی۔ تصویروں میں ہی دیکھتے رہے باقی کرزنز کو۔۔۔“ وہ بھی صاف گوئی بولی۔ وہ لوگ اسٹیشن کے احاطے سے باہر آ چکے تھے۔ ارسل نے ایک ٹیکسی کا کرایہ طے کر کے کہا۔
 ”پاکستان ٹاؤن۔۔۔“

”یہ کون سا علاقہ ہے؟“ ماڑہ کو تعجب ہوا۔

اس کو جواب بھی اسی ایریے میں ملی تھی۔

”ابھی کچھ سال پہلے یہاں پلاٹ الاٹ کر کے آباد کاری شروع کی گئی ہے۔ سمجھ لو اسلام آباد، بنڈی دونوں کی آخری حدود میں آتا ہے۔ اسلام آباد ایئر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے۔

بڑا خوب صورت، شاداب اور پرسکون علاقہ ہے۔ جب مکمل بن جائے گا تو بڑا دی آئی پی آر ایریا نظر آئے گا۔ فطرت کے نظاروں سے مالا مال ہے۔ پہاڑ اونچے نیچے سرسبز ٹیلے، فصلیں، درخت کے جھنڈ اور خاموش ٹھنڈی فضا۔“

ارسل جانے کس جھونک میں تفصیل سے اپنے ایریے کے بارے میں بتاتا چلا گیا۔

”لیکن دادا جی کا گھر تو بنڈی میں تھا۔“ ماڑہ کا بچپن بنڈی میں ہی گزرا تھا۔ چھٹی کلاس میٹر جب اس کے والد کی لاہور ٹرانسفر ہوئی، وہیں پلاٹ لے کر گھر کی تعمیر شروع کرا دی۔ گھر مکمل، سرکاری رہائش گاہ چھوڑ کر اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہو گئے۔

”بنڈی والا مکان تو کب کا بک گیا۔“ وہ لاہور وائی سے بولا۔

”ان ہی پیسوں سے پاکستان ٹاؤن میں دس مرلے کا پلاٹ لے کر گھر بنایا ہے۔ تین چار ہونچکے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے۔“

ماڑہ کی آنکھوں میں شدید تحیر اور انفسوس ناک تاثر نمایاں ہو گیا۔ آبائی گھر بیچ دیا اور اب کو اس کا بھی نہ کی۔ نہ ان کے حصے کی رقم ادا کی۔ غالباً افضل چچا نے یہ جواز جواب کے لیے سوچ رکھا ہوگا کہ بھائی کو اس رقم کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں اللہ نے بہتر ارادے رکھا ہے۔ اتنی اچھی پوسٹ پر ہیں پھر ہی ایک بیٹی ہے۔ جب کہ میرا پورا کنبہ کھانے والا ہے۔ بیٹیاں بیٹے سب جوان ہیں۔ ان کی شادیاں اور دیگر اخراجات یہ دس لاکھ روپیہ شکیل بھائی تو بینک میں ہی رکھیں گے نا۔ ان کے لیے اضافی ہوگی جب کہ میں ان ہی پیسوں سے ڈبل اسٹوری گھر بنالوں گا، غالباً دادی نے بھی اپنا حصہ دے دیا تھا۔ چچا کی تو موج ہوگئی۔

آگے چل کر ٹیکسی ہائی وے چھوڑ کر دائیں طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی جہاں تیر بنا ”پاکستان ٹاؤن“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ٹیکسی ایسی سڑک پر آ گئی جس کے ایک طرف مکانات کا سلسلہ تھا اور دوسری ط خالی پلاٹس، اونچے نیچے پتھر پیلے ٹیلے اور خورد و جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

”بس یہیں روک دو بھائی۔“ ارسل کے اشارے پر ڈرائیور نے سبز شیڈ کے شیشوں والے ہلکے سبز گہری سبز نالکوں والے گھر کے آگے گاڑی روک دی۔

”وہ سامنے دیکھو۔“ ارسل نے کرایہ دے کر اترتے ہوئے ماڑہ کو متوجہ کیا۔

”یہ ابو کا آفس ہے۔ ابو پر اپنی ڈیلنگ کا کام کرتے ہیں، اس جگہ یہ کاروبار عروج پر ہے۔“ ذرا ایک چھوٹی سی دکان نما عمارت اکیلی کھڑی تھی، اس کی پیشانی پر ”پر اپنی ایڈوانسز“ کا بورڈ لگا ہوا۔ ارسل کی رہنمائی میں اندر آ گئی۔

وہ ارسل کی رہنمائی میں اندر آ گئی۔ ہر چیز موجود تھی مگر مناسب جگہ اور ترتیب کے لیے ترس رہی تھی، غالباً کسی کو اتنی فرصت یا توفیق نہ کہ ڈرائنگ روم یا لاونج اور سنگ روم کی آرائشی چیزوں کو ٹھکانا کہ یہ رکھنا یا بکھرے کفن، صوفے اور کریسیوں پر پڑے الم نظم چیزوں کو ہٹا کر کمروں کی صفائی اور ترتیب کا خیال کرتا۔

مکینوں کی ذات اور طبیعت میں بھی وہی لا پرواہی اور بے ترتیبی پائی جاتی تھی ان سے مل کر اندازہ نا۔

☆☆☆

”اوہن! یہ کیا ہنگامہ مچایا ہوا ہے تمہارے بچوں نے؟“

دادی اماں نے بہت تنگ آ کر یاسمین چچی سے شکایت کی تھی۔ چچی کا منہ بن گیا۔

”اماں! بچوں کی چھٹیاں ہیں۔ دو گھنٹی تفریح کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ آپ تو بس ان کے پیچھے جاتی ہیں۔“

”اے، کیسے نہ پیچھے پڑوں، سارے جہاں کا لپا لپٹنگا دی والے کمرے میں جمع کیا ہوا ہے۔ پہلے پھاڑ میوزک پلچھلتے کودتے ناچتے چیتے رہے، اب فلم لگا کے دیکھ رہے ہیں۔“

”تو کیا ہوا؟“ اجیہ آپنی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ کا کمر تو ویسے بھی کافی دور ہے۔ وہاں تک نہیں جاتی۔“

”آواز جانے یا نہ جانے کی بات نہیں ہے لڑکی۔“ دادی سختی سے گھور کر بولیں۔

”یہ احمد تو بس انڈین فلموں کا چلتا پھرتا وزیر نشريات بن کے رہ گیا ہے۔ ادھر سے ندا اور ردا، بھلے سے دس سال پرانی فلم کے بارے میں پوچھ لو، فر فر اس کی کہانی سنا دیں گی۔“ دادی صوفے پر بیٹھ نا۔

”اے اپنے شوق کی بات ہے اماں۔“ چچی بے زاری سے بولیں۔

”اس گھر میں رہنے والوں کے تو سارے شوق ہی نرالے ہیں۔“ دادی جل کر بولیں۔

”اماں! آپ کو میرے ہی بچوں میں سارے عیب نظر آتے ہیں۔ رانیہ کے بچے بھی تو ہر وقت سی لپیر اور دی سی آر سے چکر رہتے ہیں، جب آتے ہیں لی وی لاؤنچ میں جم جاتے ہیں۔ بلکہ اسی کے مانے میرے بچوں کو یہ لت لگائی ہے۔“ چچی نے دادی کی سب سے لاڈلی بیٹی رانیہ کا حوالہ دیا۔

دادی کو اپنی اکلونی بیٹی سے بہت پیار تھا۔ اور چچی کو ہمیشہ سے پیار و محبت کے یہ مظاہرے کھلتے تھے۔ ”خیر، یہ بات تو غلط ہے۔“ دادی نے ناک سے مکھی اڑائی تھی گویا۔

”میری رانی کے بچے بڑے تیز دار اور ذہین ہیں۔ بالکل اپنی ماں پر گئے ہیں۔ صورت شکل بھی

ن اٹھ کر آصفہ کو ناشا لگانے کا کہنے لگیں۔

رابی کو بتادینا۔ اگلے جمعے کو اس کے ڈیڈی کی برسی ہے۔“ امی نے آہستگی سے احسن کو مخاطب کیا وہ بھلا کیسے بھول سکتی ہیں۔۔۔“ احسن نے گہری سانس لے کر سوچا تھا۔ آخری لمحوں میں موت نے ہوئے تو ڈیڈی نے انہیں پکارا تھا۔ انہیں دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ اور وہ شادی کے کئی برس بعد پہلی آئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ ہاتھ پر سٹ وایج باندھتا ہوا آیا۔

اچھا! میں چلتا ہوں۔“ براؤن چیک کی شرٹ اور ڈارک براؤن پینٹ میں ملبوس اونچے لمبے منداور وجہ بیٹے کو دیکھ کر ان کے دل میں اندر تک ٹھنڈک اتر گئی۔

اچھا بیٹے اللہ کے سپرد! انہوں نے چاروں گل پڑھ کر اس پر پھونکے۔ محبت بھری نظروں سے نے جانے کی اجازت دی۔

☆☆☆

س کی جوائنٹنگ کا پہلا دن تھا۔

ایک پرائیویٹ کنسٹرکشن کمپنی میں بطور آرکیٹیکٹ مقرر ہوئی تھی۔ فی الحال اسے جو نیر سیٹ ملی افس ویسا ہی تھا جیسے کہ سب متول مالکان کا ہونا چاہیے۔ قیمتی فرنیچر وال ٹوال کارپینٹنگ پر بچھے لیے، شاہکار قسم کی پینٹنگز، نفیس اور عمدہ الیشینری اور سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ ٹھنڈا بخ بستہ ماحول۔ ہانا اعتماد بحال کرتی چراسی کی رہنمائی میں اپنی سیٹ پر فروکش ہو گئی۔

نورڈی دیر بعد ایڈمن انچارج رحیم علی تشریف لے آئے۔

”آپ ہمارے ادارے کے سب سے سینئر اور ٹیلنٹڈ آرکیٹیکٹ احسن فاروقی کے انڈر کام کی اور اپنے معاملات کے لیے ان ہی کے آگے جوابدہ ہوں گی اس کے علاوہ آپ گائیڈنس کے اسے رجوع کر سکتی ہیں۔ وہ یقیناً آپ سے پورا تعاون کریں گے۔“

”احسن صاحب کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں ہے بی بی۔“

انچارج صاحب کی روانگی کے بعد اس کی سیٹ کے عین مقابل بیٹھی سانولے رنگ اور دراز چوٹی ارٹ کی لڑکی نے اس پر اچھتی سی نظر ڈال کر مصروف سے انداز میں مطلع کیا۔

ماثرہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”وہ خاصے“ مشکل پسند“ واقع ہوئے ہیں۔“ ماثرہ نے محسوس کیا اس کا انداز دوستانہ تھا۔

”ہزار میں بیخ اور کیڑے نکالنے کے بعد وہ چیز کو“اوکے“ کرتے ہیں۔ میرا تو ہر وقت کا واسطہ رہتا ہے۔ اس لیے مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اور نئے بندے کو تو وہ خون کے آنسو رلا دیتے

”مائی گاڈ۔۔۔“ ماثرہ حد درجہ پریشان ہو گئی۔

”ارے بھئی، اب ایسی خوف زدہ ہونے والی پتویشن بھی نہیں ہے، خاطر جمع رکھو اگر محنت اور ذمہ کے ساتھ کام کرو گی تو دونوں میں ان کے دل پر چڑھ جاؤ گی۔“

”جی! اس کی“ جی جی بھر کر اچھا شامل تھا۔

ایک سے بڑھ کر ایک اور بھولی بھالی، تمہاری اولاد تو رنج کے ڈھیٹ ہے۔ نہ کسی کی سنتی ہے نہ اور نہ کسی کے کہنے میں ہے۔ وہی کرتی ہے جو من میں سماتا ہے۔“

”خیر! دادی یہ تو شخص آپ کی اقربا پروری۔“ اجیآ پی نے ناک چڑھائی۔

چچی دادی کی جانبدارانہ رائے پر غل بھن کر خاک ہو گئیں۔ مگر اپنی جلن جتانہ سکیں

☆☆☆

”احسن۔۔۔“

”جی امی۔۔۔“ وہ ہلکے براؤن شلوار قمیص میں سر پر تولیہ رگڑتا ہوا تھر روم سے برآمد ہوا تھا۔

”بیٹے! آفس جاتے ہوئے راستے میں اپنی بہن کی طرف سے ہوتے جانا۔ یہ گوشت چ

اور کچھ الیل رکھی ہیں میں نے تھیلے میں۔ یہ اسے دے دینا۔“

انہوں نے تھیلے کو سائیڈ بیسل پر رکھ دیا۔

”خواجواہ زحمت کر رہی ہیں۔ رابی آپ انہیں لیں گی، جانتی تو ہیں، آپ جب بھی کوئی چیز وہ مجھ پر شدید تھا ہوتی ہیں۔ وہ جھپٹتی ہیں گویا ہم ترس کھا کر انہیں اور بچوں کو بھیک دے رہے ہیں

احسن آہستگی سے گویا ہوا۔ امی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”دوپا گل ہے، بے وقوف۔۔۔“ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

”ماں باپ اپنے دل پتھر کر لیں تو پھر لوگ محبت اور معافی کے لیے کس رشتے کی مثالیں گے، پھر بھلے اس نے ہماری مرضی کے خلاف ضد کر کے پسند کی شادی کی ہے۔ لیکن اس کا

نہیں ہے کہ اسے بہت بڑا ناقابل معافی جرم سمجھ کے انسانیت کے ناطے بھی اسے سہارا نہ دیا۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ خوش حال اور خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتی تو ہم اپنی خفگی کو جواز بنا

خیال کرتے مگر اب مصیبت میں کسی کو تنہا چھوڑنا اور وہ بھی اتنے قریبی رشتے کو اپنے بس کی

ہے۔“ انہیں کچھ برس پہلے کے اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔

”ہم تمہاری ضد پر تمہاری مرضی کے شخص سے شادی تو ضرور کر رہے ہیں، لیکن اس کے

تمہارا کوئی واسطہ، تعلق نہیں رہے گا۔“

لیکن رابی کے حالات دیکھ کر زیادہ عرصے تک اس سے لاتعلقی اور بے گانہ نہیں رہ سکی تھیں

”میں تو پہلے بھی آپ سے یہی کہتا رہا ہوں کہ رابی آپ پر اپنے گھر کے دروازے بند نہ کر

سو ہوا۔ اس وقت وہ کراسس سے گزر رہی ہیں اور ایسی صورت حال میں انہیں کسی اپنے کی

ضرورت ہے۔ وہ لاکھ خود دار سہی مگر بچوں کی ضروریات اڑے آ جاتی ہیں۔ دونوں میاں یہ

مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور ان سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں مگر۔۔۔“ احسن بار

چھوڑ کر گہرا سانس لے کر کچھ سوچنے لگا۔

”اس بد نصیب پر تو آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔“ امی نے آہ بھری۔

”امی جلدی سے ناشتا لگوا دیجیے۔ مجھے آفس سے دیر ہو جائے گی۔“ احسن نے وارڈر

استری شدہ پینٹ شرٹ برآمد کی۔ وہ ماں کو رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے بات بدل گیا۔

”میرا مطلب ہے ان کی پسندیدہ ورکر بن جاؤ گی۔“
وہ کھل کر مسکرا دی۔ مارہ کی سانس میں سانس واپس آئی۔

عجیب طرح کا مزاج پایا تھا اس لڑکی نے۔ بے تکلف سا، چونکا دینے والا اور بے پروا سا۔
بہر حال اس کی وجہ سے خاصی ڈھارس ہوئی تھی اس نے بچ بیک تک آفس کے بہت
اور کام کی نوعیت کے متعلق بتا دیا تھا نہیں بتایا تو اپنا نام۔
”تم نے ابھی تک اپنا تعارف تو کروا ہی نہیں۔“
”میرا نام۔۔۔!“ وہ شرارت سے آنکھیں نچا کے کچھ سوچنے لگی۔ ”آں۔۔۔ آں۔۔۔“
”تیز بی بی۔“

”ہائیں۔۔۔“ مارہ ہوتی بنی اس کی صورت دیکھنے لگی۔
”اچھا۔۔۔! پسند نہیں آیا چلو پھر کرسی یا میڈم میئر بھی کہہ سکتی ہو۔“ وہ ہنس دی۔
”یہ کیا پہلیاں بھجوا رہی ہو۔ بتاؤ ناسیدھی طرح۔“ مارہ نے دوستانہ حق جتاتے ہوئے
دیکھا۔ ”معزز اردو میں مابدولت کو شائستہ کہا جاتا ہے۔
”شائستہ اخلاق۔۔۔“ وہ شوشی سے کہہ کر مسکرائی۔
”بہت خوب۔۔۔“ مارہ کو ہنسی آنے لگی۔

”اچھا جس شائستہ اخلاق اب مجھے کچھ پیٹ پوجا کر انیس پہلے تو موصوفہ احسن صا
بارے میں بھیا تک ساخا کہ کھینچ کے ڈرائی رہیں پھر کام کی تفصیلات سنا کر دہلا دیا۔ اب چاہئے
رہ کر بالکل ہی فوت ہو جاؤں۔“ وہ سیٹ سے اٹھ گئی۔

”ویسے احسن صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے۔“
”تشریف تو ضرور لائے ہوں گے کہ نہایت منگول واقع ہوئے ہیں البتہ تمہاری طلبی پو
پتا نہیں انیس خبر بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ بہر حال تھوڑی دیر میں کال کر لیں گے۔“

لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔
اس نے چر اسی کے ذریعے پیغام بھجوایا تو پتا چلا وہ کسی اہم پروجیکٹ کے سلسلے میں ساء
باہر چلے گئے ہیں اور ممکن ہے شام تک نہ آئیں لہذا کل صبح اسے کال کریں گے۔
”لو جی تمہاری تو ہو گئی چھٹی۔“

شائستہ نے ہاتھ جھاڑے۔
”ارے نہیں یار! مجھے تو سخت پریشانی ہو رہی ہے۔ خدا جانے کس طرح پیش آئیں گے
تھا آج ہی یہ بوجھ سر سے اتر جاتا۔“ وہ الجھ کر بولی۔

”کم آن یار! اب وہ کوئی جن بھوت بھی نہیں ہیں۔“ شائستہ اس کے چہرے پر آتے جا
کو محفوظ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
”چپ کرو تم۔۔۔“ مارہ نے خفا نظروں سے اسے دیکھا۔ ”پہلے دل دہلا دیا اب بات

ہو۔“ شائستہ ہنس دی۔ پھر اپنا بیک اٹھا کر کندھے سے لٹکایا۔ اور اسے اشارہ کیا۔
”اچھا چلو اٹھو، دین آئی ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔ ٹرانسپورٹ فری ہے کمپنی کی طرف سے۔“ وہ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے
پوچھ رہی تھی۔
”نہیں، پانچ سو روپے کٹتے ہیں پے میں سے۔“
دونوں باتیں کرتی باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”اجیہ آپی! کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ شام کی چائے کے بعد اجیہ آپی کو بیک لے کر نکلتے دیکھ کر
پوچھنے لگی۔
”ڈراما رکیٹ تک جا رہی ہوں، موڈ ہے تو چلی چلو۔“

انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر دوڑاتے ہوئے ازراہ مروت پیش کش کی۔ جسے قبول کرنے
میں اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ فی الحال وہ صرف بوریت سے ہی شغل فرما رہی تھی۔
”آئی۔۔۔!“ مارہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

”یہ جگہ خاصی ہنسنا اور خاموش سی ہے۔ کیا آپ لوگوں کو اکیلے باہر جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔“
”بھئی! اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔“ اجیہ آپی کا موڈ یقیناً خوش گوار تھا جو اس سے دلچسپی سے محو
گفتگو تھیں وگرنہ عام حالات میں وہ ساری دنیا سے خفا اور بے زار دکھائی دیتی تھیں۔

مارکیٹ بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ صاف ستھری، جدید طرز کی اور تمام تر ضروریات زندگی سے بھری
ہوئی۔ ”میں نے شاپنگ کی اتنی پرسکون اور بے آواز جگہ پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔“ مارہ نے اظہار خیال
ضروری سمجھا۔

کشادہ سڑک کے کنارے ایک طرف مارکیٹ تھی اور دوسری طرف خوب صورت اور جدید طرز
تعمیر کے شاہکار بنگلے قطار میں بنے ہوئے تھے۔
اجیہ آپی شاپنگ کرتی رہیں اور وہ دلچسپی سے شاپنگ سینٹر کے باہر کھڑی اطراف کے مناظر

کا جائزہ لیتی رہی۔
اچانک اس کی نظر سڑک کے پار بنے براؤن اور آف وائٹ کبی نیشن کے ماربل کے بنگلے سے نکلتی
نئی ماڈل کی کار پر پڑی۔

اس کو ڈرائیو کرنے والی شخصیت پہلی ہی نظر میں بڑی ہی متاثر کن اور باوقار دکھائی دے رہی تھی۔
سیاہ گھنے بالوں والا بھرپور توانا بازو اسٹیرنگ وہیل کو حرکت دے رہا تھا۔ کلائی پر قیمتی گھڑی تھی جس کا
ڈائل دھوپ پڑنے سے دور سے ہی چمک رہا تھا۔

گاڑی گھر کی روش سے نکال کر اس نے روڈ کراس کر کے عین مارہ کے پاس لاکھڑی کی۔ وہ بے
اختیار و قدم اچھل کر پیچھے ہٹی۔
وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

نوجوان کا چہرہ ہلا کا سنجیدہ اور گھمبیر تھا۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے شاپنگ سینٹر میں گھس گیا۔ مارہ
کی جان میں جان آئی۔ محض پانچ منٹ بعد وہ واپس آ گیا تھا۔

”اوہ۔۔۔“ اس کے ہونٹ بے اختیار سسک گئے۔ یہ تو وہی نوجوان تھا جسے کل مارکیٹ کے سامنے

دیکھا تھا۔

”باقی کام آپ خود سمجھا دیجئے گا۔ میں چلتا ہوں۔“ سر ہاشمی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی سر۔۔۔“ احسن احتراماً اٹھ اہو گیا۔

”ہاں تو بی بی! آپ کا ہیلائیٹ یہ ہے کہ آپ ایک سنگل اسٹوری گھر کا نقشہ بنا کے دکھائیں۔

نام چار بجے آف ہوگا اور آپ کو کم از کم تین بجے تک کام مکمل کر کے ٹیبل پر رکھ دینا چاہیے۔“

وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں سنجیدگی نمایاں تھی۔ احسن نے بغور اس کا جائزہ لیا۔

اس لڑکی کی آنکھوں میں کچھ کر دکھانے کی خواہش چمک رہی تھی۔ البتہ چہرے کے تاثرات سے

گھبراہٹ اور قدرے بے چینی مترشح تھی۔

”آپ میری بات سمجھ گئی ہیں؟“

احسن نے محسوس کیا کہ وہ اس کے یوں ٹھنک کر دیکھنے سے پریشان ہو رہی ہے۔ لہذا نظریں

اپنے سامنے رکھی فائل پر جمادیں۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ سمجھ گئی ہوں۔“

اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ نیوی بلو پینٹ اور اسکاکی بلیو شرٹ میں چہرے پر تازہ شیو کی نیلا بیشمیں لیے بہت تازہ دم لگ رہا

تھا۔ ”چلیں پھر کام شروع کریں۔“ احسن اسے یکسر نظر انداز کر کے فائل میں گم ہو گیا۔ وہ کمرے سے

نکل آئی۔

”کیوں۔۔۔ کیا پہلی ملاقات میں ہی جھگڑا دیے صاحب بہادر نے۔“ شائستہ اس کی

حالت دیکھ کر ہنس دی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

”اصل میں ایک توکل سے تم نے ڈراڈرا کے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ اوپر سے جاتے ہی ان

کے کمرے میں بڑے سر سے سامنا ہو گیا پھر احسن صاحب نے چھوٹے ہی کام سوپ دیا۔ بس اسی لیے

زورس ہو گئی۔“

اس نے بڑی محنت سے کام مکمل کیا۔ اور آیت الکرسی کا ورد کرتی احسن کے کمرے میں داخل

ہوئی۔ ”گلد۔۔۔“ احسن نے وال کلاک دیکھ کر سناشئی انداز میں سر ہلایا۔ ابھی صرف ڈھائی بجے تھے۔

مارہ نے خاموشی سے ورک شیٹ اس کے سامنے ٹیبل پر بچھا دی۔

جوں جوں احسن اسے دیکھتا گیا، اس کا موڈ آف ہوتا گیا۔ مارہ دم سادھے اس کا ردِ عمل اور

تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔

”آپ نے تو کی پلان (Key Plan) ہی غلط بنایا ہے بی بی۔“ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”سائٹ (Site) کے لیٹ رائٹ میں کیا ہے۔ اس کی کیا ڈائریکشن ہے کچھ بھی مینشن نہیں

کیا۔ آپ کو سائٹ کی لوکیشن اچھی طرح واضح کرنی چاہیے تھی کہ وہ کہاں واقع ہے اس کے ارد گرد کوئی

ایک اچھٹی سی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر گاڑی آگے بڑھالے گیا۔

کچھ دیر بعد اسی بنگلے سے تقریباً بیس سال کی حزن و ملال اور سنجیدگی کے تاثرات چہرے پر

ایک خوب صورت خاتون باہر نکلی وہ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے دائیں طرف کے چوتھے بنگلے میں

گھس گئی۔ غالباً پڑوسیوں کے ہاں گئی تھی کسی کام سے۔

”اکیلی کھڑی بور ہوئی رہیں اندر آجائیں نا۔“ اجیہ آلی شاپنگ بیگز کے ساتھ برآمد ہوئیں۔

”وقت گزاری کے لیے ادھر بڑے اچھے نظارے دیکھنے کو مل گئے تھے۔ ویسے آپ کی کیا یہ ایریا بھی

پاکستان ناؤن ہے۔ بڑا شاندار اور جدید لک دے رہا ہے۔“

”ہمیں تو کو رنگ ناؤن ہے، یہاں بڑے بڑے ساہوکاروں کے بنگلے ہیں، اس علاقے کی

اسکیم بہت شاندار ہے۔ علاقہ اتنا پرسکون اور خوب صورت ہے کہ کنسٹرکشن کمپنی کے مالکان اور ورکرز نے

خود بھی جگہ لے کر اپنے بنگلے بنا لیے ہیں، اس علاقے میں تعمیرات کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اسی

لیے تو اب باقاعدہ کنسٹرکشن کمپنیاں بن گئی ہیں، وہ بہترین صلاحیتوں پر مشتمل آرکیٹیکٹ، سائٹ انجینئرز

اور بلڈرز کو ہائر کر رہے ہیں۔ تمہاری یہاں جاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ویسے تمہارا آفس کس جگہ پر

ہے۔“ ”یہیں کہیں ہوگا، مجھے صحیح ایڈریس نہیں پتا۔ ارسل صبح چھوڑ کے آیا تھا، واپسی آفس ٹرانسپورٹ

سے ہوئی تھی۔“

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی پیدل چل رہی تھیں، تقریباً بارہ چندرہ منٹ بعد وہ پاکستان ناؤن پہنچ

چکی تھیں۔

☆☆☆

”مارہ! تمہیں سر بلار ہے ہیں۔“ شائستہ ابھی ابھی کسی کمرے سے نکلی تھی اس کی پیشی کا وقت آ گیا

تھا۔

”کون احسن صاحب!؟“ اس کے سینے میں دھک دھک ہونے لگی۔

”ہاں سر بھی انہی کے کمرے میں ہیں۔ شاید وہ باقاعدہ طور پر احسن فاروقی سے تمہارا تعارف

کر دانا چاہتے ہیں۔“

وہ دھڑکتے دل سے دروازے پر احسن فاروقی کی نیم پلیٹ پڑھ کر دستک دینے لگی۔

”کم آن۔۔۔!“

بارعب آواز پر وہ اندر آ گئی۔ ادارے کے سربراہ سر ہاشمی، احسن سے کسی ضروری معاملے کو ڈسکشن

کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے گفتگوروک دی۔ اس نے سلام کیا۔

”احسن! یہ ہیں آپ کے شعبے کی نئی ممبر، آرکیٹیکٹ مارہ ٹیل۔ یہ لاہور سے آئی ہیں۔ کام کے

سلسلے میں آپ انہیں گائیڈ کریں گے۔ ان کی سیٹ مس شائستہ کی سیٹ کے ساتھ ہے۔ عملی میدان میں یہ

ان کا پہلا قدم ہے۔“

سر ہاشمی دھیرے سے مسکرا دیے۔

”اور مس مارہ! یہ مسٹر احسن ہیں ہماری کمپنی کے مایہ ناز آرکیٹیکٹ اور اس شعبے کے ہیڈ۔۔۔ آپ

کا تمام تر واسطہ اور رابطہ انہی سے رہے گا۔“ مارہ نے نظر اٹھائی۔

مرک، چوک گراؤنڈ یا عمارت ہے اور کون کون سی روڈ لنک کرتی ہے۔ انٹرنس کہاں کہاں سے ہو ہے۔“ اس کا لہجہ خشک تھا۔
 ”مارے گئے۔“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے خاموشی سے سر جھکائے اسے سن رہی تھی
 ”اور فاؤنڈیشن ڈی ٹیل (Detail) میں اسکیل تو واضح ہی نہیں کیا کہ کون سا استعمال کیا ہے۔“

وہ بغور جائزہ لے رہا تھا۔

”ایلی ونشن البتہ قدرے بہتر ہے لیکن اس میں گراؤنڈ لیول اور پلاٹ لیول کے بارے میں
 مینشن نہیں کیا گیا۔ اور ہاں سیکشن K-K میں چھت کتنی موٹی ہوگی کوئی پتا نہیں ہے۔“
 وہ شرمندگی سے ہونٹ چبا رہی تھی۔

احسن کی ساری توجہ شیٹ پر تھی۔
 ”جی ایف پلان بہت عمدہ ہے لیکن اس میں آپ نے بیڈ کے ساتھ انچ واش روم کے ایریے
 پیمائش نہیں لکھی کہ اس کی لمبائی چوڑائی کیا ہوگی۔ لاؤنج کی شپ عجیب سی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آ
 نے بیڈ روم کو گنجائش سے زیادہ کھلا کر دیا ہے۔ اسی لیے بچن اور لاؤنج دونوں تنگ ہو گئے ہیں۔“
 ”اف اللہ کتنی گہری نظر ہے۔“ وہ جل کر رہ گئی۔

”سائٹ پلاٹ کی پیمائش کا پیمانہ لکھا ہی نہیں۔ اس کے بغیر یہ قطعی بے کار ہے۔“ اس نے سائٹ
 پلاٹ پر کر اس لگا دیا۔

مارہ کو اس بے عزتی پر رونا آنے لگا۔
 اب شیٹ کی سائز پر بے لے خانے میں لکھی تفصیلات اس کی مرکز نگاہ تھیں۔
 ”انسیم آف ایریا میں کل ایریا ہے پچاس ہزار مربع فٹ جس میں سے آپ نے اوپن ایریا
 ہے آٹھ ہزار مربع فٹ اور کورڈ ایریا ہے چالیس ہزار مربع فٹ۔ ذرا دونوں کو ٹوٹل کر کے بتائیے گا، با
 کا دو ہزار مربع فٹ کہاں گیا؟“

”میرے اللہ۔۔۔ اپنی ہی حماقتوں پر اسے چکر آنے لگے۔
 احسن نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے شیٹ رول کر۔

لگا۔
 ”کمال ہے، اگر کام ٹھیک نہ کیا ہوتا تو کیا یوں بدحواس ہو جاتے ہیں۔“
 گہری سانس لے کر احسن نے سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھیے ”ٹاپ“ پر کوئی یونہی نہیں پہنچ جاتا۔ پہلے وہ گرتا ہے بار بار گرتا ہے پھر اٹھتا ہے، ق
 درست کرتا ہے، سانس لیتا ہے، پیچھے تجربے کو سامنے رکھ کر اس غلطی کو دوبارہ نہ دہرانے کا عزم کرتا۔
 اور ہمت جمع رکھتا ہے اور نشان امتیاز پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں، میں بھی یونہی یہا
 تک نہیں پہنچ گیا۔ آپ غلطیاں ضرور کیجیے لیکن ان کی اصلاح بھی کیجیے، انہیں دہرائیے نہیں اور جب ا
 کی تصحیح کی جائے تو اس کو نور سے سینے۔“
 ”میں جاؤں اب۔“ وہ آنسو روک رہی تھی۔

”ہاں مگر ایک ”آخری“ غلطی بھی سنتی جائیے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”آپ نے آرکیٹیکٹ کے سائن والا خانہ تو بنادیا مگر ”اونز“ کے سائن والا خانہ نہیں بنایا۔“

”اف۔۔۔ اس نے آنکھیں پتچ کر جھینپ کر اسے سر پر ہاتھ مارا تھا۔

”آپ کو دوبارہ شکایت نہیں ہوگی۔“ وہ کہہ کر باہر آگئی۔

”اوگے۔“ وہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔

☆☆☆

چچی کے سب سے بڑے بیٹے خاور بھائی آئے ہوئے تھے، وہ جاب کی وجہ سے کراچی میں ہوتے
 تھے۔ چچی جان ان کی شادی کے لیے گزشتہ کئی سال سے لڑکیاں تلاش کر رہی تھیں مگر ابھی تک کوئی لڑکی
 ایسی ”دریافت“ نہیں ہوئی تھی جو ان کے ”اعلامعیار“ پر پوری اُترتی۔ اسی چکر میں عمر گزرتی جا رہی تھی۔
 ”کتنے دنوں کے لیے آئے ہو بھائی؟“ اجیہ آپنی قدرے دلچسپی سے پوچھنے لگیں۔

”ایک ہفتے کی چٹھیاں لی ہیں، ویسے کل یا برسوں میں مری نکل جاؤں گا۔“ وہ اندازاً تیس بتیس
 سال کے ہوں گے۔ چہرے پر عمر کے حساب سے چٹکی اور مزاج کے حساب سے کھر دراپن اور کرختگی
 نمایاں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کبھی اور کسی حال میں خوش نہیں ہوتے، اجیہ آپنی کی طرح۔
 ”کیوں بیٹے! اتنے مہینوں بعد گھر لوٹے ہو، کیا اپنوں میں بیٹھے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تمہارا۔ ہم تو
 ترس گئے تھے تمہاری صورت پر۔“

”چھوڑیں امی!“ وہ بخئی سے گویا ہوئے۔ ”میں جانتا ہوں کہ کون کتنا میری دید کا طالب رہتا ہے۔
 یہاں سب اپنے حال میں مست ہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا کسی کو اور یوں بھی یہاں رہ کر پورا ہفتہ بور
 ہونے کا میرا کوئی موڈ نہیں ہے۔“

وہ خاصی بے مرونی سے کہہ کر اوپر چلے گئے۔

چچی دل مسوس کر رہ گئیں۔

”دیکھ رہی ہیں آپ اپنے بڑے پوتے کے تیور۔ اجیہ تو اجیہ، اب خاور بھی مجھ سے ٹھیک طرح
 بات نہیں کرتا۔“

وہ ساس کے پاس بیٹھ کر دکھ سکھ کہنے لگیں۔

”قصورتہارا ہے دلہن!“ دادی اماں رساں سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”بچوں کی عمریں دیکھو، ان کی خواہشات اور خواہاں کی کیا تعبیر دی ہے تم نے۔ گھر بٹھائے بوڑھا
 کر رہی ہو، زندگی کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے والی گھڑیاں بے رس گزر جائیں تو روؤ یوں میں خود بخود
 کڑواہٹ کھل جاتی ہے۔ کتنی بار کہا ہے کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر کم از کم خاور کی دلہن تو لے ہی آؤ۔ اگر اجیہ
 اور خاور دونوں کی آنکھیں ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔“

”اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں اماں!“

ان کے پاس گھڑا گھڑا جواب تھا۔

”اپنے معیار کے گراف کو کچھ نیچے لاؤ دلہن! اللہ کو پسند نہیں ہے کہ اس کی مخلوق میں عیب نکال کر

اسے ذلیل و رسوا کیا جائے، اسے رد کیا جائے۔ ذرا حساب لگاؤ، خاور کے لیے کتنے گھروں کی لڑکیاں ٹھکرا چکی ہو۔ اس کی ناک چھوٹی، اس کی ناک بڑی، اس کے بال چھوٹے، اس کے بڑے، اس کا قد چھوٹا، اس کا لمبا، یہ امیر نہیں ہے، وہ بہت امیر ہیں، یہ جہیز کم دیں گے، وہ جہیز کے ساتھ گھر داماد بنانا چاہتے ہیں معاذ باللہ۔ دوسروں کی بیٹیوں کا تماشا لگتے لگتے اپنے گھر کو تماشا گاہ بناتی جا رہی ہو۔“

دادی نے بے لاگ تبصرہ کیا جو ظاہر ہے چچی کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”ایک پسند تو آئی تھی برسوں پہلے۔ اسے آپ کے لاڈلے پوتے اسد صاحب لے اڑے۔“ چچی جل کر بولیں۔

دادی اماں کچھ خاموش ہی ہو گئیں۔

کچھ لمحے ماحول پر معنی خیز سکوت طاری رہا۔ سنگ روم کے ایک کونے میں گھسی پیپر شیٹ پر جھکی مائرہ کو یہ سکوت بہت محسوس ہوا۔

”خیر خاور میاں کے لیے فاروقی صاحب نے انکار کر دیا تھا اور اسد کے لیے بھی نہیں مانے تھے۔ وہ تو ان کی بیٹی نے نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کی تو بیٹی کی زندگی اور ضد کے لیے مجبور ہو گئے اور اسد سے بیاہ دیا مگر اس کے بعد کوئی تعلق بھی تو نہیں رکھا انہوں نے بیٹی سے۔“

دادی اماں کا انداز بتاتا تھا کہ ان کے دل میں پوتے کے لیے نرم گوشہ بہر حال موجود ہے۔ مائرہ یکتخت کام چھوڑ کر اس داستان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یہی تو رسوا کن حرکت تھی جس کے سبب اسے گھر سے باہر نکالا گیا۔“ چچی جھج گئیں۔ ”جب خاور کے لیے انکار ہو چکا تھا تو اسد کو ان کی لڑکی پسند کرنے اور ہمیں بات کرنے کے لیے بھجوانے کی کوئی تیک نہیں بنتی تھی۔ سو تیلایا ہی سہی مگر خاور اس کا بھائی تھا، کچھ تو شرم کرتا۔ بھائی کی پسند کو اپنی پسند بنالیا۔ وہ تو فاروقی صاحب بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے مجبوراً خود چل کر ہمارے ہاں آ گئے ورنہ وہ بھی ایک عام سے صحافی کو کہاں قبول کرنے والے تھے۔“ وہ جیسے انگارے چبا رہی تھیں۔

”تم نے اور افضل نے بھی تو بے عزتی کی تھی فاروقی صاحب اور ان کی بیگم کی۔ اسد کا رشتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسد نے اصرار کیا اور دھمکی دی کہ ہم نے شادی نہ کرائی تو وہ خود کر لے گا تو تم لوگوں نے اسے اس کی بڑھک سمجھا۔ جب وہ سچ بیاہ لایا تو اسے گھر سے نکال دیا۔ بعد میں برسوں تک خبر نہیں لی۔“

”ہم کیوں رکھتے ایسے ناخلف کو اپنے گھر میں۔“ چچی اپنی کدورت اور بغض چھپانے لگی تھیں۔

”میرے بیٹے کا حق چھیننا، اس کی جگہ خود دو لہا بن بیٹھا ہماری بے عزتی کرائی۔ میں تو اسے بھی معاف نہیں کروں گی، نہ میرے جیتے ہی وہ اس گھر میں قدم رکھے گا، بس میں نے کہہ دیا ہے۔“

چچی کی آنکھوں میں شعلے سے دھنسنے لگے تھے۔

”یہ اسد صاحب کون ہیں؟“ مائرہ کا تجسس آسمان کو چھونے لگا تھا، اس لیے موقع پاتے ہی روا سے پوچھ ڈالا۔

”ابو کی پہلی بیوی کے بیٹے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔“ وہ یہ تو بہر حال جانتی تھی کہ چچا افضل کی پہلی شادی ڈیڑھ سال بعد ختم ہو گئی تھی، جب بیوی بچے کو جنم دیتے ہی چل بسی تھیں، یا سسین چچی سے ان کی دوسری شادی تھی۔

”یہ وہی روایتی سوتیلے پن کا جلا پاپا ہے یا سچ بچا اسد بھائی کی زیادتی ہے۔“ وہ سوچنے لگی۔

”خیر مجھے کیا۔“ اس نے سر جھٹکا۔ دادی اور چچی کی باتوں کی روشنی میں اس کے دل میں اسد بھائی اور ان کی بیوی کا شیخ کچھ اچھا نہیں بناتا تھا۔

☆☆☆

وہ ارسل کے ساتھ اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے کو رنگ ٹاؤن کی پرسکون مارکیٹ میں آئی تھی۔

”ارے۔۔۔ یہ تو وہی ہیں۔“ سیاہ شلوار قمیص میں دو سال کے جڑواں بچوں کو دونوں ہاتھ کی ایک انگلی پکڑائے وہ مارکیٹ کی طرف ہی آ رہی تھیں۔

”ارسل دیکھو، یہ بچے کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ دونوں بالکل ایک جیسے ہیں، کیسے پھول سے مکھڑے ہیں۔“ وہ ایک جیسے سرخ اونٹنی کپڑوں میں ملبوس پیارے پیارے صحت مند بچوں پر مڑی۔

ارسل نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر ٹھک کر رک گیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ خاتون قریب آئیں تو ارسل نے محتاط سے انداز میں سلام کیا اور دلچسپی سے بچوں کو دیکھنے لگا۔

”ولیکم السلام۔ ارسل کیا حال ہے تمہارا اور گھر میں تو سب ٹھیک ہیں نا۔“ خاتون بہت خوش اخلاقی اور اپنائیت سے ملیں۔ ارسل نے بچوں کو باری باری گود میں لیا۔ مائرہ نے محسوس کیا ان کی دھیمی مسکراہٹ میں ایک طرح کا سوز اور کرب شامل تھا۔

”اسد بھائی کیسے ہیں؟“ ارسل نے آہستگی سے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ ہنسنے والے انداز میں زبردستی مسکرائیں۔ مائرہ کو کھلندے ارسل کا ایک دم سنجیدہ ہو جانا سمجھ میں نہیں آیا۔

”آپ یہاں کو رنگ ٹاؤن کب آئیں؟“

”چھ سات ماہ ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے ملائمت سے کہا۔

”اصل میں وہاں کرائے بہت زیادہ ہو گئے تھے جو موجودہ حالات میں انور ڈاہل نہیں تھے پھر اہی اور بھائی بھی ادھر تھے، اس لیے ان کی قربت کی خاطر یہاں آ گئی۔“

”گھر کہاں پھلپھلایا ہے؟“ ارسل کی دلچسپی اور توجہ یقیناً ان کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

”یہاں سے کچھ دور ایک سنگل پورشن والا چھوٹا سا گھر ہے۔“

”کیا نمبر ہے گھر کا؟“ اب کے وہ سچ سچ چکرا گئیں۔

”کیا تم آؤ گے اپنے بھائی سے ملنے؟“ ان کا لہجہ کا پٹنے لگا۔

”آج بھی سکتا ہوں۔“ وہ دھیمے سے بولا۔ خاتون جیسے نہال ہو گئیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ خوشی اور جانے کس احساس سے ان کی آواز بھگ گئی۔

تھی۔

”یہ کون تھیں ارسل؟“ خاتون کے آگے بڑھ جانے پر مائرہ نے صبری سے پوچھنے لگی۔
 ”ہماری بھابھی!“ اس نے دھماکا کیا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ ہکا گئی۔

”ہمارے سوتیلے اور سب سے بڑے بھائی اسد کی بیوی۔“
 ارسل کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ لہجہ عجیب سی چیمیں اور سختی لیے ہوئے تھا۔
 ”وہی جس سے گھر والوں کو چھوڑ کر شادی کی تھی انہوں نے۔“
 ”ہاں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”اسد بھائی کو ہر صورت میں وہیں کرنی تھی اور جلد ہی کرنی تھی کہ لڑکی والوں کو جو بادل ناخواستہ راضی ہوئے تھے، یہی شرط تھی اور امی ابو مان کر نہیں دے رہے تھے، مجبوراً خود ہی کرنی۔ امی نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا۔ ابو بھی اسد بھائی کو معاف کرنے پر تیار نہیں تھے کہ جس گھر سے خاور بھائی کے لیے انکار ہوا تھا، وہاں دوسرے بیٹے کی بھی کیوں کریں۔ لہذا بھائی کو امی ابو کے حکم پر گھر چھوڑنا پڑا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ ارسل کا لہجہ لاپرواہی لیے ہوئے تھا۔
 ”اوہ۔۔۔“ مائرہ نے ساری سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ”لیکن ان خاتون کو میں نے کچھ دن پہلے وہ سامنے والے بنگلے سے لٹکتے دیکھا تھا۔“ وہ ارسل کے برابر چلتے ہوئے ابھی بھی مطمئن نہیں ہو پارہی تھی۔

”وہ ان کی امی کا گھر ہے۔“ مائرہ کے قدیم ایک دم رک گئے۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ بھونکا کھڑی رہ گئی تھی۔

”مگر وہ تو احسن فاروقی کا گھر ہے، وہ جو آدمی نکبت ہیں۔“ شٹا کر پوچھ رہی تھی۔
 ”احسن، ان کے بھائی ہوتے ہیں۔“ ارسل کے اطمینان میں فرق نہیں آیا۔
 ”ارے۔“ اسے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

”اب تو رشتہ داری“ بھی نکل آئی ہے احسن صاحب۔“ وہ تصور کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔
 ”بھلے، زبردستی کی سہی۔“

”ارسل!“ وہ کسی گہری سوچ میں غم اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بھابھی تو خاصی ناکس لیڈی ہیں۔ میرا مطلب ہے چچی جان کی باتوں سے تو ان کا عجیب سا امیج بنا تھا جیسے۔۔۔“ وہ رک گئی۔

”نہ صرف بھابھی بلکہ اسد بھائی بھی بہت اچھے بندے ہیں۔ انہوں نے منت سماجت، خوشامد سب کر کے دیکھ لیا تھا مگر ابو اور امی اس شادی میں شریک ہونے پر تیار نہیں ہوئے۔ شادی کے بعد بھی جب بھی ملے، انہوں نے ہمیشہ دوستی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا مگر وہ بھی امی کی انا، غصہ اور ضد کی نذر ہو گیا۔ علاوہ ازیں خاور بھائی بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اسد بھائی اپنی بیوی کو لے کر گھر میں آئیں یا رہیں۔“

لگتا تھا ارسل اس معاملے میں مکمل طور پر غیر جانبدار تھا، ورنہ گھر کے ہر شخص کو اس نے اسد کے ہی دیکھا تھا۔

مائرہ نے رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے دل ہی دل میں اسد بھائی کے گھر کا ایڈریس دہرایا۔
 اسے حزن و ملال کی چادر میں لپیٹی اس اداس شہزادی کے دکھوں کو کھوجنے کا اشتیاق ہو چلا تھا۔

☆☆☆

ابھی احسن پہنچا ہی تھا کہ نیل ہوئی۔
 ”راہی آیا! آپ ٹھہریں، میں دیکھ لیتا ہوں۔“
 بلکے آسمانی شلواریں میں وہ بڑے عام سے حلیے میں تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

”آپ کیا میرا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آئی ہیں بی بی؟“
 وہ ہنر پرٹ کے کاٹن کے اسٹاکش سوٹ میں ملبوس مائرہ کو دیکھ کر متعجب ہوا۔
 ”نہیں احسن صاحب!“ وہ اسے یہاں پا کر شٹائی گئی تھی۔
 ”اصل میں۔۔۔ میں۔۔۔ بھابھی سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ ہچکچائی۔
 ”کون بھابھی؟“ وہ حیران ہوا۔

”میرا مطلب ہے اسد بھائی کی مسز۔“ وہ تھوک نکل کر بولی۔
 ”مگر اسد صاحب سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“ وہ دہلیز پر جم کے اٹھا۔
 ”وہ میرے چچا زاد بھائی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔“ احسن کے تپتے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ”تشریف لائیے۔“ اس نے راستہ

ڈویا۔
 ”السلام علیکم۔“ سامنے ہی ملگجے سے براؤن کپڑوں میں کچن میں مصروف عمل بھابھی نظر آ گئی۔

”وعلیکم السلام۔“ اسے دیکھتے ہی انہوں نے سب کام چھوڑ دیے اور جوش و مسرت کے ساتھ اسے رلے آئیں۔

”کیا حال ہے تمہارا اور تم یہاں تک کیسے پہنچیں۔ تم یقیناً ارسل کی کوئی رشتہ دار ہو، ہے نا۔ میں اس دن مارکیٹ میں تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تھا۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر پوچھ رہی تھیں۔

”جی۔“ وہ احسن کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ اسد بھائی کے تایا کی بیٹی ہیں۔“ احسن نے تعارف کرایا۔

”اسد بھائی کہاں ہیں؟“

”کون جانے، وہ کہاں ہیں۔“ بھابھی نے ایک سرد آہ بھری۔

”کیا مطلب؟“ وہ خاک نہ تھی۔

”کچھ نہیں، تم یہ بتاؤ چائے پیو گی یا کولڈ ڈرنک۔“ بے تکلفی سے بتاؤ۔ ایک مدت بعد تو اسد کا کوئی ان آیا ہے اس گھر میں۔“ وہ ٹال گئیں۔

مگر مارہ کا تجسس حد سے سوا ہو گیا۔

”احسن! پلیز کولڈ رنک لے آؤ گے کارز والی شاپ سے؟“

وہ جیسے بڑے تکلف اور قدرے شرمندگی سے بھائی کو کام کا کہہ رہی تھیں۔ ساتھ ہی انہوں

الماری سے اپنا پرس نکالا۔

”جی ضرور، یہ رہنے دیجیے۔“ اس سے پہلے کہ وہ پرس کھولیں، احسن جا چکا تھا۔

”آپ کیوں خواخواہ تکلف کر رہی ہیں بھابھی! میں تو بس آپ سے ملنے اور اسد بھائی کو دے

آئی تھی۔ کیا وہ ہمیں جاب کرتے ہیں؟“

اسے جانے کیوں اسد سے ملنے کی بے چینی لاحق تھی۔

”شادی کے بعد دو سال تک باقاعدگی سے جاب کرتے رہے تھے مگر پھر وہ بیمار ہو گئے اور جا چھوڑنا پڑی۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”وہ کیا کام کرتے تھے؟“

”ایک اخبار میں ایگزیکٹو ایڈیٹر تھے۔ مالک نے سارا اخبار ان پر چھوڑ رکھا تھا۔“

”ایسی کون سی بیماری ہوگی کہ انہیں نوکری چھوڑنا پڑی۔“

”ان کے دماغ میں ٹیومر ہے۔“ بھابھی کہتے ہوئے رو دیں۔ مارہ کے قدموں تلے سے ز

نکل گئی۔

ہائے اللہ! اتنی خوب صورت اداس آنکھوں اور شہزادیوں کی سی آن بان والی عورت اور دماغ

سے فرشتہ صفت بچوں کے سر کی چھت میں نقدیر نے کیا بھانک ڈگایا تھا۔

”ٹیومر زیادہ خطرناک تو نہیں ہے۔ نہ پھیلنے والا ہے لیکن وہ ایسی جگہ پر ہے کہ جب تکلیف

ہے تو اسد درد کی شدت سے باگل سے ہو جاتے ہیں۔ یہ دورہ آدھ پون گھنٹے کے دورانیے کا ہوتا ہے۔

اتنا شدید ہوتا ہے کہ بعد میں گھنٹوں غڈ ہال اور نیم بے ہوش پڑے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت

”دماغی نوکری“ (صحافت) تو نہیں نبھ سکتی تھی۔“

مارہ کا دل پھٹنے لگا۔

اس نے افسردگی و حزن کی تصویر بنی بھابھی کو دیکھا اور لب کاٹنے لگی۔

”اب وہ کیا کرتے ہیں؟“

”ٹیکسی لی تھی۔ ارادہ تو تھا کہ ڈرائیور کو دے دیں گے، وہ روز کے ڈھائی تین سو تیار ہے گا،

گزارا چلتا رہے گا مگر ڈرائیور صاحب آئے دن نئے نئے فراڈ کرنے لگے۔ کبھی ایک ہزار چاہیے، گا

کے انجن میں مسئلہ ہو گیا ہے، کبھی دو ہزار مانگ رہا ہے کہ تیسرا گیسٹر خراب ہے، اس کی گزاریاں ڈال

ہیں، کبھی ٹائر ختم ہو گئے ہیں اور ساڑھے چار ہزار کے نئے منگوانے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اتنے ہم نے

نہیں جتنے اوپر لگا دیے اور وہ سب پیسے وہ کھا گیا۔ اس دھوکا دہی کے بعد اسد خود ہی ٹیکسی چلانے

ہیں۔ جب طبیعت سیٹ ہو، چلے جاتے ہیں۔“

انہوں نے آہستگی سے بتایا۔

مارہ سکتے کے عالم میں ان کا پرسکون اور ٹھہرا ہوا انداز گفتگو نوٹ کر رہی تھی۔

”کیا اتنے حالات خراب ہو چکے ہیں۔“

”میں جاب کرنا چاہتی ہوں مگر بچے کس کے پاس چھوڑوں۔ امی اکیلی دودھ کو نہیں سنبھال سکتیں،

ب دیکھو۔۔۔“ وہ ہنسنے لگی۔

وہ اسد سے ملی تو ان کی شخصیت کی سادگی، شفقت، اور خلوص سے از حد متاثر ہوئی۔

”بھلا اتنے پیارے اور سنجھے ہوئے بندے کو کیا پڑی ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو ستائے۔“

اسے چچی کی کن ترازیوں میں کوئی حقیقت نظر نہیں آئی تھی۔ احسن کولڈ ڈرنکس لا کر دینے کے بعد چلا

گیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے بزرگوار! ویسے پہچان تو لیا ہوگا۔ میں رابی آپا کا بھائی

ہوں۔“ وہ شائستگی سے گویا ہوا۔ افضل چچا نے سر تا پا اسے دیکھا۔

اونچا لمبا کرٹل سراپا، وجیہہ دوبرو چہرہ، پختہ و بلند ارادوں کی ترجمان پر تکممت آنکھیں۔

وہ بڑی نظر میں اس نوجوان کی جادو اثر شخصیت سے متاثر ہو گئے تھے مگر جو خوبی تعارف مکمل ہوا، ان

کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ہنچ گئیں۔

”بیٹھو میاں!“ وہ گہری سانس لے کر اشارہ کرنے لگے۔ گھر آئے مہمان کی میزبانی تو بہر حال

نبھائی تھی۔

”گزشتہ ساڑھے تین برس سے آپ کا بیٹا آپ کی نظروں سے اوجھل ہے، آپ اتنا عرصہ ان سے

کیسے دور رہ پائے ہیں۔ بہر حال یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ بس بہت ہو گیا۔ ضد

انہوں نے کی، انا کی دیواریں، ہم نے کھڑی کر لیں، یوں رابطہ ٹوٹ گئے، رشتے جھوٹ گئے لیکن محترم!

جو کچھ ہوا دونوں طرف سے ہوا۔ ایک دیوار ہم نے گرا دی ہے، دوسری آپ گرا دیں تاکہ انہیں مشترکہ

طور پر قبول کر کے خاندان میں شامل کیا جائے۔ یقین کیجیے آپ کا بیٹا از حد تکلیف میں ہے۔ آپ کو یقیناً

اطلاع پہنچی ہوگی، وہ جس طرح جی رہے ہیں، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ

انہیں اپنائیں۔ باپ کی پناہوں میں لے کر ان کا مکمل علاج کروائیں۔ آپ کے پاس اتنا کچھ ہے کہ

آپ کر سکتے ہیں۔ ان کے بچے آپ کی نسل، آپ کے وارث ہیں۔ اگر دیر ہوگئی تو خدا نا خواستہ آپ کا

بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“

اس کا لہجہ بلا کا درمند، تہذیب و شائستگی کا آئینہ دار تھا۔

بیچا افضل کے چہرے سے کرب پھٹکنے لگا۔ انہوں نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”وہ آپ کی بہن کے گھر کی چھت ہے۔ آپ تو معافی تلالی کی سفارش کریں گے ہی۔ بات

ساری یہ یہ میاں کہ اس نے نہ صرف باپ دادا کی عزت اچھالی بلکہ خود سے شادی رچا کے ہمیشہ

بیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا۔ ہماری اہمیت صفر برابر بھی نہ رہی اس کے نزدیک۔ آج مشکل میں اسے

باپ اور گھریاؤں کا رہا ہے۔“ چچی تلخ ہو گئیں۔

”دیکھیے خاتون! اسد بھائی نے مجھے ہرگز نہیں بھیجا۔“ وہ بڑی مشکل سے ضبط کیے ہوئے تھا۔
 ”میں اپنے طور پر آپ کے اور ہمارے خاندان کے اس مشترکہ مسئلے کا مناسب اور معقول
 چاہتا ہوں۔ یہ باتوں کے مسئلے اگلی سہولت نہیں چلانے ہیں، ہمیں کچھ سوچنا ہوگا۔“
 ”ہمیں کچھ نہیں سمجھنا سمجھنا۔“ چچی خجی سے بولیں۔
 ”وہ ٹیکسی چلا کر ہمارے پڑکھوں کی عزت خاک میں ملا رہا ہے، کسی کو منہ دکھانے کے قابل
 رہے ہم۔“

”محنت مزدوری کرنا کوئی عیب یا برائی تو نہیں ہے۔ مجھے تو اپنے بہنوئی کے اس فعل سے ا
 خاندان پر کوئی آج آتی محسوس نہیں ہوئی۔“ وہ رساں سے بولا۔ چچی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
 ”آپ کی بات ہم نہیں کر رہے، اونچے خاندان میں ہر بات ”جائز“ بن جاتی ہے۔ ہم درمیا
 طبقے کے شریف اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارے ہاں یہ سب نہیں ہوتا۔“ انہوں نے
 لہجے میں کہا۔

ان کا خاندانی غرور و تفاخر اور دوسرے معنوں میں اپنے ذلیل و رسوا کرنے کا انداز گویا کھلاوا
 مگر احسن اپنی ماں کی تربیت کی بدولت خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔
 ”شرافت اور عزت و حرمت کسی خاص طبقے یا خاندان کے لیے مخصوص نہیں ہوا کرتی۔ م
 خاتون!“ وہ خشک انداز میں گویا ہوا۔
 چچی نے سی ان کی کردی۔

”اور رہی بیماری۔۔۔ تو میاں بیماریاں تو ہر نفس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ میں خود آئے دن ہائی
 پریش کے ہاتھوں بے دم رہتی ہوں۔ اگر اسے علاج کے لیے پیسے جائیں تو ہم دو چار ہزار کا بندوبست
 کئے دے دیں گے، اس سے زیادہ ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔“
 وہ اپنی ہی رو میں بہہ رہی تھیں۔

وہ ارے دنیا! ذرا سا اختیار کیا لی جائے فوراً فرعون بن بیٹھتی ہے۔
 احسان اور ترس کے کوڑے مارنی ہے۔
 مجبور یوں کا مذاق بناتی ہے، تماشا دیکھتی ہے، اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
 ”آپ کے گھر میں سب کچھ ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بچا افضل سے مخاطب ہوا۔ ”مگر انسا
 نہیں ہے۔“

کہہ کر وہ رکنا نہیں، تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ افضل چچا کی ایک لمحے کو ستانے میں آگئے۔
 کی بیماری کی تفصیلات کچھ دن پہلے ماثرہ نے بھی ان کے گوش گزار کی تھیں۔
 ”یہ جذباتی بلکہ میلنگ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“
 چچی انہیں دوبارہ اپنے ”اثر“ میں لے آئیں۔

”وہ ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، گھر کے اخراجات قابو میں نہیں آ رہے۔ یہ بھی پتا چل گیا
 کہ باپ اچھا کھانا کھا رہا ہے، گھر میں اللہ کا شکر ہے خوش حالی آچکی ہے، اسی لیے اپنے بھالے بیٹے

کی راہ استوار کر رہا ہے، وگرنہ جس کو ٹیوٹر ہو، وہ سارا دن ٹیکسی چلا سکتا ہے۔ دھوپ بارش میں باہر
 ہے، سب ڈھونگ ہے۔“
 چچی نے جی سے کہتے ہوئے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”امی! یہ کون صاحب تھے۔“ ردا، ندا اور اجیہ آپنی تینوں مشتاق نظر آئیں۔ ماثرہ البتہ خاموشی سے
 اپنے ناخن دیکھتی رہی، وہ سب کچھ سن چکی تھی۔
 ”اسد کا سالہ تھا۔“ انہوں نے مختصراً کہہ کر بیٹیوں کے چہرے دیکھے۔ ان پر ستائش اور شوق کی
 نمایاں محو مگر اجیہ۔

اجیہ کے چہرے اور آنکھوں سے اور بھی بہت کچھ چھلک رہا تھا جو صرف ماں کی حساس نظر ہی
 سن سکتی تھی۔
 ”اوہ! تو گویا یہ بات ہے۔“ وہ کسی جوڑ توڑ میں لگ گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر بچا افضل کے
 لیے میں آ گئیں۔ وہ کسی گمبھیر سوچ میں غلطاں دکھائی دیے۔

”بات سنیں، آپ اس کو پیغام بھجوائیں کہ اس کی واپسی اس صورت میں ممکن ہو سکتی ہے اگر وہ اجیہ
 ناد اور حصّتی کا بندوبست کر دے۔“ ان کا انداز براہ راست اور راز دارانہ تھا۔
 ”لا حول ولا قوت۔“ بچا افضل گہر کر اٹھ بیٹھے۔ ”وہ کیسے کرے گا۔“
 ”یہ احسن ہے نا۔“ ان کے لہجے میں ملائمت در آئی۔ ”اتنا بھر پور کڑیل جوان پھر اتنی اچھی پوسٹ
 ایمان تو ہے، ہی اعلا، ہم سے اونچے ہیں، سو نے رہا کہ ایک ہی ایک ہے۔“
 چچی نے اتنے بھر پور انداز میں درغلایا کہ بچا افضل کو اس قسم میں سوچنے ہی بن پڑی۔

☆☆☆

احسن اپنے ہاتھ میں اس کی بھجوائی ہوئی پیپر شیٹ رول کیے اس کے پاس آیا تھا۔
 ”میں ماثرہ، ادھر آئیں۔“ احسن نے جی سے پکارا۔
 ”الہی خیر، اب کیا ہو گیا۔“ ناچار وہ سیٹ سے اٹھ کر ڈھلوانی پلین سطح والے بورڈ کے قریب آئی،
 ماہوشیت بچھا رہا تھا۔
 ”یہ جن صاحب کے گھر کا نقشہ آپ نے ڈیزائن کیا ہے، وہ گاڑی اپنے سر پر کھڑی کریں گے
 ؟“ انداز استہزا سے تھا۔

اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ پورچ تو بنایا ہی نہیں تھا، اس جگہ کو اپن ایریے میں شامل کر دیا تھا۔
 ”آپ دھیان سے کام نہیں کرتیں؟“ وہ بلا دروغ اس پر برس رہا تھا۔
 ”آپ نے ہی تو کہا تھا کہ غلطیاں ضرور کیجیے، اسی طرح بندہ سیکھتا ہے۔“ اس کے منہ سے بے تکا
 نواز نکل گیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔
 ”مگر یہ بھی تو کہا تھا ان کی اصلاح بھی کیجیے۔“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بغور
 کی شکل دیکھی۔ وہ اس کی نظروں سے گھبراہٹ کی۔
 ”غلطی کرنا غلط نہیں ہے مگر اس کی درستگی نہ کرنا بہر حال غلطی ہے۔“ وہ اس کی گھبراہٹ محسوس

کرتے ہوئے مبہم سا مسکرایا۔

”بلکہ غلطی پر غلطی ہے۔ کیوں احسن صاحب!“ کچھ فاصلے پر کام میں مگن شائستہ نے سے اضافہ کیا۔
”بالکل صحیح ہے۔“ احسن قدرے شوخی سے کہہ کر دلچسپی سے ماثرہ کی طرف دیکھنے لگا۔
بوکھلا کر شیٹ پر نگاہیں جمادیں۔

”بہر حال آپ ان صاحب کی کوٹھی پر نظر کرم کیجیے اور انہیں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے پورج عنایت فرمادیں۔ عین نوازش ہوگی۔“
وہ جھینپ کر نئی شیٹ نکال کر نقشہ بنانے لگی۔
احسن وہیں کھڑا دلچسپی سے اس کی حرکات و سکنات نوٹ کرنے لگا۔

ماثرہ نے چوری سے دیکھا۔ گرے سوٹ میں اس کا شاندار سراپا مزید اٹھ رہا تھا۔ لمبا قد ہو گیا تھا۔

”ماثرہ بی بی! ماثرہ بی بی۔ آخر آپ کو غلطیاں کرنے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے۔“ وہ اس طرف سے قدرے جھک کر نقشے پر ایک جگہ نشاندہی کرنے لگا۔

”یہ گھر کی اوپننگ کا شیڈول آپ بنا رہی ہیں، اس میں کھڑکیوں کی پیمائش نہایت غیر ہے۔ ایک کھڑکی چھ بائی چھ کی ہے تو دوسری آٹھ بائی چار کی۔ ہندروم میں یہ تناسب آنکھوں کو لگے گا، اسی طرح جی ایف پلان میں آپ نے ڈرائنگ اور لاونج دونوں طرف سے اینٹرنس ہیں جبکہ شیڈول میں صرف ایک دروازہ لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں لاونج والی کھڑکی کا شیڈول ذکر ہی نہیں ہے۔“

وہ نقشے پر غور و خوض کر رہا تھا۔ اُن جانے میں وہ اس کے قریب کھڑا تھا کہ اس کی شیٹ پر انگلیاں لرزے لگیں۔ اسے از حد گھبراہٹ لاحق ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔
”یہ درست کیجیے نا یہاں سے۔“ اسے رکتا دیکھ کر وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔
”میں درست کر کے آپ کی سیٹ پر پہنچا دوں گی۔“ وہ وحشت زدہ سی چیخے ہٹ گئی۔

احسن نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔
اس کی گھبراہٹ میں جو خوب صورت سا ”اعتراف“ اور ”احساس“ چھپا ہوا تھا، اس نے چونکا سا دیا۔

نہ جانے کیوں وہ دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔
یہ تو وہ جانتا تھا کہ وہ جب بھی میدانِ محبت میں اترے گا، فتح یاب ہوگا جس کو ”چاہے“ سے ”پائے“ گا۔

”اوکے۔“ وہ ترنگ میں آکر سیٹی بجاتا وہاں سے چلا گیا۔ لنج بریک میں ان کا دوبارہ آنا ہوا۔

انتظامیہ نے چھوٹی سی مگر مکمل قسم کی کینٹین بنا رکھی تھی۔ بیٹھنے کے لیے میزیں بھی لگائی گئی

سیکون ماحول میں نسبتاً عمدہ لپکا ہوا کھانا مل جاتا تھا۔

”آپ اکیلی بیٹھی ہیں۔ شائستہ بی بی کہاں رہ گئیں۔“ وہ اس کی میز کے پاس آ گیا۔
”وہ اپنی امی کے ساتھ ہاسپٹل گئی ہیں۔ صبح ہی ہاف ڈے لیو کی درخواست ایڈمن انچارج سے روائی تھی۔“ اس نے سزاٹھایا۔

”آپ کی اجازت ہے۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
”جی۔۔۔ جی پلیز۔۔۔“

”آپ آرڈر کر چکی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں، ابھی تو نہیں۔“ وہ قدرے زور سے نظر آنے لگی۔

احسن کاؤنٹر پر چلا گیا، یہاں سیلف سروس کا رواج تھا اور بے منٹ ایڈوانس ہوتی تھی۔
”راہی آپ اتار رہی ہیں، آپ اکثر ان کے ہاں آتی رہتی ہیں۔“ وہ اس کی کیفیت کے پیش نظر سنجیدہ

ع پر آ گیا۔
”ہاں۔“ اس نے افسردگی سے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کیونکہ اس کے سوا ان کے لیے کچھ نہیں کر

”وہ چپ سا ہو گیا۔“
”احسن صاحب!“ وہ کچھ سوچ کر اسے مخاطب کر رہی تھی۔

”میرا خیال ہے ”صاحب“ کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔“
ماثرہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور سر ہلادیا۔ ماثرہ نے نظریں جھکا لیں اور

ن کمل ہو گئی۔
”مگر شاید ”بی بی“ کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔“ وہ مدہم سے انداز میں چوٹ کر گئی۔

احسن کھل کر ہنس دیا۔ ”بالکل ہو سکتا ہے۔ اگر ”بی بی“ کو ”بیوی“ میں بدل دیا جائے۔“

اس کا چہرہ ایک دم سرخ بڑ گیا تھا۔
”بہر حال، آپ کہیے کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔“ معا احسن کو اس بات کے لیے یہ ماحول نامناسب

ہوا۔ فوری سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ماثرہ کی بھی جان میں جان آئی۔
”آپ معاشی اعتبار سے ”ساؤنڈ“ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ افضل چچا کی فیملی سے بہت

گنے ہیں۔ آپ راہی آپا کی مدد نہیں کر سکتے؟ میرا مطلب ہے اسد بھائی کے علاج کے لیے پیسے

سکتے ہیں۔“
”گزشتہ چھ ماہ سے کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ ملول اور دل گیر انداز میں گویا ہوا۔ ”دونوں میاں بیوی

اصولوں سے ایک انچ پیچھے بننے کو تیار نہیں ہیں۔ خودداری، عزت نفس کی شدید ترین پاس داری اور

یت دونوں کی کٹھنی میں پڑی ہے گویا۔“ وہ یاسیت سے بولا۔
”آپ بھابھی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسد بھائی کو نہ بتائیں۔ کوئی بہانا کر دیں، یہ ان کے شوہر کی

لا اور موت کا معاملہ ہے۔“

”اسد بھائی نے انہیں قسم دے رکھی ہے کہ ان کی زندگی کے لیے کسی سے بھیک نہ لیں۔ وہ سگے باپ کے آگے جا کر حالت زار بتا کر مدد حاصل کرنے کے بھی رولڈا کر نہیں ہیں۔ میں اپنے طور کے والد صاحب کے پاس گیا تھا کہ شاید کوئی بہتری نکل آئے مگر نہ۔ وہ خاموش ہو گیا۔ ان

”آپریشن میں کتنے پیسے لگیں گے۔“
”دو، ڈھائی لاکھ۔“

”آپ اسد بھائی کو سمجھائیے تو سہی۔“ وہ جانے کیوں ان کے لیے اتنی بے چین ہو رہی تھی۔ ”ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔“ اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا۔
”اب ایک آخری حربہ رہ گیا ہے۔ سوچتا ہوں وہ کرگزروں۔“ وہ کسی بوج میں ڈوب گیا۔
”کیا؟“ وہ تجسس ہوئی۔
”ابھی نہیں، بعد میں بتاؤں گا۔“ وہ خیالوں کے تانے بانے بننے لگا۔

”راہی!“ اسد نے ان کے بہتے اشک ہاتھوں سے پونچھے اور کھینچ کر گلے سے لگالیا۔
”کیوں پریشان ہوئی ہو۔ دیکھو، میں اب ٹھیک ہو گیا ہوں۔“ دورہ پڑنے کے پون گھنٹے تک طرح تڑپنے کے بعد درد کا دورانیہ کم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا تھا۔
”میں مر جاؤں گی اسد! میں آپ کو یوں تو بٹا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔“
میں آپ کے سارے دوا اپنے نام لگا سکتی۔ یہ عذاب کچھ برکتوں نہیں اتارتا۔“
وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”بریا بات۔“ اسد نے جبے سے شاخہ ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
”تم تو بہت صبر اور جوصلے والی عورت ہو چکے ہو۔ یہ کچھ برکت کیوں ہار گئیں۔“

”اب نہیں ہے مجھ میں ہمت۔ سال ہو چلا ہے آپ کو اذیت کی اتنی بھی میں سلگتے ہوئے۔ مجھ یہ سب کچھ نہیں دیکھ جاتا۔ اسد! آپ پلیز! میں نے اپنی بات مان لی۔ مجھے اس گھر کو، ان بچوں کو اور زندگی اور صحت و سکون کی ضرورت ہے۔“
”انہوں نے باپ کی نارگفتہ بدحالت دیکھ کر بھرتوں کی طرح کہنے ہوئے دونوں بچوں کو لپی آتے میں بھر لیا۔ راہی ان سے الگ ہو کر دوپٹے سے اشک طاف کرتی رہی۔
”جس طرح اچھے دن زیادہ دیر تک نہیں رہتے، اسی طرح برے دن بھی نہیں رہتے۔ آزار ہا

پر صبر اور ضبط کا مظاہرہ ان کا دورانیہ گھٹا دیتا ہے۔ بے طبعی بدابت خود ایک طویل عذاب ہے۔ میرا فرض کسی سے کیوں ہوں جسے سالوں تک لوٹا نہ سکوں۔ اگر اللہ نے میرے نصیب میں صحت و تندرستی لوگوں کی رفاقت لکھی ہے تو وہ خود بخود کوئی وسیلہ بنا دے گا۔ قرص برکت کو ختم کر دیتا ہے راہی! اور پھر بھی اپنے مثالے سے قرص! کیوں اہل سر کو ہمیشہ کے لیے جھکا نا چاہتی ہو۔ میں اپنی پیادگی کے لیے کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا، نہ تمہیں اس بات کی اجازت دوں گا۔ میں اس نیاری کے خلاف لڑوں

ند سے استقامت اور شفیابی کی دعا کروں گا دوسروں سے کیوں، اللہ سے کیوں نہ مانگوں۔ تم بھی اسی پر روبرو رکھو۔“ وہ دھیرے دھیرے ان کا سر تھپتھپاتے ہوئے تسلیاں دے رہے تھے۔
”میں امی کے ہاں گئی تھی، ان سے یہ درخواست کرنے کے وہ دونوں بچوں کو شام تک اپنے پاس لے لیں تاکہ میں اس دوران جاب کر سکوں۔ ایک رینویٹ کمپنی میں چار ہزار سیکری کی ایک جاب ملے گی۔ گمرانی کی مجبوری۔ وہ اتنے چھوٹے بچوں کو ان کیلئے نہیں سنبھال سکتیں۔ وہ کہہ رہی تھیں اسد سے کہو گھر پر مہر جایا کرے۔“

راہی بڑا دکھا ہوا دل لے کر ماں کے گھر سے واپس آئی تھیں۔
اسد کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ رہ چک گئی۔
”تم نے وقف ہو راہی! اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی انہیں آزمانے چل دیں۔ ہم نے سب سے فائزات مول لے کر شادی کی تھی۔ کوئی بھی دل سے راضی نہیں تھا۔ یہی کے لیے ممتا کے جذبات سے مجبور ہو کر تمہاری امی نے تمہیں قبول تو کر لیا ہے مگر میرے لیے گنجائش نکالنا ان کے طرف اور دل کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ میرا سامنا، میری موجودگی ان کی شکست خوردگی اور خاندان کی رسوائی کی اپنا تازہ کر دیتی ہے۔“

راہی، اسد کی زیرک اور خناس طبیعت کی قائل سی ہو گئیں۔ امی ان کی خواہش سننے ہی سے اٹھ جاتی تھیں۔

”ساری عمر پھولوں کے بستر پر سونے والی امی کیا اپنے خاوند اور بچوں کو پالنے کے لیے مزدوروں کی طرح مشقت کرے گی۔ گھر کا بوجھ دھوے گی۔ اس دن کے لیے اس چند ہزار روپیہ والے معمولی سے صحافی سے نانا جوڑا تھا۔“
”امی! مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی افسوس یا ملال نہیں ہے۔ فقط یہ ہی نہیں ہے نا، ان کے علاوہ تو وہ سب کچھ میرے پاس ہے جس کی کسی آئیڈیل پرست اور خواب دیکھنے والی لڑکی کو مننا ہوا کرتی ہے۔ امی! وہ فطرت کے اتنے نیک، اتنے سلجھے ہوئے، اتنے نرم دل اور شفیق ہیں کہ ان سے صرف محبت ہی کی جاسکتی ہے۔ ساڑھے تین برس ہو گئے ہیں میں ساڑھ رستے ہوئے مگر آج تک میں نے اس شخص کی زبان سے اپنے لیے سخت، ناروا جملہ نہیں سنا۔ وہ میرا، میرے جذبات کا، میرے دل کا سر آرم کر جاتا ہے، میری ہر بات کو ہر آنکھوں پر رکھتا ہے۔ اسے جاننے کا سلسلہ ہے امی! اسے نبھانے کا نانا ہے۔“

”امی۔۔۔ امی۔۔۔ ماں ہو کر بیٹی کے کلیجے پر چھری چلائے ہوئے آپ کا دل نہیں کاٹتا۔“ وہ

تڑپ کر رہ گئی تھیں۔
 انہوں نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی بھی یہاں قدم نہیں رکھیں گی۔“
 ”میں تو تمہارے فائدے کو کہہ رہی تھی! تمہاری حالت دیکھتی ہوں تو مر جانے کو جی چاہتے ہیں۔“
 ”میں نے مستقبل اور خوشیوں کے لیے خود غرض ہو گئی ہوں میں۔“ آنسو امی کی آنکھوں سے ٹپک کر گالوں پر لڑکھینے لگے تھے۔

”آپ نے تو مجھے ہی بے موت مار دیا ہے امی!“ ان کی آنکھوں میں سیلاب اتر آیا تھا پھر دو چھپاک سے باہر نکل گئیں۔
 ”بس اسد! آپ کم از کم تین بجے تک گھر پر رکا کریں گے، جب میں آفس سے آ جاؤں تو بھلے نیکی چلانے چلے جایا نیچے گا۔ واپس آ کر میں بچوں اور گھر کو دیکھ لیا کروں گی۔“ انہوں نے اسد کو سہ پہر تک بچوں کے پاس رکھنے کے لیے مٹا کر ہی دم لیا تھا۔
 ”میں نہیں چاہتا کہ تم پیسوں کے لیے باہر دھکے کھاتی پھرو۔“ وہ مرجھائے ہوئے شکست خوردہ انداز میں گویا ہوئے۔

”یہ کوئی ہمیشہ کی روٹین تھوڑی ہے، کچھ عرصے بعد آپ ٹھیک ہو جائیں گے پھر آپ کام پر جا کر کریں گے اور ہم ماں بچے گھر میں موج اڑایا کریں گے۔“ انہوں نے امید کے جگنو دھیرے سے ہاتھ میں پکڑے۔
 اسد کے لبوں پر کرہناک سی تھکی تھکی مسکراہٹ تیر گئی تھی۔
 ان کا دل کسی اتھاہ میں ڈوب رہا تھا۔ اتنی محبوب، اتنی عزیز از جان اور حسین مورنی جیسی بیوی کو روزی رزق کے لیے دفنوں میں رلتے دیکھنے کا تصور بھی ان کے لیے سوہان روح تھا۔ انہوں نے ایک اذیت بھری سانس اندر کھینچتے ہوئے دیوار پر نظریں جمادیں۔

☆ ☆ ☆
 ”آپ نے اسد سے بات کی؟“ چچی افضل چچا سے پوچھ رہی تھیں۔
 ”کون سی بات۔“ انہوں نے ہنسیوں کا چکا نہیں۔
 ”اجیہ اور احسن والی بات۔“ چچی جھلا گئیں۔
 ”ہاں میں نے پیغام بھجوایا تھا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ اسے اور اس کے بیوی بچوں کو خاندان میں جگہ دیں، اسے اپنی سرال سے ایک نیا رشتہ قائم کرنا ہوگا تاکہ دونوں گھرانوں کے تعلقات معمول پر آسکیں۔“

☆ ☆ ☆
 ”پھر اس نے کیا جواب دیا۔“ چچی بے صبری سے پوچھنے لگیں۔
 ”وہ کہتا ہے اول تو وہ شرائط پر ہم سے رشتہ داری کو استوار نہیں کرے گا دوم یہ کہ احسن شادی کے لیے لڑکی پسند کر چکا ہے۔ رابی نے احسن سے بات کی تھی۔“
 ”لا حول ولا قوۃ۔“ چچی بری طرح بھنا گئیں۔
 ”تو پھر یہ بھی سن لیجیے۔ اگر وہ شرائط پر رشتہ داری کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر میں بھی اس لڑکی کو مرنے

”میری پوزیشن اپنے میکے میں وہ نہیں ہے جو ایک ماں باپ کے دل کی بچی خوشی کے ساتھ بیاہی لڑکی کی ہوتی ہے۔ کچھ مشورہ تجویز بھی دیتی ہوں تو ڈرتے ڈرتے لحاظ اور مروت کے مارے نہ حق کی ہوں نہ بیاہتا لڑکی کی طرح دندانے ہوئے یہاں وہاں اپنی مرضی کر سکتی ہوں۔ میں خود کو وہاں لاؤں اور مہمان سا تصور کرتی ہوں۔“ وہ افسردگی سے گویا تھیں۔
 ”باہر نکل ہو رہی تھی۔“
 ”میں دیکھتی ہوں، آپ اپنی ہانڈی میں ”بڑی“ رہیں۔“ وہ ابھی۔

☆ ☆ ☆
 ”میں دو پہر کو آتی تھی آپ کی طرف، اسد بھائی سے پتا چلا آپ جاب پر گئی ہیں۔ بچوں سے البتہ ات ہو گئی۔ اچھا کیا جو آپ نے جاب شروع کر دی۔ یہ ایک مثبت اور دانش مندانہ فیصلہ ہے۔“ مازہ انہیں سراہا۔
 ”اور کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا مازہ!“
 رابی کو یہ تخلص اور حساس طبع لڑکی بہت پسند آتی تھی۔
 ”کچھ دن پہلے تمہارے چچا اور میرے سر کی طرف سے صلح کا پیغام آیا تھا، مع ایک شرط کے۔ ہم اہار گئے، صلح کا پیغام بھی دشمنی میں بدل گیا۔“ وہ ملال سے بولیں۔
 اب وہ اس سے ہر طرح کی بات کر لیتی تھیں۔
 ”پیغامبر“ کون تھا اور شرط کیا تھی۔“ مازہ نے دلچسپی سے دریافت کیا۔
 ”اُزل آیا تھا۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔
 ”شرط یہ تھی کہ اجیہ کے لیے احسن کا رشتہ کرنے کی کامیاب کوشش کی جائے“
 ایک لمحے کو مازہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔
 ”اسد تو یہ پیغام سنتے ہی غصے میں آ گئے تھے، میں نے البتہ امی سے بات کر کے بات بتانے کی ش ضرور کی تھی مگر ایک تو امی کو منظور نہیں تھا، دوسرے احسن سے بات ہوئی تو اس نے بھی معذرت لی کہ وہ اس ضمن میں پہلے ہی کچھ سوچ چکا ہے۔“
 مازہ کو اپنا چہرہ مرنے کی جذبات سے گرم ہوتا محسوس ہوا۔ کتنی نبضیں بحال ہو گئی تھیں۔
 ”حالانکہ میں نے بھی ”کچھ“ سوچا ہوا تھا اس کے لیے مگر۔“ وہ ایک خصوصی نگاہ اس پر ڈال کر کچھ نہ کہتے رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆
 ”میری پوزیشن اپنے میکے میں وہ نہیں ہے جو ایک ماں باپ کے دل کی بچی خوشی کے ساتھ بیاہی لڑکی کی ہوتی ہے۔ کچھ مشورہ تجویز بھی دیتی ہوں تو ڈرتے ڈرتے لحاظ اور مروت کے مارے نہ حق کی ہوں نہ بیاہتا لڑکی کی طرح دندانے ہوئے یہاں وہاں اپنی مرضی کر سکتی ہوں۔ میں خود کو وہاں لاؤں اور مہمان سا تصور کرتی ہوں۔“ وہ افسردگی سے گویا تھیں۔
 ”باہر نکل ہو رہی تھی۔“
 ”میں دیکھتی ہوں، آپ اپنی ہانڈی میں ”بڑی“ رہیں۔“ وہ ابھی۔

”حسن ہوگا، کبیر ہا تھا شام کو چکر لگاؤں گا۔ اللہ سلامت رکھے میرے بھائی کو۔ ہیر نے جیسا اور شفاف دل لے کر پیدا ہوا ہے۔“ مائرہ کے دروازے کی طرف بڑھتے قدموں میں سرشاری سی آگئی۔ ”السلام علیکم۔“ دروازہ کھلتے ہی احسن کی نظر سرخ لباس میں کھلی کھلی مائرہ پر پڑی تو اندر تک تانگی دوڑ گئی۔ اس کا موڈ خود بخود شگفتہ اور نشاط ہو گیا تھا۔

”کیا حال چال ہیں جناب۔“ پر شوق انداز میں پوچھا گیا۔
 ”ٹھیک ہوں۔“ اس کا انداز خیا آلود تھا۔ وہ راستے سے ہٹ گئی تھی۔
 احسن اندر آ گیا۔ ”آپ! مجھے اسد بھائی سے بہت ضروری کام ہے۔“
 ”ہاں ہاں، بیٹھو نا۔ وہ کس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ دوپٹے سے کیلے ہاتھ پونچھتی چکن سے نگلیں ”جائے بناؤں۔“

”نہیں آپ! ابھی ابھی میں امی کے ساتھ بی کے آ رہا ہوں۔ آپ! یہ کچھ سو دا ہے۔“ وہ ہچکچا کر بھاری تھیلہ چکن میں رکھنے لگا۔

”احسن۔۔۔!“ صدے اور دکھ کی شدت سے ان کی آواز بندھ گئی۔
 ”یہ نہ کیا کرو احسن! میں خود اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو جاتی ہوں۔“
 ”کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! یہ سب بلکہ اس سے بہت زیادہ آپ کا حق ہے۔ بیاہ وینے سے خلیوں کے حق تھوڑی ختم ہوتے ہیں۔ کتنی جلد آپ نے دیکھا ہوگا جب بھی نیکیے والے آتے ہیں، لہ۔ پھندے اور تحائف کے انبار کے ساتھ آتے ہیں۔“ وہ ان کے احسانات کو ہلکا ہلکا کرنا چاہتا تھا۔
 ”میکے کی سوغاتیں اس وقت سوغاتیں لگتی ہیں جب گھر میں ہر طرح کی سبزی اور آسودگی ہو دوسری صورت میں یہ بھیک، ترس اور رحم ہی شمار کی جاتی ہیں۔“ رائی کو اسد کا ہنسا داؤا گیا تھا۔
 ”یہ بچوں کے اور آپ کے کپڑے ہیں، یہ بھلونے ہیں، ان کے جوتے بھی ہیں اور یہ سیریلیک کے کچھ پیکس ہیں۔“ احسن دوسرا بڑا شائیک بیک گاڑی سے نکال لایا۔
 ”نہیں نہیں، میں یہ ہرگز نہیں رکھ سکتی۔“ پلیر احسن۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئیں۔
 ”چلیں ابھی نور ہیں نا، اسدہ نہیں لاؤں گا۔“ وہ مصلحتی بولا۔ رائی نے اسے چائے دینے کے بعد چکن میں پڑا تھیلہ ہولا۔

انہیں ماں کے اس درجہ خیال رکھنے اور زانی بے بسی پر دونا آئے لگا تھا۔

”میں کل بھی آیا تھا اسد بھائی! آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ آج میں اظہار صاحب کو بھی اپنے ہمراہ لے کر آیا ہوں۔“ احسن کے بلوانے پر اسد نے نو وارد کی طرف دیکھا۔
 ”ارے آپ تو غالباً ایک ذیلی نیوز پیپر کے ایڈیٹوریلز پر ہوتے ہیں۔ انٹر میں غلطی نہیں کر دیا آپ کا نام اظہار صدیقی ہے۔“ اسد کے انداز سے یہی کھلنے لگی۔

”بی ہاں اور میں آپ کے لیے ایک پروپوزل لے کر آیا ہوں۔“ ادھر عمر اور شکل و جسامت سے معتبر نظر آنے والے اظہار صدیقی صاحب محل سے گویا ہوئے۔

”جی فرمائیے۔“ وہ قدرے حیران نظر آئے۔

”حسن صاحب نے مجھے آپ کی بیماری کے متعلق بتایا ہے، آپ ایک منجھے ہوئے اور برائے قلم کار ہیں، صحافت کے میدان میں آپ کا ایک نام ہے، ایک مقام ہے اور بہت کم عمر سے میں آپ نے ایڈیٹر شپ کی۔“ وہ مہارت اور پرمکشن حاصل کی ہے جو بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہمارے چیف صاحب کو ایسے ہی باصلاحیت، ایماندار اور اپنے کام سے لگن رکھنے والا صحافی درکار ہے۔ میں ان کی طرف سے آپ کے لیے جاب کی آفر لے کر آیا ہوں۔“

”لیکن میں تو جناب نہیں کر سکتا۔“ حیرا مطلب ہے اپنی بیماری کی وجہ سے فی الحال میں دماغی صحت نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے اپنی لاچارگی کا اظہار کیا۔

”یہی پروپوزل تو نے لے کر آیا ہوں۔“ ادھر وہ آپ کو لون کے طور پر رقم دے گا، آپ اپنا امپریشن کو لاؤ گے اور پھر ہمارا اخبار جوائن کر لیں۔ ایک سال تک آپ فزی کام کریں گے، اس کے بعد آپ کی بے کاچائیں فیصد قمر سے میں کٹ جائے گا۔ آیت! یہ کمپنی کی رقم میں کی آجائے گی اور جب رقم پوری ہو جائے گی تو پوری تنخواہ ملا کرے گی، یعنی جوہ ہزار سات سو پچاس روپے، کیسے منظور ہے۔“

”اسد کا چہرہ خوشی سے گلزار ہو گیا پھر ایک دم کچھ سوچ کر انہوں نے لائے رنگوں پر قابو پایا اور گہری نظروں سے اظہار صدیقی صاحب کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”میری بہن شائستہ، احسن صاحب کے آفس میں کام کرتی ہیں۔ احسن نے ایک بار یونہی باتوں باتوں میں اپنے صحافی بہنوں کا ذکر کیا تھا۔ بات سے بات نکلی، شائستہ نے گھر آکر ذکر کیا تو مجھے آپ سے رابطہ کا سہرا مل گیا۔“

”مائرہ! ارے بھئی، تم کہاں رہ گئی تھیں۔ اماں پریشان ہو رہی تھیں۔“ چچی اسے اندر داخل ہونا دیکھ کر جھٹکا کر مخاطب ہوئیں، مگر پھر ان کی بولی بند ہو گئی۔

”ارے یہ سن کو سنے آئی ہو تم! ان کے دل میں کوئی خدشہ جا گا۔ یہ تو وہ بھر جا ل جاتی تھیں کہ وہ آج کل امند سے گھر کے چکر لگا رہی تھی۔ دو تین مرتبہ ارسل بھی کیا تھا پرانی سبھی کو تو نہیں روک سکتی تھیں مگر ارسل کو کوئی ہی ڈانٹ پلائی تھی۔

”نہیں آپ کے بڑے خواں پوتے ہیں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔ اخبار بڑھتے بچا افضل نے چونک کر اخبار چرے سے ہٹایا۔ ایک جیسے ہلکے نیلے اولی لباسوں میں روٹی کے ٹکڑوں جیسے نرم و گلابی بھر پور تندرست اور خوب صورت بچے دل موہ لینے والی شائستگی کے ساتھ مائرہ کے دونوں ہاتھوں کی انگلی پکڑے کھڑے تھے۔

”بونہہ!“ چچی جلدبلا کر کمرے سے نکل گئیں۔

”جاؤ بیٹے! یہ تمہارے دادا ابو ہیں۔“ وہ بچوں کو لے کر پچا افضل کے پاس آئی۔

انہوں نے بے اختیار انہیں گود میں بھر کر پیشیاں چوئیں۔
 ایک ٹھنڈک سی اتڑی چلی گئی تھی۔ انہیں لگا جیسے انہوں نے معصوم و ستین صورت والے چھوٹے سے پیارے سے اسد کو کیچر میں سمولیا ہے۔

پدرانہ شفقت پکھل پکھل کر ان کے سینے سے بچوں کے دل میں منتقل ہونے لگی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے تھے۔

”کیا نام ہے آپ دونوں کا۔“ ان کا لہجہ بہت مدہم تھا۔ ان کی نظریں بچوں کے چروں پر جم ہی گئی تھیں۔ وہ بار بار یوں دیکھ رہے تھے جیسے دل نہ بھر رہا ہو۔

ماثرہ ان کی کیفیات نوٹ کر رہی تھی۔ اس نے بچوں کو دادی اماں سے بھی ملوایا۔ انہوں نے جی بھر کر پیار کیا اور تری ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ انہیں واپس چھوڑنے جا رہی تھی تو اس کے ہمراہ چچا افضل بھی تھے۔ دادی اماں نے بچوں کو پانچ پانچ سو روپے دیے تھے، ساتھ میں پھل، چپس، بسکٹ، چاکلیٹس وغیرہ بھی ہمراہ تھے۔ ”ابو جی آپ۔۔۔!“ باپ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ جونہی حیرت ٹوٹی، انہیں سلام کیا۔

ہر ابھرا ہند بھار درخت خزاں کے بے رحم پنجے میں کس بری طرح مر جھا گیا تھا۔ ان کا دل کٹنے لگا۔ وہ ان کا خون تھا۔ ان کا دینا تھا۔ وہ کیسے اس حقیقت سے انکار کر سکتے تھے۔

”بیٹے! گھر چلو، میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔ بچوں کو بھی لے لو۔“ وہ ہار گئے تھے، لہجہ دل گیر اور بھرا ہوا تھا۔

”مگر میری بیوی۔۔۔ رابی۔۔۔“ ان کا لہجہ مضبوط اور ٹٹل تھا۔

”اسے کچھ عرصے کے لیے میکے بھیج دو، جب حالات ٹھیک ہوں گے تو۔۔۔“ وہ نظر پڑا کر بولے، لہجہ کمزور تھا۔

”نہیں ابو جی!“ اسد کے لہجے کی مضبوطی اور قطعیت میں انچ برابر کی نہیں آئی۔

”پھر ہم“ بھی تب ہی آئیں گے جب حالات ”ہم“ سب کے لیے ٹھیک ہوں گے۔ وہ ہم سے الگ نہیں ہے ابو جی! میرے لیے اس کی قربانیوں، محبتوں اور حوصلوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جب ہر قدم ”وہ“ ہم قدم“ رہی ہے تو پھر اب یہ دوری کیوں۔۔۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ابو جی! رابی ہوتی تو آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی۔ وہ بہت اچھی ہے، اتنی اچھی کہ آپ اس کو پسند کیے بغیر رہ ہی نہیں سکیں گے۔“ افضل چچا تھوڑی دیر تک بیٹھ کر شکستہ قدموں سے واپس چلے گئے۔

☆☆☆

اسد کے آپریشن کی تمام تر دوڑ بھاگ احسن کی تھی۔ رابی سر سے پیر تک بھائی کی شکر گزا تھیں۔ وہ احسن کے ساتھ ہاسپٹل جاتیں تو پیچھے ماثرہ دونوں بچوں کو سنبھالتی تھی۔ چچی کی ناراضی اور غصے کے باوجود وہ اکثر بچوں کو اپنے ہمراہ گھماتے آتی تھی۔

اس نے چچا کو اسد بھائی کے لیے پیسوں کے بندوبست اور آپریشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ چور لہجے میں وہ اکثر ہی اس سے اسد کی طبیعت پوچھتے تھے۔ آپریشن والے دن وہ بھی ہاسپٹل میں تھے۔ دادی اماں گھر پر بے چین پھر رہی تھیں۔ وہ بار بار مصلّا بچھا کر بیٹھ جاتیں۔

ماثرہ دونوں بچوں کے ساتھ ہاسپٹل میں تھی۔ احسن وقفے وقفے سے رابی آپا کو تسلیاں دے رہا تھا۔ جو ضبط کی تصویر بنی آنسوؤں کو اندر ہی اندر رہی تھیں۔

”آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔“ یہ اطلاع گویا سوکھے دھانوں پر پانی ڈال گئی تھی۔ ایک ماہ تک گھر میں آرام کرنے کے بعد اسد نے اظہار صدیقی کا اخبار جوائن کر لیا تھا۔

ماثرہ ایک ہفتے کی چٹھی لے کر لاہور آئی تو امی نے عجیب و غریب بات سنا لی۔

”تمہاری یاسمین چچی نے تمہارے لیے ارسل کا رشتہ مانگا ہے، انہوں نے فون پر بات کی تھی۔“

”میرا اور ارسل کا رشتہ۔۔۔“ وہ ہکا بکا کھڑی ماں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ”وہ تو مجھ سے صرف ایک آدھ سال بڑا ہے۔ اور اس کا زندگی گزارنے کا اسٹائل نہایت لا پرواہ اور ”منجلا“ قسم کا ہے وہ عملی زندگی کی ذمہ داریوں اور ضرورتوں کے بارے میں کیا جانے۔ میں اتنے انچور بندے سے شادی نہیں کر سکتی۔“ امی نے اس کی رائے جان کر دوبارہ بات نہیں چھیڑی۔ مگر جب وہ اسلام آباد واپس آئی تو چچی کا رویہ بہت اکھڑا اکھڑا اور اجنبی سا تھا۔

غالباً ارسل کے رشتے سے انکار ان تک پہنچ چکا تھا۔ یہ بے گانہ اور بھٹایا ہوا رویہ اسی کا رد عمل تھا۔

ماثرہ کو زیادہ عرصہ تک یہاں اپنا قیام مشکوک نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

”احسن! مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔“ امی غضب ناک نظر آرہی تھیں۔

احسن خاموشی سے ان کی کیفیت ملاحظہ کر رہا تھا۔

”پہلے بہن اور اب بھائی صاحب بھی اسی خاندان میں جا گھسے“ ہیں۔“ وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

”کیا تم لوگوں کو اور کوئی گھر نظر نہیں آیا تھا۔ ابھی تو ایک ”ذلت“ کا بوجھ سر سے نہیں اترا۔ اپنے خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ معاملہ سمٹا ہے تو اب تم نئی قیامت ڈھانے چلے ہو۔“ وہ خچی سے بولیں۔

”امی۔۔۔ کم از کم اس سلسلے میں تو کوئی ذلت، رسوائی یا غلط بات شامل نہیں ہے۔“ وہ انہیں شانوں سے تھام کر صوفے پر لے آیا۔

”کیونکر شامل نہیں ہے۔“ وہ گڑگڑا کر بولیں۔

”جن لوگوں سے ہمارے تعلقات کشیدہ ہیں ان سے رشتہ مانگنے کیسے جاؤں؟ پہلے ان کے بیٹے خادر کے لیے انکار کیا۔ پھر تمہارے اور اجیہ کے رشتے سے۔ اب وہاں دوسری لڑکی کو تمہارے لیے مانگنے کیسے جاسکتی ہوں، اور پھر وہ ذلت میں کیسے بھول سکتی ہوں جب رابی کی مرنے والی کیفیت کے پیش نظر اس کے اور اسد کے رشتے کی بات کرنے میں اور تمہارے ڈیڈی ان کے ہاں گئے تھے اور انہوں نے جی بھر کر طرزیہ کیے تھے۔ ذلیل کیا تھا اور رابی کو کیا ہے سے انکار کر دیا تھا۔ ہرگز نہیں۔“ ان کا لہجہ سخت تھا۔

”آپ افضل صاحب کے ہاں جانے کے بجائے ان کے بڑے بھائی شکیل صاحب کے ہاں لاہور جائیں۔ ان سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگیں۔ ماثرہ کے والدین بہت سلجھے ہوئے، بڑھے کھسے، مہذب لوگ ہیں۔ ان کا رہن سہن بھی ہماری طرح کا ہے۔ مجھے یقین ہے ان سے مل کر آپ کو دلی خوشی ہوگی۔“

”مگر خاندان تو ایک ہی ہے نا؟“ وہ اس کے مسلسل اصرار پر جھنجھلا کر رہ گئیں۔ ”ظاہر ہے دونوں بھائیوں کا آپس میں میل جول تو رہتا ہی ہے۔“

”ماڑہ کی فیملی بہت کم کم یہاں آتی ہے۔ دونوں گھرانوں میں اتنی قربت نہیں ہے کہ ایک دوسرے کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکیں۔ دونوں اپنے اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ پلیز امی۔ رابی آپ کی کونجی رشتہ دل و جان سے پسند ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔“ احسن بچی ہوا۔

”اچھا بابا۔۔۔“

امی لاہور خاصے برے دل سے اور محض بے کی خوشی کی خاطر روانہ ہوئی تھیں لیکن ماڑہ کے گھر والوں سے مل کر ان کے دکھ رکھاؤ اور تہذیب و شائستگی کے پر جوش رویے نے ان کی ساری ناپسندیدگی اڑا کر چھو کر دی۔

انہوں نے بڑی چاہ سے ماڑہ کے رشتے کی بات کی۔ انہیں اس کے والدین کا اخلاق بہت بھایا تھا۔ انہوں نے انکار تو نہیں کیا مگر سوچنے کے لیے مہلت ضرور طلب کی۔

☆☆☆

ماڑہ صرف چچی کے ہی نہیں سب گھر والوں کے تیور بدلے بدلے محسوس کر رہی تھی۔ خاص طور پر اجیہ تو اسے یوں گھورتیں گویا کچا جابائیں گی۔ رشتے سے انکار پر ارسل ویسے ہی اس سے کترانے لگا تھا۔ باقی بہن بھائیوں کا رد عمل بھی بے زار کن اور اجنبی ہوتا جا رہا تھا۔

اور اس دن تو اس نے چچا افضل کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے غصہ اور سرد مہری محسوس کر لی۔

”احسن نے اپنی والدہ کو ہم سے بات کرنے کے بجائے لاہور کیوں بھیجا؟“ وہ خشک لہجے میں اس سے مخاطب تھے۔

”تو گویا اسی لیے بھاگ بھاگ کر اسد کے ہاں جاتی تھیں۔۔۔“ چچی جھنجھکا رہیں۔

ماڑہ کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ پڑ گیا۔

”آپ۔ الزام نہیں دے سکتیں چچی۔“ وہ برہمی سے بول رہی تھی۔

”میں اسد بھائی کے ہاں صرف بھابھی کے لیے جاتی ہوں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہنا ہی ہے تو یہ کہیں کہ اس میں احسن سے ٹینگیں بڑھاتی ہیں۔“ وہ طنز آہولی۔

”دیکھا۔۔۔ دیکھا۔“ چچی کا بارہ سوانیزے پر پہنچ گیا۔

”کیسی معصوم سی تھی جب آئی تھی اور چار دن میں پرلگ گئے ہیں صاحبزادی کو۔ بس آپ ٹکلی بھائی سے کہہ دیں کہ وہ کسی صورت اس رشتے کے لیے ہاں نہ کریں۔ ورنہ ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ ہماری جان کے دشمنوں سے میل کر رہے ہیں، غضب خدا کا میرے بچے ٹھکرائے جا رہے ہیں اور دوسروں کے بچے اسی خاندان میں کھپ رہے ہیں۔“

اصل تکلیف تو اسی بات کی تھی انہیں۔

ماڑہ سخت تلملائے ہوئے انداز میں باہر نکل گئی تھی۔

”ٹکلی اس رشتے کے لیے کیوں انکار کرے۔ کیا ہمیشہ ہر بات تمہاری ہی سنی اور مانی جائے گی۔“

”ہاں!“ دادی اماں اچانک کمرے میں داخل ہوئیں۔ لہجہ آہستگی لیے ہوئے تھا۔

ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔

”ورثہ اچھا ہے، ٹکلی نے قانون کر کے مجھ سے مشورہ کیا تھا اور میں نے اسے ہاں کرنے کو کہا۔“ دادی اماں کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”ہاں ہاں، آپ تو ہمیشہ سے میرے بچوں کی دشمن رہی ہیں۔ ان کی کوئی خوبی آپ کے دل کو نہیں آتی۔ جنہوں نے میرے بچوں کو ٹھکرایا، آپ انہی کی جھولیوں میں بھر رہی ہیں۔“ چچی اونچی آواز میں رونے لگیں۔

چچا افضل بھی ان پر خفا ہو رہے تھے مگر دادی اماں نے پروا نہیں کی۔

”وہ بھی تمہارا بیٹا تھا، جس کے ساتھ تم نے دشمنی کی اور اب تک کر رہے ہو۔“ ان کی آنکھوں میں

نی اترنے لگا۔

”زہرہ کو میں اپنی خوشی سے بیاہ کے لائی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھی تو میں نے بھیلی کا چھالہ بنا کر لھا تھا۔ اسد کو جنم دیتے ہی وہ مر گئی۔ لیکن افضل علی اسد کا باپ تو زندہ تھا۔ تم نے جیتے جی اس کے سر سے باپ کا سایہ چھین لیا۔ وہ بدترین بیماری میں مبتلا ہو کر پوتا بنا رہا۔ اور تم بیوی کے کہنے میں آ کر اسے ہو گیا سمجھ کر بے حس بنے بیٹھے رہے۔ تم نے باپ ہو کر خبر نہیں لی اور اس بچی نے محض پچاڑا ہونے کے تے ان کے دکھ کچھ میں ساتھ دیا۔ ان کی خبر گیری کی۔“ افضل علی اتم انسانیت کہاں رکھ کے بھول آئے

و؟“ ان کے انداز میں ملامت تھی۔

”میں سمجھا تھا بونٹی معمولی سا سر درد ہے۔ باقی سب جذباتی بلیک میلنگ ہے۔ جب پتا چلا تو بات ہٹ آگے جا چکی تھی۔“ وہ نظر پڑا کر کف افسوس ملنے لگے۔ لہجہ نادم اور آہستہ تھا۔

”اسے اور اس کے بیوی بچوں کو گھر واپس لا کر تم اس بے حس کا ازالہ کر سکتے تھے۔“

جواب میں وہ چچی کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ دادی اماں کے لبوں پر طنزیہ مسکراتھٹ ابھر آئی۔

”بہر حال، یہ کاغذات تمہیں دکھانا تھے۔“ انہوں نے قائل فضل چچی کو دی۔

”یہ کیا! آپ نے نہایت قیمتی مالیت کا کمرشل پلاٹ اسد کے نام کر دیا ہے۔“ افضل چچا کے پیچھے

بٹی کی پر زور ہائے سچی گونجی تھی۔ وہ کچھ پڑکڑکڑاؤں پر گر گئی تھیں۔

”ہاں۔۔۔“ دادی اماں بہت پرسکون تھیں جسے کوئی بو چھ سڑ سے اتر گیا ہو۔ ”تمہارے باپ نے ہ پلاٹ مجھے دیا تھا اور تم جانتے ہو، جو چیز اپنی زندگی میں تحفتا کسی کو عنایت کی جائے، وہ وراثت میں نال نہیں کی جاتی۔ وہ میری چیز تھی اور میں اسے تحفے کے طور پر اسد کے نام کر رہی ہوں۔ تاکہ اگر تم سے اپنے خاندان کی شناخت اور حصہ دینے سے انکاری ہو جاؤ تو بھی اس کے پاس ”ورثہ“ کے طور پر کچھ نہ بچے ضرور رہے۔“

وہ کہہ کر واپسی کے لیے مڑ گئیں۔

”اور ہاں، کوئی جائے نہ جائے، میں ماڑہ کی شادی میں ضرور جاؤں گی۔“

دادی اماں ”حاضرین“ کو سناٹے کے عالم میں جھوڑ کر چلی گئیں۔

”وہ پلاٹ کسے کم بھی پچاس لاکھ مالیت کا ہے۔ میں کب سے اس لگائے بیٹھی تھی کہ شاید آپ کے یا خاور بیٹے کے نام کر دیں مگر۔۔۔ اف اتنا دھوکا، اتنا فراڈ اتنا عرصہ خدمتیں ہم نے کیں اور صلہ

دوسروں کو مل گیا۔“ چچی واوایا جانے لگیں۔

لیکن افضل چچا حیرت انگیز طور پر پرسکون ہو گئے تھے، شاید بیٹے کے محفوظ مستقبل کا سوچ کر ہو گئے تھے۔

☆☆☆

دو ماہ کے اندر اندر شادی کی تاریخ طے ہو گئی، گویا چٹ منگنی پیٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی آفس سے چھٹی لے کر لاہور جا چکی تھی، دادی اماں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ان کا ارادہ بڑے پاس مستقل رہنے کا تھا۔

اسد بھائی اور رابی آپا نے اس رشتے کا پھر پور خیر مقدم اور دلی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

رابی بہت دل سے بھائی کی بری بنا رہی تھیں۔

اس دن احسن کی مایوں بھی جب اسد نہایت عجیب سے تاثرات چہرے پر لیے احسن کو ڈھو ہوئے اس کے کمرے میں آئے۔

”آئیے اسد بھائی۔ میں تو امین کے ”بھیا نک حملے“ سے بچنے کے لیے یہاں چھپا بٹھا ہوا شوخی و شرارت اور ایک نئی سی ترنگ تو یوں بھی ان دنوں احسن کے رویوں میں سے بھونپتی محسوس تھی۔“ میں تم سے جو کچھ پوچھوں گا سچ سچ بتانا ہوگا۔“ ان کا چہرہ گہیر اور لہجہ خوف ناک حد تک تھا۔ احسن کا دل دھڑکا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کہیے۔“

”میں چیف ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں یہ دریافت کرنے گیا تھا کہ مجھے دو ماہ سے پوری مل رہی ہے جب کہ پروپوزل کے مطابق پہلے ایک سال مجھے فری کام کرنا تھا۔ بغیر سٹریکے۔ اگر بعد ہر ماہ کوئی ہوتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو ہر ماہ پوری سٹریک ملے گی۔ کیونکہ ادارے نے آپ کے آپریشن کی رقم نہیں دی اور نہ ہی ایسا ہوا کرتا ہے۔ رقم کسی اور نے دی ادارے کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ میں تو کھڑے قدم سے گر گیا احسن۔۔۔!“

وہ گہری سانسیں لینے لگے۔ لہجہ وحشت زدہ تھا۔

”بتاؤ، تم نے میرے ساتھ یہ فراڈ کیوں کیا۔ کیوں اظہار صدیقی کے پاس گئے۔ یہ جھوٹ بولا۔۔۔“ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”میں تم نے دی تھی نا۔“

”اسد بھائی۔۔۔“ اس نے بحرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

”یہ سچ ہے کہ اظہار صدیقی صاحب از خود میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ آفر کی تھی جب آپ ٹھک ہو جائیں تو ان کے آفس کو جوائن کر لیں۔ چیف ایڈیٹر صاحب باصلاحیت صحافیوں کے لیے ہمیشہ گنجائش نکال لیتے ہیں، البتہ باقی کا پلان میرا گھڑا ہوا تھا۔ اظہار صدیقی صاحب اور ایڈیٹر کو اعتماد میں لینے کے بعد اس پر عمل کیا گیا تھا۔ آپ اور رابی آپا مجھ سے رقم لینے پر کسی طور رضا نہیں ہوتے تھے۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں آپ کے والد صاحب کے پاس بھی گیا تھا وہ ہی آپ کو اپنا لیں، بہر حال باپ سے مدد لینا کسی طور شرمندگی کا باعث نہیں ہوتا مگر وہ بھی راضی

وئے تو میں نے اظہار صدیقی صاحب کا سہارا لیا۔“

اسد نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے احسن کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ بری طرح ہراساں

کھائی دیا۔

”اسد بھائی! پلیز، آپ رقم کو قرض سمجھ لیجیے۔ بھلے مجھے لوٹا دیجیے گا بعد میں۔ لیکن آپ مجھ سے

اراض نہ ہوں۔“ وہ التجائیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”کیا تمہاری آپا بھی اس ”پلان“ میں شامل تھیں؟“ وہ اسے تول رہے تھے۔

”نہیں، صرف مائرہ کو پتا تھا شروع سے ہی۔۔۔“

”وہ بھی بہت گھٹی نکلی۔“ اسد بڑبڑائے۔

”اسد بھائی! بس پلیز، آپ اس بات کو بھول جائیے۔ اپنی انا کا مسئلہ بنا کر کڑھتے نہ رہیں۔

یقین کیجیے میں پہلے آپ کا بھائی ہوں پھر سالا ہوں۔ آپ یوں سمجھ لیں، گویا اپنے بھائی کا پیسہ استعمال کیا ہے۔“ وہ شدتوں سے انہیں منانے کے جتن کر رہا تھا۔ اسد نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے تھے۔

”کتنے عجیب مگر کتنے بلند ہوتم، اتنا بڑا اور اتنا پیارا، حساس دل کہاں سے پایا ہے تم نے، بولو۔“

☆☆☆

بارات لاہور پہنچ چکی تھی۔

تکلیل صاحب نے افضل چچا کی فیملی کو کارڈ بھیجا تھا مگر صورت حال کے پیش نظر ان کی آمد کی کسی کو

وقع نہیں تھی۔

حیرت انگیز طور پر شادی سے ٹھیک دو دن پہلے چچی اور چچا مع اہل و عیال شادی میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔

چچی کا رویہ مائرہ کے ساتھ بہت شفیق اور نرم تھا۔ افضل چچا بھی گرم جوشی سے ملے تھے۔

زیادہ حیرت تو انہیں چچی جان کے اس بیان پر ہوئی۔

”تم رخصت ہو کر احسن کے گھر چلی جاؤ گی تو میں بھی اپنی بہو اور پوتوں کو گھر لے آؤں گی۔ گھر

میں سادہ سی تقریب ہوگی۔ صرف تکلیل بھائی اور احسن کی فیملی کو بلاؤں گی۔ اماں جی کو تو میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اور ہاں میں بارات کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی بھی! اسلام آباد جا کر احسن کا ولیہ

بھی تو اٹھنے دینا ہے۔ احسن بذات خود کارڈ دینے آیا تھا۔ میں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔“

”یا الہی! کیا یہ چچی ہی ہیں۔“

مائرہ کو نندا اور وردہ سے مزید معلومات حاصل ہوئیں۔

”خاور بھائی کراچی میں از خود شادی کر چکے ہیں۔ انہوں نے امی سے پوچھا تو درکنار شادی میں

شامل کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اجیہ آپا کو ایک چالیس سالہ ادھیڑ عمریہ پروفیسر صاحب پسند آ گئے تھے۔

موصوف ایک گیارہ سالہ بیٹی اور آٹھ سالہ بچے کے باپ ہیں۔ بیوی مرچلی ہے۔ امی نے سنتے ہی رشتے والی کی ہوش بھاڑ دیا تھا مگر اجیہ آپا بضد ہیں کہ ادھر ہی کریں گی۔ کیونکہ پروفیسر صاحب نے ان کی مرضی

سے رشتہ بھیجنا ہے۔ اجیرا پی امی کے انکار پر بری طرح ان سے لڑ پڑیں کہ وہ اسی طرح اولاد کو گھر بٹھا بوڑھا کرنا چاہتی ہیں اسی لیے تو تنگ آکر خاور بھائی نے خود بیاہ رچالیا ہے۔ اگر وہ پروفیسر صاحب لیے نہیں مائیں تو وہ کورٹ میرج کر لیں گی۔ امی ان کی دھمکی سنتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں اور قبول کر لیا۔“

تمہیں اپنا بنا لیں

”اوہ۔۔۔“ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔“ وہ سوچنے لگی۔

”کیا خاور بھائی اور اجیرا پی کے ہاتھوں مات کھا کر انہیں اسد بھائی اور ان کے بیوی بچوں بسانے کا خیال آیا یا پچاس ساٹھ لاکھ کی مالیت کی کشش نے اسد بھائی سے ”محبت“ جگا دی ہے۔ ار دلوں کی تو وہی جاتے۔“

☆☆☆

وہ ایف ایون کی مارکیٹ میں ”انٹیریئر ڈیکور“ کی عظیم الشان بلڈنگ میں داخل ہوئی تو سامنے زے سے مڈ بھیڑ ہوئی۔

”تمہارے لیے ایک کام آیا ہے، ایک کینیڈین فیملی پاکستان میں سیٹل ہوئی ہے، انہیں اپنے گھر یوریشن پلس فرزنسنگ کرائی ہے۔ میڈم نے تمہیں اسائن کیا ہے یہ پروجیکٹ۔“

”اوہ۔“ ارسلہ نے دلچسپی سے سر ہلایا تھا۔

”کیا وہ کینیڈا کی شہریت رکھتے ہیں؟ کیونکہ پھر تو انہیں ڈیکوریشن اور فرنیچر وغیرہ کا اسٹائل بھی اساجا ہے ہوگا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”نہیں، ماں باپ پاکستانی ہیں۔ بچوں میں سے بھی بڑی بیٹی کی پیدائش یہیں کی ہے۔ باقی بچے کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ بڑی بیٹی ایک سال کی تھی جب وہ لوگ کینیڈا شفٹ ہوئے تھے۔ اب بس بعد وطن واپس آئے ہیں پچھلے ماہ۔ پہلے رشتہ داروں کے ہاں رہے، اب پچھلے ہفتے اپنا گھر خریدا

نیلی گھر میں شفٹ ہو چکی ہے۔ ضروری اشیاء کے ساتھ مگر گھر ظاہر ہے ابھی خالی ہے۔ پہلے انہوں

نا اور انٹیریئر ڈیکوریز کو ہائر کیا تھا۔ اس نے پروے لگوادیے تھے پھر کسی وجہ سے اسے یہ پراجیکٹ

ہائر اتوا انہوں نے ہماری بیٹی سے رجوع کیا۔“

”میڈم آصفہ اس پراجیکٹ کو خصوصی اہمیت دے رہی ہیں۔ رچ فیملی ہے۔ ظاہر ہے بینڈسم

ٹپے کرے گی۔ انہیں ہر چیز نہایت معیاری اور اعلا ویدہ زیب درکار ہے۔“

”پھر تو اور بھی اچھا ہے، ظاہر ہے ہم سب پیسے کے لیے ہی کام کر رہے ہیں۔ میری گاڑی پچھلے کئی

سے کافی تنگ کر رہی ہے۔ اگر اس پروجیکٹ سے ٹھیک ٹھاک کمیشن ملا تو میں اس کا نیا انجن بنواؤں

سات ہزار کا خرچہ ہے اس کے روز روز کے چوک پہ بند ہو جانے کا خطرہ تو نہیں رہے گا۔“ ارسلہ

”اؤنہوں، اؤنہوں۔۔۔“ احسن کھنکھارتے ہوئے چلے عروسی میں داخل ہوا تھا۔

”آداب۔۔۔“ اس کے شریر لہجے نے عروسی ہارسنکھار اور لباس سے دو آتشہ بنی مائرہ کو سمر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں تو ذکر تینے سے باہر آجائے گا۔

”برا ہو اس ماڈرن برائیدل میک اپ کا۔ دولہا صاحبان گھونکھٹ اٹھانے کی خواب ناک اور رومان پرور کارروائی کے لیے ترس گئے ہیں، جو نبی سہاگ کے کمرے میں قدم رکھو دلہن کا رخ روڑ

نیون سائن کی طرح چمکتا، وائین سامنے ”رکھا“ ہوتا ہے گویا۔“

وہ لطیف چھیڑ خانی کا آغاز کرتا ہوا بیڈ پر عین اس کے سامنے نیم دراز ہو گیا۔

مائرہ کی مانو جان ہی نکل گئی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔

”غلطیاں کرنے کی تو آپ شروع سے از حد شوقین رہی ہیں لیکن یہ ”غلطی“ بہت صحیح کی ہے۔“

وہ بھرپور نظروں سے اس شعلہ جوالہ روپ کو آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔

”کون سی غلطی؟“ وہ بری طرح بدحواس ہوئی۔

”شادی کے لیے ”ہاں“ کرنے والی غلطی!“

اس کی قربت کا نشہ اس کے بھرپور وجود کے انگ انگ سے چمکتا، اس کی استحقاقانہ نظریں، ہر چیز مائرہ کے اوسان خطا کے دے رہی تھی۔

”احسن صاحب پلیر۔۔۔“ وہ اس کی بے باک جسارتوں اور گستاخیوں پر گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیلتی گئی۔

”احسن صاحب! اب کچھ نہیں کر سکتے۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”کیونکہ اب بی بی ”بیوی“ میں تبدیل ہو چکی ہے لہذا احسن صاحب ہر گستاخی اور زیادتی کے

بالکل آزاد ہو چکے ہیں۔ تو پھر شروع کی جائے محبت کی کہانی کی ڈرامائی تشکیل۔۔۔“

وہ نچلا ہونٹ دباتے ہوئے شرارت سے ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

بچوں کے ہمراہ موجود ہوگی۔“

”کیا مطلب؟“ ارسلہ نے ہنسیوں اچکائیں۔ ”کیا مجھے مسٹر سفیان سے تفصیلات ملے اور ان کی مز؟“

”وہ پاکستان میں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد واپس کینیڈا چلے گئی ہیں۔“

”مگر کیوں؟“ ارسلہ کا جیس انداز نہایت فطری تھا۔

”کسی کام سے گئی ہیں۔“ شہروز نے مختصر بتایا۔

”کس قسم کا کام؟“ وہ الجھن رفع کرنے کے لیے پوچھ بیٹھی۔ شہروز نے اس سوال پر گہر

دیکھا تھا۔

”لاحول ولاقوة! ارے بھئی ہوگا کوئی کام، مجھے ان کے پرسنل افیئرز سے کیا لینا دینا۔ تم

کھال اتارنے بیٹھ جاتی ہو بعض اوقات۔“

”اچھا بھئی! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ چلی جاؤں گی کل۔۔۔ بھئی! یہ بتاؤ، کوئی ٹیبل ور

پھر میں آف کر لوں۔“ وہ براؤن لیڈر بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہو

رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، جاؤ تم۔ اگر کچھ کام ہوا بھی تو میں دیکھ لوں گا۔“ شہروز حسن میں یہی تو خوب

ہمیشہ اس کا بوجھ اور پریشانیاں سمیٹنے کے لیے تیار رہتا تھا۔

وہ آفس سے باہر آگئی۔ سامنے پارکنگ ایریے میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ مارکیٹ

میں نئی تھی اور نسبتاً ویران اور خاموش سی تھی۔

”افو۔۔۔ اب یہاں سے چکالہ اسکیم تھری تک کا طویل ترین راستہ، کباڑہ ہو جائے

کرتے کرتے۔۔۔“ اس نے گاڑی کا لاک کھولنے کے بعد لاشعوری طور پر اپنے کندھے دبا۔

جب وہ گھر پہنچی تو پاپا شاہین فاؤنڈیشن سے واپس آچکے تھے۔ اس کے پاپا میجر ضیاء رب

اور حکومت کی طرف سے ملے ہونے اس خوب صورت اور کشادہ اپارٹمنٹ میں اپنی دو بیٹیوں

رہتے تھے۔ ان کے اپارٹمنٹ کے عین اوپر والا اپارٹمنٹ ان کے بڑے بھائی کرنل سجاد کی ملک

اتفاق سے دونوں بھائی آرمی میں رہے تھے۔ اور آگے پیچھے ہی ریٹائر ہوئے تھے۔ کرنل سجاد کی

خاصی تھی اور ہر وقت ان کا اپارٹمنٹ ”بارون“ اور ”پرنسز“ رہتا تھا۔

دونوں بھائیوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ”شاہین فاؤنڈیشن“ جو آئن کر لیا تھا۔

”اسلام علیکم پاپا۔“

”وئیکم السلام۔۔۔“ میجر ضیاء نے بہت گرم جوشی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔

”بھئی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ٹیبل پر آ جاؤ۔ بھوک کے مارے آنتیں قل ہوا اللہ پڑھ رہی

”افو، ایک تو آپ بھوک کے بہت لچے ہیں۔ اور بھوک لگ رہی تھی تو ایک گھنٹے سے کھا

رکھ کے کیوں بیٹھے تھے۔ کھالیا ہوتا نا۔“

”اپنے بچوں کے بغیر میں کیسے کھا سکتا تھا۔ نہ تم آئیں نہ روشن کالج سے لوائی۔“ وہ ٹیبل پر آ۔

روشان آج لیٹ آئے گی۔ اس کی کلاس فیرویل پارٹی کی پریکٹس کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے،

بڑے کونٹکشن ہے۔ فورتحہ ایئر کے اعزاز میں پارٹی دی جانی ہے اور اپنی روشن فیرویل پارٹی

”تم اعلیٰ ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

”بلے گلے میں تو وہ یوں بھی ہمیشہ آگے رہتی ہے۔“ پاپا نے بھی تہمرہ کیا تھا۔

”وہ مزاج میں تم سے خاصی مختلف ہے۔ لاابالی اور کھلند رطیبت کی مالک ہے۔“

”ہر بندے کی اپنی فطرت، اپنا مزاج ہوتا ہے پاپا! اور یہ بھی سچ ہے کہ انسان اپنے رنگ میں ہی

ہے۔ نئی چیز، نیارویہ اور متوازن زندگی گزارنے کے اصول ضرور سیکھیں مگر اپنے فطری انداز میں

”لے۔“

”میں تنقید تو نہیں کر رہا تھا جو اتنی حمایت آئی ہے تمہاری طرف سے۔“ پاپا مسکرا کر اسے دیکھنے

وہ جلی سی ہوگئی۔

”مجھے بھی پتا ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو پاپا۔“ وہ اٹھ کر پیچھے سے ان کے کندھے تھام کر جھک گئی

”ہم بہت خوش نصیب ہیں جنہیں آپ جیسے پاپا ملے۔“

”ہاں! پاپا کی کچھ اور قسمیں بھی ہوتی ہیں؟“ میجر صاحب نے مصنوعی حیرانی سے اس کی طرف

نا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے، آپ سب سے اچھے پاپا ہیں۔“

”میں سمجھا جیسے ٹوائے شاپ ہوتی ہے ویسے ہی پاپا شاپ بھی ہوتی ہے جہاں سے۔۔۔“ وہ سر

لگے۔

”پاپا۔۔۔!“ ارسلہ نے ٹھنک کر انہیں گھورا تھا۔

”اوکے۔۔۔“ وہ ہنس کر اٹھ گئے تھے۔

”اب آپ کو چائے چاہیے ہوگی۔“ وہ چائے کا پانی رکھ چکی تھی۔

”آف کورس، تم جانتی ہو، میں کھانے کے بعد ہمیشہ چائے لیتا ہوں۔“ یہ ان کی برسوں پرانی

تکی اور دیکھا دیکھی ارسلہ اور روشن کو بھی یہی عادت پڑ گئی تھی۔

”میں اسٹڈی روم میں جا رہا ہوں۔“ وہ چائے کا کپ تھام کر مڑے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ میں لاؤنج میں بیٹھ کر کچھ آکس ورک کروں گی اور روشن کا انتظار کروں گی۔“

”اسد شاہجہ سے آگیا ہے؟“ جاتے جاتے پاپا نے مڑ کر دریافت کیا تھا۔ لہجہ سنجیدہ تھا۔

ارسلہ نے تمام تر توجہ چائے کی جانب مبذول کر لی۔

”غالبا آچکے ہیں۔ میرا دودن سے تائی اماں کی طرف جانا نہیں ہوا۔ روشن سے پوچھیے گا، وہ تو

تائی اور بھئی رہتی ہے۔“ ارسلہ کا لہجہ نارمل تھا۔

”میرا خیال ہے، میں بھائی جان سے شادی کے لیے بات کر لوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“ انہوں

نے تقبیہی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال تو یہ ہے کہ فی الحال آپ اس قصبے کو رہنے دیں۔ میں اپنی فیلڈ میں قدم جما بعد شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اور اسد بھائی کا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جب تک وہ لوگ نہیں کرتے آپ کو ذکر چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

باپ بیٹیوں کے درمیان ہر طرح کی بے تکلفی اور اظہار رائے کی آزادی تھی۔ یہی وجہ بہت اعتماد اور سکون کے ساتھ ان سے ہر طرح کے موضوع پر بات کر لیتی تھیں۔

”ایز یوش، لیکن بیٹے! ڈھائی سال کی منگنی بہت کافی نہیں ہوگئی؟ میری خواہش ہے کہ تم اپنا گھر بنا لو۔“ انہوں نے اپنی سوچ کا اظہار کیا۔

”پاپا! روشان کو بہت دیر نہیں ہوگئی؟ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ چار بجنے کو ہیں۔“ وہ کپ میز پر رکھنے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نظر گھڑی کی دوڑتی بھاگتی سوئیوں پر تھی۔

”جاؤ اپنی تائی جان کے ہاں جا کر معلوم کرو۔“ نیناں آگئی ہے یا نہیں۔“ نیناں اور پریشان کلاس میں پڑھتی تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے روشان تائی جان کے ہاں پانی جاتی تھی۔ دانت کاٹی دوٹی تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر تائی اماں کے پارٹمنٹ میں پہنچی تب ہی ڈور بیل بجاتے سیاہ ڈزربلبوس اسد پر نظر پڑی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔“ اس کو بہر حال آداب تو نبھانا تھا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔“ اسد جواب دے کر بے نیازی سے ڈور بیل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے بچن کی سائیڈ سے دروازہ کھل گیا۔

صبح بچن میں مصروف عمل تائی اماں دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر خاصی محظوظ ہوئیں۔

”تائی جان! وہ دو مغرور مٹیاریں ابھی تک کالج سے نہیں لوٹیں۔ کچھ خبر ہے ان کی۔۔۔“ نیناں کہہ رہی تھی، ریہرسل کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے سے فون کر کے بتایا ہے کہ آدھ پون گھنٹے تک آجائیں گی۔“

”سماں ہے، مجھے موبائل پہ نہیں بتا سکتی تھیں۔“ وہ جھنجھلائی۔ ”میں انہیں پک کر لیتی۔“

”میں پاپا کو بتا کر آئی ہوں۔ اچھا تائی جان! میں مارکیٹ جا رہی ہوں، ہفتہ وار سودا سلا کچھ گرومیری وغیرہ تو نہیں منگوانی؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”نہیں بیٹے! البتہ اگر کوئی الیکٹریشن مل گیا تو لے آنا۔ گیسٹ روم کے ہاتھ روم اور اس اسٹور کی دائرنگ خراب ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ رومی کے کمرے کا چھوٹا فرق بھی کام نہیں کر سکتا۔“

”لا حول ولا قوۃ۔۔۔“ کتنی موچھوں تلے اس کے ہونٹ بری طرح شکوے۔ پیشانی گئے تھے۔

”کیا گھر میں کوئی مرد نہیں ہے ان کاموں کے لیے؟ اب یہ مردوں کے بیچ گھس کر؟“

کریں گی۔“

وہ برہمی سے ماں کو گھور رہا تھا۔ اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

”ارے بیٹا اور کون ہے اور کس کو پر دہا ہے۔ رومی سدا کا کٹنا اور کام چور لڑکا ہے۔ کالج کا اسٹوڈنٹ ہے۔ بیس برس کا ہے، مگر عقل نام کو نہیں ہے۔ احساس ذمہ داری چھو کر نہیں گزرا۔ اسے اپنے دوستوں اور بیوی کے جنون سے ہی فرصت نہیں ہے۔ رہے تمہارے ڈیڈی تو وہ آس سے آئیں گے انٹرنیٹ پر بیٹھ جائیں گے یا دوستوں میں نکل جائیں گے۔ لے دے کے یہی بچی رہ جاتی ہے۔“

”توبیہت میں کس مرض کی دوا ہے۔“ اسد کئی سے گویا ہوا۔

”بھئی تو روز گھنٹے دو گھنٹے کو آتا ہے۔ صفائی کر کے اور ایک دو مزید کام کر کے یہ جاوہ جا، اور ارسلہ بیٹی سمجھ دار ہے۔ ہمیشہ سے وہی تو کر رہی آئی ہے۔“ تائی اماں مگن سے انداز میں ہانڈی میں چھچھہ ہلا رہی تھیں۔

”بیٹے! یہ شامی کباب مائیکرو ویو اون میں رکھ دینا اسد کو چائے کے ساتھ دینے ہیں۔“

”جی اچھا۔۔۔“ اس نے پلیٹ لے کے اوون میں رکھ دی جو پہلے سے آن تھا۔ اسد ہونٹ چباتا ہوا خاموشی سے اندر چلا گیا تھا۔

”میں چلتی ہوں تائی اماں۔“

”ارے بیٹا بیٹھو تو، چائے بن رہی ہے۔ پی کے چلی جانا۔“ تائی جان اس سے خصوصی شفقت کا اظہار کرتی تھیں۔

”میں پانچ منٹ پہلے پی کے آرہی ہوں، پاپا کے ساتھ۔ ابھی تو بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔“ اس نے سلیقے سے معذرت کی اور باہر نکل گئی۔

”چائے لے لو اسد۔۔۔“ تائی اماں پلیٹ میں گرم شامی کباب اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے متوجہ کر رہی تھیں۔

”تم ارسلہ کے ساتھ اتنے اکھڑے ہوئے کیوں رہتے ہو۔۔۔؟“

”مجھے اس کی مردانہ قسم کی عادتیں، سخت ناپسند ہیں۔“

اسد نے اپنے احساسات چھپانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔

”عورت، نزاکت اور آہستہ روی کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ایکٹو، جرأت مند اور ہر آلے سیدھے میدان میں ٹانگ اڑانے والی لڑکیاں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ اوپر سے اس کی جاب نے اسے مزید بے باک اور بے دھڑک بنا دیا ہے۔ جدھر جی چاہتا جاگھتی ہے۔ یہ بے خونی، خود اعتمادی اور خود سری عورت کی شرمیلی و شائستہ فطرت کے خلاف ہے۔“

”لا حول ولا قوۃ۔۔۔“ تائی جان نے برا سامنے بنا کر بیٹے کے ارشادات پر رد عمل ظاہر کیا۔

”وہ اپنا بوجھ خود اٹھاتی ہے۔ کسی پہ انحصار نہیں کرتی۔ اس میں اتنا اعتماد ہے کہ وہ جو کام اپنے ذمے لگتا ہے اسے احسن طریقے سے انجام دے سکتی ہے۔ وہ اپنے عمل سے ثابت کرتی ہے کہ اس پر جو اعتماد کیا جاتا ہے وہ اس کی حق دار ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ یوں بھی ان کے گھر میں کوئی بھائی

نہیں ہے۔ دونوں بہنیں ہی تو ہیں۔ اگر ایسے میں اس نے باہر کے کام اپنے ذمے لے لیے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔“

”آپ کے لیے نہیں ہوگی۔ میرے لیے ہے۔“ اسد کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ”میں اپنی بیوی کو اپنے مقابلے پہ کھڑا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ لڑکی ہے اور لڑکی بن کر ہے، آخر روشان بھی تو ہے نا۔“

”روشان کا اپنا مزاج ہے۔ اسلہ کا اپنا۔ دونوں میں کیا موازنہ کرنا۔“

”اسلہ کو انکل نے غیر ضروری آزادی دے رکھی ہے۔“ اسد کے دل میں اس کے لیے کوڑی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔

”لیکن اس نے اس آزادی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ خود کو اس کا اہل ثابت کیا ہے۔“

”مگنی آپ نے اور ڈیڈی نے اپنی پسند سے کی ہے نا تو پسند کرتی رہیے جی بھر کر۔ مگر مجھے اس کا کے لیے مجبور نہ کریں۔“

وہ خشک انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کا رخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔

تائی جان تشویش ناک نظروں سے اپنے بگڑے ہوئے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

اسد کا اپنا ایک مزاج اور نقطہ نظر تھا۔ جب کہ اسلہ شروع سے ہی بہت مختلف شخصیت کی حامل رہی تھی، اپنی عمر کے بچوں جیسی اس میں کبھی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ ذہین، حساس، ذمہ دار اور بلا کم و کسری میجر صاحب نے اس کی صلاحیتوں کو جانچنے کے بعد اسے مقدور بھرا اعتماد اور تعاون فراہم کیا تھا جس نے اس کی شخصیت میں مزید نکھار اور پختگی پیدا کی تھی۔

اسد کا اسٹائل، سوچ اور نظریات اسلہ سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ اسے بطور مگنیتر صرف برداشت کر رہا تھا۔ کوئی خاص محسوسات بے دار کرنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ آئندہ زندگی گزارنے کا سوچ کر وہ کوفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگتا تھا۔

☆☆☆

”کتاب صدر اور میرے لذیذ ساتھیو۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔ میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ مجھے اس محفل میں بلایا۔ اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ ویسے اظہار قاضی بھی اچھا آرٹسٹ۔ اگر اسے موقع دیا جائے۔۔۔“

نیناں نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کالج کے ہال میں اپنی باری آنے پر روشان کے ساتھ مل کر تیار کردہ آئٹم شروع کیا۔

یہ ایک مزاحیہ تقریر تھی۔

”ارے بھئی یہ کیا بکواس ہے۔۔۔“ اس کی کلاس فیلو ہانے برا سامنہ بنایا تھا۔ مزید ایک دو۔۔۔ بھی نکتہ چینی کی۔

”آگے تو سن لو پہلے۔۔۔“ روشان نے جھنجھلا کر کہا۔

”دوستو! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ فورتحہ ایڑوہ کلاس ہے جو کبھی کبھی ”واقعی“ کلاس میں پایا جاتی ہے۔ وگرنہ عام طور پر آپ انہیں کیفے ٹیر یا اور گراؤڈ میں بغیر مائیکرو اسکوپ کے دیکھ سکتے ہیں۔

ایس لیناں کی عادت ہے بقول شاعر۔

اے فورتحہ ایر، ساڈی فورتحہ ایڑ

ساری ٹیچرز کرن ایڈھی سیوا

کلاس دج نہ آن والیے

تے نخرے دکھان والیے

نیناں نے عطا اللہ عیسیٰ جیلوی کے گانے کا حشر کیا تھا۔

”فورتحہ ایڑ کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ کبھی کبھی کلاس لے کر ثواب کمانے میں کوئی حرج نہیں۔

لتا را ایڈھی بہت ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ بچوں کو عیدی بالکل نہیں دینی چاہیے۔ اس سے وہ جاتے ہیں۔ طبیعت بگڑ جائے تو شاعر کے اس مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔

جو دکھتا ہو گلا نزلے کے مارے

تو کر نمکین پانی کے غرارے

”چیٹنگ۔۔۔ چیٹنگ۔۔۔ یہ تو ڈاکٹر یونس بٹ کا اسٹائل ہے۔۔۔“ ثوبیہ کے گروپ نے شور مچا

”ارے بھئی اسٹائل ہی لیا ہے، کوئی چوری تو نہیں کی۔ کاپی کرنے میں کیا حرج ہے۔ آج کل تو

نوں تک کی کاپی بننے لگی ہے۔“ نیناں نے روشان کے ساتھ شور مچا کر پھر چپ کر دیا تھا۔

”غرا روں سے یاد آیا، آج کل غرا روں کا بڑا فیشن ہے۔ فیشن تو پھر فیشن ہے نا جی۔ مثال کے طور

ماری فورتحہ ایڑ کا چھٹی ناٹم فل میک اپ کے ساتھ بہانے بہانے سے گیٹ کے چکر لگانا اور ہمارے

دی ہیروز“ کا قطار اندر قطار مودب و مستعد ہو کر کھڑے ہونا۔“ نیناں سنجیدگی سے پڑھ رہی تھی۔ اب

دہلی دہلی ہنسی بکھر گئی۔

”بہت ماریں گی فورتحہ ایڑ کی“ بابجیاں۔۔۔ ہانے ہنسی روکتے ہوئے کہا تھا۔

”اب کچھ بات پارٹی کے بارے میں ہو جائے۔ پارٹی کرنا اور پارٹی بنانا اچھی بات ہے۔ پارٹی

مطرح طرح کے آئٹم ہوتے ہیں لیکن وہ چاہے کسی قسم کی بھی ہو اس کا مقبول ترین آئٹم ”ریفریشنٹ“

ہوتا ہے۔ اور دوستو! فریش رہنا کے اچھا نہیں لگتا۔ ہماری حکومت تو ہمیشہ ہی ”فریش“ رہتی ہے۔ ہر

لٹے نئے چہرے وزیر اعظم کی کرسی پہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اور یہ صورت حال بے چارے پاکستان

ٹری کے اسٹوڈنٹس کے لیے بہت دردناک ہے۔“

”زبردست، اب مزہ آیا نا۔ یہ آئیڈیا کس کا تھا۔۔۔ مزاحیہ تقریر کا۔۔۔“

”ہم دونوں کا۔۔۔“ روشان نے فخریہ سراٹھایا تھا۔

”ابھی آگے بھی تو سنو، دل تھام کے۔۔۔“ نیناں جوش میں آگئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا پیپر دوسری

رف سے الٹ کر وہ دوبارہ سلسلہ جوڑا۔

”حاضرین! آپ جانتے ہیں سب سے لمبی جڑ خربوزے کی ہوتی ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ

ٹک پکڑتا ہے اور فورتحہ ایڑ کو دیکھ کر سارا کالج عبرت پکڑتا ہے۔ اللہ اللہ، یہ فیشن کی بہاریں، یہ میک اپ

کے لشکارے، یہ ادا، یہ تازہ انداز آپ کے۔ کالج سے فرار کا بہانہ بن گئے۔۔۔“ وہ گنگنائے لگی تھی۔
 ”خیر دوستو! کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ ہماری مشہور فلمی آرٹسٹ قید جی، کیا خوب ڈانس کر
 ہیں۔ ایمان سے میرا تو ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ہماری کینٹین کی تازہ بہ تازہ بنی ہوئی اور بار بار گرم کی
 گرما گرم چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔ پیچھے اور وعا دیجئے۔“ نیناں نے اپنا آسٹم پیش کرنے کے بعد
 الوداعی کلمات کے بعد اجازت لی۔ سب نے تالیاں بجا لیں۔

”اب سمجھ میں آیا میں نے فیرویل پارٹی میں یہ آسٹم کیوں شامل کیا ہے۔“ روشن راج ہنر
 طرح گردن اٹرائے ہوئے تھی۔

”اب اگلا آسٹم میرا ہے۔ یہ ایک گروپ پر فارمنس ہے۔ نیناں تم بھی اپنی جگہ سنبھالو۔۔۔“
 آسٹم میں نیناں بھی شامل تھی۔

”پہلے ہمارے گروپ کا ڈانس آسٹم پر فارم کرنے دو ہمیں ذرا جلدی ہے۔“ ہما صدیقی نے کہا
 انہیں حدیقہ کیانی کے ”دو پتہ میرا مل کا“ پر فارم کرنا تھا۔ اس کے بعد ایک مزاحیہ خاکہ کیٹر
 گیا۔ چونکہ لڑکیاں آپس میں مل کر ریمارکس کر رہی تھیں اس لیے غیر سنجیدگی، لا ابالی پن، ہنسی مذاق
 خواہ مخواہ کے شور شرابے کی وجہ سے ابھی تک کوئی تسلی بخش ریمارکس نہیں ہو سکی تھی۔

مشاعرے کے آسٹم کے لیے ممبر لڑکیاں ہی پوری نہیں ہو رہی تھیں۔
 ”یہ کس قسم کا مشاعرہ ہے۔ ہمیں ڈیڈ آسٹم ہی نہ ثابت ہو۔“ ہمانے خدشہ ظاہر کیا تھا۔
 ”ایک تو تم ہر کام میں پہلے سے شور مچانا شروع کر دیتی ہو۔“ روشن نے اس کی طبیعت صاف
 تھی۔

”ارے بھئی، مزاحیہ مشاعرہ ہے اور خاص طور پر فاضل ایئر والوں کے اعزاز میں لکھا گیا ہے
 پہلے ہمارے گروپ کی پر فارمنس دیکھو۔ پھر تنقید کی پیچی اٹھانا۔“
 روشن منتخب کی گئی لڑکیوں کو اسٹیج پر ایک مخصوص نیم دائرے میں بٹھا کر مایک پکڑ کر شروع ہو گئی تھی
 ”حاضرین آگے ہیں شیخ صاحب۔۔۔ اب یہ ٹوپی سنوارنا بند کریں۔“ اس نے اپنی ایک سا
 لٹاڑا تھا۔

”اد اچھا جی اچھا۔۔۔ کیرہ سیرہ آن ہے نا۔۔۔ ہاں تو بہت ہی معزز سامعین معافی
 ہوں۔“

”پہلے میں اپنا کلام سناؤں۔۔۔“ روشن نے خیالی پگڑی سنبھال کر کھٹک کر عرض کیا۔

ہسٹری نے کے ہم پہ کیا گزری
 تیر بڑی دکھ بھری کہانی ہے
 کچھ نہ پوچھو اے فاضل والو
 کس مصیبت میں زندگانی ہے
 ابھی پاکستان بنانا ہے
 اور مغلوں کی خبر لانی ہے

”واہ۔۔۔ بہت خوب۔۔۔“ تنقید کرنے والے خاصے محفوظ ہوئے تھے۔

اب اجتماع کھی گھی شروع ہو گئی تھی۔
 ”اب میں دعوت دیتا ہوں محترم ”قلیل شفائی“ صاحب کو کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔“
 روشن کے دعوت دینے پر اس کے ساتھ بیٹھی کرن نے مایک تھام لیا۔
 ”عرض کیا ہے۔۔۔“

اے ہسٹری کے کورس، اب تو ختم ہو

پڑھ پڑھ کے ہم پاگل ہونے والے ہیں

”واہ، واہ۔۔۔ کیا پیش گوئی فرمائی ہے۔“ روشن لہک کر کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے اس سے اگلے
 ساتھی ”احمد ناراض“ کو دعوت دی۔

کاموں کی اس قدر بھرمار دیکھ کر

جی چاہتا ہے فاضل ہی چھوڑ جائیں ہم

”اب آتے ہیں مسٹر یوگن دیلیا۔۔۔ سوری مون ایلیا صاحب۔۔۔“ مون ایلیا صاحب اپنے
 مجہول حلیے میں مایک کو اپنے آگے کھینچے ہیں۔

کالج میں پڑھ رہے ہو تو کیوں چپ ہو اس قدر

اک آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے چلو

”ایک شعر عرض ہے۔“ خان پکڑ آبادی نے اپنی باری پر گلا صاف کیا۔

نوٹس بھی اچھے بنائی ہے میری فاضل مگر

منہ بنانے میں تو اس کا کوئی ثانی ہی نہیں

”اوائے ہوئے۔ کیا تیر جگہ میں پار ہوگا۔ فورتحہ ایئر تو کھولتے کڑا ہے پر جا بیٹھے گی۔“ ہمانے مزہ لیا
 تھا۔

”معزز سامعین آپ کو یقیناً ہمارا مشاعرہ پسند آیا ہوگا۔ آخر میں سارے اسٹوڈنٹس کے حق میں
 دعا۔۔۔ ہاتھ اٹھالیں سب کے سب۔۔۔“

مجھے قیدِ مکتب سے یارب چھڑا دے

پڑھانا ہے جو کچھ وہ گھر پہ پڑھا دے

قادر ہے ہر شے پہ مختار ہے تو

ذرا میرے پرچوں کے نمبر بڑھا دے

”مزا آگیا۔۔۔“

”کیوں تم تو کہہ رہی تھیں ڈیڈ آسٹم ہے۔“ روشن نے بھنویں اچکائی تھیں۔

”اچھا بھئی، ساڑھے چار ہو رہے ہیں۔ اب چلتے ہیں۔ آخری ٹرپ دس منٹ بعد روانہ ہونے
 والا ہے۔“ لغہ نے گھڑی دیکھی تو سب کو وقت گزرنے کا دھیان آگیا۔

”ارے بھاگو، ٹرپ نہ نکل جائے۔“ نیناں نے روشن کو دیکھ کر شور مچایا۔

”میں ٹرپ سے نہیں جاؤں گی۔“ وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں پرائیویٹ بس سے جائیں گے۔“ روشن اس کی طرف دیکھے بغیر گویا تھی۔

”کیا۔۔۔؟“ نیناں کو جیسے بچھونے کاٹ لیا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ روشن اس کا بازو پکڑ کر مرکزی گیٹ کی طرف آگئی۔

”ارمغان کھڑا ہوگا۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ بس دس منٹ لگیں گے، پھر ہم پرائیویٹ بس سے گھر پہنچ جائیں گے۔ اسی نام پر جس یہ کالج بس ہمیں پہنچانی ہے۔“

”ارمغان۔۔۔؟؟؟“ نیناں کی آنکھیں خیر سے پھیل گئیں۔

”ہاں۔۔۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

”تم جانتی ہو اس کا انجام؟“ نیناں بہت سنجیدگی سے اس کا چہرہ پڑھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔ کیا انجام ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ باپا خانا ہوں گے، ارسلہ ناراض ہوگی۔ لیکن پھر وہ مان بھی جائیں گے۔ آئی ایم شیور۔۔۔ ارمغان کوئی غیر تو نہیں ہے۔ میرا سگا ماموں زاد ہے۔ پاپا، ماموں کی فیملی سے رشتہ نہیں رکھنا چاہتے مگر میں تو ایسا چاہتی ہوں نا۔۔۔“ وہ اپنی حرکت کے جواز تلاش کر رہی تھی۔

”چچا جان نے برسوں سے تمہارے ماموں کی فیملی کا گھر میں آنا بند کر رکھا ہے۔ وہ ان کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اور تم ان سے رشتہ جوڑنے جا رہی ہو۔“ نیناں حیران تھی۔

”تم اپنی ننھی سی عقل کو زحمت نہ دو۔ بس منہ بند رکھنا، گھر جا کے نہ بک دینا۔“ وہ گیٹ کے باہر قدم رکھ چکی تھی۔

”وہ رہا ارمغان۔۔۔!“ روشن تیزی سے سیاہ پینٹ اور پنک شرٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ سے لڑکے کی جانب بڑھ چکی تھی۔

نیناں ٹھنڈی سانس لے کر گیٹ سے کچھ فاصلے پر لگے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

دس بارہ منٹ بعد روشن سرشاری قدم اٹھاتی واپس آچکی تھی۔

”یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو روشن؟“ نیناں کو فکر ہو رہی تھی۔

”ارے مجھے کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ ایک ہی خاندان ہے ہمارا۔ گھر پر نہیں مل سکتے، اس لیے وہ مجھ سے بات کرنے کی خاطر یہاں آ جاتا ہے کبھی کبھار۔ وہ بتا رہا تھا ممانی، پاپا سے ہمارے رشتے کی بات کرنے کا پروگرام بن رہی ہیں۔“

”چچا جان کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ یہ تم جانتی ہو۔۔۔“

”میں منوانا جانتی ہوں۔ اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔۔۔“

روشان کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

نیناں نے چپ سادھ لی تھی۔

☆☆☆

وہ گلی نمبر ۶ کے ”شاہ ہاؤس“ کی نیل بجاتے ہوئے اسٹائش سے گیٹ کے اندر جھانک کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔

”جی کون۔۔۔؟“ اوپر میز کی گولڈن گرل سے ایک چودہ سالہ لڑکی نے جھانکا تھا۔ اس نے جینز اور بلیو اپر پہن رکھا تھا۔

”میں ”انٹیریئر ڈیکور“ سے آئی ہوں۔ ڈیزائنر ہوں۔ آپ کا گھر ڈیکورٹ کرنے کے لیے اسائن کی گئی ہوں۔ مسٹر سفیان شاہ گھر پر ہیں؟“

”جی آپ آجایئے اندر۔۔۔ پاپا بس بیچنے ہی والے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد گیٹ کھل گیا۔ چونکدار نے ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

بہت پر شکوہ طرز تعمیر تھا۔ ڈرائنگ روم کا فرش چاکلیٹ براؤن اور وائنٹ کمر کے پرنڈ خوب صورت چوکور ٹائلوں پر مشتمل تھا۔ عارضی طور پر ایک سادہ سا صوفہ سیٹ رکھا گیا تھا۔

اس نے اوپر نیچے کے کمروں کا جائزہ لیا۔

”کیا سارا گھر ڈیکوریت کرانا ہے؟ میرا مطلب ہے اوپر کا پورشن بھی؟“ اس نے نیچے آ کر چودہ سالہ تانیہ سے پوچھا تھا اس سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی عانیہ تھی۔ چھوٹا بھائی آٹھ سال کا تھا، فریدوں۔

بچوں کی شائستگی، تہذیب اور نیرداری قابل رشک تھی۔ کینیڈا میں ملنے بڑھنے کے باوجود ان کے ہر انداز میں شرقی سبھاؤ اور مقامی رنگ ڈھنگ نمایاں نظر آتا تھا۔

”مس! آپ کافی لیس گی یا کولڈ ڈرنک۔۔۔؟“

”تھینکس۔۔۔ بس آپ اپنے پاپا کو بلوادیں۔“

”مس! عانیہ نے فون کر دیا ہے۔ ان کا آفس یہاں سے بمشکل دس منٹ کی ڈرائیو پہ ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔“

تانیہ نے جواب دیا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔ بیٹے! کیا حال ہے آپ کا۔۔۔؟“ ایک معمر خاتون اندر داخل ہوئیں۔

”یہ اماں ہیں۔ پاپا کے گاؤں کی رہنے والی ہیں۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے پاپا انہیں ساتھ لے آئے ہیں۔“ تانیہ نے تعارف کر دیا تھا۔

وہ بچوں سے باتوں میں مصروف تھی کہ سفیان شاہ آگئے۔

”السلام علیکم! آئی ایم سوری مس! آپ کا انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔“ لائٹ براؤن تھری پیس سوٹ میں قدرے بھاری مگر لانا اور بھرپور سراپا لیے وہ بردباری اور شائستگی کا واضح تاثر دے رہے تھے۔

”کس قسم کی لگ چاہتے ہیں آپ اپنے گھر میں؟ میرا مطلب ہے ویسٹرن یا ایسٹرن اسٹائل یا دونوں کا کسچر۔۔۔؟“ ارسلہ نے پروفیشنل انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”جو آپ کو اس گھر کے لیے سب سے بہتر لگے۔“

رو۔ آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔“ اس نے ہر بار کی طرح ارسلہ کو تکیہ کی تھی۔
 ”افوہ! یہ جیسی پٹی نصیحت نہ کیا کرو بار بار، مجھے بھی پتا ہے، اس وقت تو چائے منگواؤ اچھی سی۔“
 اس نے پرسکون ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

☆☆☆

”کیسی رہی تمہاری ریہرسل، کل تو فکشن ہے نا۔۔۔؟“ روشان جمعرات کو دیر سے گھر لوٹی تو
 سلا اس کی منتظر تھی۔

”بہت زبردست، کیا تم کل آدگی میرے کالج، ہماری پرفارمنس دیکھنے؟“ وہ بیگ اور فائل لاؤنچ
 بے صوفی پر رکھ کر کوشش لے کے وہیں کارپٹ پر دراز ہو گئی تھی۔

”نہیں یار، مجھے سفیان صاحب کے فرنیچر کے لیے آرڈر دینا ہے۔ کل کا دن بہت مصروف
 زمرے گا۔“ ارسلہ نے معذرت چاہی۔

”افوہ، تم آتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا، ہم نے کتنے اچھے آئٹم تیار کیے ہیں۔ ابھی نیناں کے ساتھ مل
 رہیہرسل کروں گی۔ تم دیکھنا تو سہی۔ وہ تھوڑی دیر بعد اھر آئے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی تو میں بیہوش ہوں۔ یہ پاپا ابھی تک نہیں آئے۔“ ارسلہ نے وال کلاک کی
 رف دیکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

”کہاں گئے ہیں؟“ روشان نے بے فکری سے پوچھا۔
 ”واک! پھلے تھے، تاپا کے ساتھ۔“

”کہیں دونوں ”ریٹائرڈ آرمی آفیسرز“ آپ کی اور اسد بھائی کی ڈیٹ فکس کرنے تو نہیں بیٹھ
 گئے۔“ روشان نے شرارت سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔

”اس موضوع پر میری پہلے ہی پاپا سے بات ہو چکی ہے۔ تم چائے پیو گی؟“ وہ کچن کی طرف
 بڑے ہوئے گویا ہوئی۔

”نہیں البتہ اگر اورنج جوس مل جائے تو نہایت شکر گزار ہوں گی۔“ روشان کپڑے تبدیل کرنے
 کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نیناں آئی تو دونوں مل کر ”کالج کا خبرنامہ“ تیار کرنے لگیں۔

”ہمارے نامعقول ذرائع کے مطابق کالج کی لائبریری کی سربراہ اور انتظامیہ نے کتابوں کی عدم
 دستیابی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے آئندہ سے ہر قسم کی نصابی کتب کے خاتمے کا فیصلہ کیا ہے ان کے اس
 حسن اقدام کو تمام اسٹوڈنٹس نے خوب سراہا ہے۔“

ایک اور خبر کے مطابق آج کالج لکٹیننٹس میں جنگ عظیم سوم کی سی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ طالبات
 کے جنگجو گرد ہوں نے کرسیوں کے ذریعے زمینی حملے کیے جب کہ کتابوں، پلیٹوں اور چمچوں کے ذریعے

ہوائی حملے کر کے ایک دوسرے کو بھاری نقصان پہنچایا۔ اقوام درندہ نے اس جنگ کو بہت پسند کیا ہے۔
 امید ہے آئندہ چند روز میں پانی پیت پارٹ ٹو کی ریہرسل بھی اسی جوش و خروش سے منعقد کی جائے گی۔“

نیناں خبریں پڑھ کر سنار ہی تھی اور ارسلہ بیسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

جوائس میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ پہلے میں نیچے کا پورشن فرنش اور ڈیکوریٹ کرواؤں گا، پھر کچھ
 گیپ کے بعد اوپر والا پورشن۔ میں نے اپنا پرنس کینیڈا سے حال ہی میں پاکستان شفٹ کیا ہے اس لیے
 فی الحال اگلے چھ ماہ تک میں اپرا سٹوری کی شاہانہ قسم کی سیٹنگ انورڈ نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے اپنی فیس بھی
 بتا دیجیے گا۔“

”فیس تو ادارہ ہی طے کرے گا۔ ہمیں تو صرف کمیشن ملتا ہے۔ آپ فرنیچر ورڈیکوریٹیشن کی چیزوں
 کے لیے اپنی رینج بتائیے۔ کتنا بجٹ بنا رکھا ہے آپ نے؟“

”میرے ناقص اندازے کے مطابق دو لاکھ فرنیچر کے لیے اور ایک لاکھ ڈیکوریٹیشن کے لیے کافی
 رہے گا۔ کیوں کیا خیال ہے؟“ اس سے رائے طلب کر رہے تھے۔ ارسلہ اس وقت سرخ اور سبز کھلتے

ہوئے رنگوں کے شلو اور سوٹ اور سرخ دوپٹے میں ملبوس تھی۔ گہری سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور
 چہرے پر سنجیدہ دوبے نیاز مگر نہایت چونکا دینے والا بھرپور تاثر ہر وقت نمایاں رہتا تھا۔

اس کی بے نیازی ہی اس کی شان تھی۔
 ”جی۔۔۔“ وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی جو لغو اس کا جائزہ لے رہے

تھے۔
 ”ٹھیک ہے آپ نے رینج بتا دی ہے میں اسی کے مطابق سیٹنگ کروادوں گی۔ لیکن کارپنٹنگ کے
 لیے آپ کو علیحدہ سے بجٹ نکالنا ہوگا۔“

”اس کی فکر نہ کریں، وہ میں ایک دو دن میں ہی کروالوں گا۔ اور فرخنگ کے لیے اگر آپ کو مین
 پاور کی ضرورت ہو تو میرے پاس بہت سے ورکر ہیں۔ بوقت ضرورت آپ مجھے آفس کال کر کے انہیں
 بلا سکتی ہیں۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔“
 ”اب میں چلتی ہوں، کل آؤں گی۔ پردوں کے لیے کھڑکیوں کا ناپ لینے کے لیے ایک ورکر
 ساتھ لاؤں گی۔ اس کے علاوہ فرنیچر کے لیے ٹیپلاگ بھی لیتی آؤں گی آپ ایک نظر دیکھ کر پسند کر لیجیے
 گا۔ تاکہ اس کا آرڈر دیا جاسکے۔“

”او کے مس! بس ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ جو کچھ کرنا ہے، آپ لوگوں نے ہی کرنا ہے، میں
 اپنی فیملی کے ساتھ حال ہی میں کینیڈا سے آیا ہوں اور مجھے کسی مارکیٹ یا شاپ کا علم نہیں ہے۔“

وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
 ”آپ بے فکر رہیں، ہماری کمپنی ان تمام معاملات کو دیکھ لے گی۔ وہاں میل ورکرز بھی ہیں جن کا
 ایسے ہی کاموں سے واسطہ رہتا ہے۔“

”ہاں بھئی، کیا رسپانس ہے؟“ وہ آفس آکر میڈم آصفہ کو رپورٹ دینے کے بعد باہر نکلی تو شہروز
 نے استفہار کیا تھا۔

اس نے مختصر اپنا تجربہ بتایا۔
 ”جب بھی کام کے لیے نکلو تو پہلے وہاں رہنے والوں کی تمیز و تہذیب اور شرافت کا یقین کر لیا

”جلدی چلاؤ! ارمنان! ہو سکتا ہے موسم کی خرابی کے باعث پایا اسلج مجھے اور نیناں کو پک کرنے میں۔ نیناں اکیلے بے چاری اس صورت حال سے کیسے نبٹ سکے گی۔ ہمیں ہر حال میں پایا کے آنے پہلے کالج گیت پر پہنچنا ہے۔“

”جو حکم جناب عالی!“ وہ مسکرا دیا۔ ”ورنہ دل تو یہی کہہ رہا ہے کہ اس آنکھ بھولی کھیلے بادلوں کے ہم بھی اسی طرح اڑتے پھریں۔ بادلوں میں تیرتے رہیں۔“

”ہانی گاؤ، ڈیڑھ بج رہا ہے۔ نیناں بے چینی سے میری منتظر ہوگی۔“ روشان کو رہ کر ہول اٹھ

تھے۔ وہ بایک سے اتر رہی تھی جب اس کی نظر کالج گیت سے قدرے ہٹ کر پارک کی سمت گئی، ٹیوٹا لاکے دروازے سے ٹیک لگائے براہ راست اس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا پر پڑی۔ وہ ہلکے نیلے بی سوٹ میں ملبوس دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پھرائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے

وہ کالج کے بجائے کہیں باہر سے آرہی تھی۔ ایک لڑکے کی بایک پر۔

اوردو لڑکا ارمنان تھا۔ اس کے ماموں کا بیٹا، جنہیں پایا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس سے زیادہ انتہا کیا ہو سکتی تھی، روشان سفید چہرہ لیے بایک سے اتری۔ ارمنان اسے اتار کر موڑ چکا تھا، اس دشت ناک صورت حال سے اسے اکیلے ہی بننا تھا۔

☆☆☆

”پاپا پلیز! کھانا کھالیں آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔“

ارسلہ ہنسکی سے ان کے اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھی۔

انہوں نے سرخ بے خواب آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بیٹیوں کو اسی لیے لاڈ پیار، مان اور آزادی دی جاتی ہے کہ وہ باپ کی عزت کو چوراہے پر لٹا لیں۔۔۔؟ ساری دنیا کہتی تھی بیٹیوں کو زیادہ لاڈ، محبت نہیں دیا کرتے۔ ان کی تربیت سخت ہونی ہے تاکہ وہ آئندہ نسلوں کی حفاظت کی امین بن سکیں، لیکن میں ان کی باتیں مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا میرے لیے بیٹا، بیٹی برابر ہیں۔ دونوں کو ایک جیسا مان، پیار اور اعتماد ملنا چاہیے۔ کیا میں نے تم

پر پھر دوسرا کر کے غلط کیا تھا۔۔۔؟“ وہ ہنسی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے تھے۔

”پلیز پاپا! آپ ایسا نہ سوچیں۔ وہ کہہ رہی ہے میں ارمنان کے ساتھ ایسی ویسی جگہ پہ ہرگز نہیں

ماتھی، بلکہ ماموں ممانی کے گھر گئی تھی۔ ممانی نے اسے بلوایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھوٹے پھرنے کے اسے قطعی نہیں گئی تھی۔ اور نہ کبھی وہ ایسا کرنے کا سوچ سکتی ہے۔“

ارسلہ نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”میں اس وقت اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔“ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ

ماسے اتنی رکھائی سے مخاطب ہوئے تھے۔

”اب آپ سنیے موسم کا حال، کالج ہوٹل سے موصول شدہ اطلاعات کے مطابق ہوٹل میں کی لائن بند ہو جانے کے باعث پورا ہاسٹل خشک سالی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے کالج انتظامیہ نے یکم ستمبر سے تعاون کی اپیل کی ہے کہ وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملا کر بنانے کی کوشش تیز کر دیں۔ اس کے علاوہ پرنسپل اور ایکز امینشن کمیٹی کے کمرے کا موسم سخت گرم رہا۔ اس وقت خبر نامہ میٹریڈیڈ عتاب کا شکار نظر آرہی ہے، اس سے پہلے کہ مجھے سمیت اس کمیٹی کے پھینکا جائے ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔“

”بہت خوب۔۔۔“ پاپا بھی اس دوران آچکے تھے اور ان دونوں کے تیار کردہ مزاحیہ خبر نامے محفوظ ہو رہے تھے۔

”پاپا! پہلے ان سے پوچھیں کہاں سے نقل کیے ہیں یہ سارے آئیڈیاز۔۔۔“ ارسلہ نے بڑے چھیڑا۔

”جی نہیں۔۔۔ ہم نے محض انسپائریشن لی ہے۔ محنت ہماری اپنی ہے۔ بنایا بھی خود ہی ہے۔ دونوں تڑپ ہی تو گئی تھیں۔“

ان کی پارٹی اختتام پذیر ہوئی تو گھر والوں نے سکون کی سانس لی ورنہ شام چار پانچ بجے تک کے انتظار میں دوسوں میں گھرے رہتے تھے۔

اس دن موسم خاصا خراب ہو رہا تھا۔ ارسلہ بھی جلدی واپس آگئی تھی۔

”ارسلہ بیٹے! میں ذرا کرٹل ستار کی طبیعت پوچھنے جا رہا ہوں۔ روشان کے کالج کے آس پاس ہے ان کی کوٹھی۔ اگر نام ہو تو ابھی میں روشان اور نیناں کو پک کر تا ہوا آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے پاپا! یوں بھی موسم بھی عجیب ہو رہا ہے۔“

☆☆☆

موسم حسیں ہے لیکن
تم سا حسیں نہیں ہے
ہر اک ادا تمہاری
واللہ ول نشین ہے

ارمنان آج بہت موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔

”ارمنان پلیز، میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں۔ تم یہ لائے سیدھے گانے گا کر مجھے مزید میسر کرو۔“

احساس جرم اور پایا کے اعتماد کو پینچنے والی ٹھیس کا سوچ کر اس کا رواں رواں نادم ہو رہا تھا۔

”ارسلہ اور پایا کو یہی معلوم ہے کہ میں کالج گئی ہوں اگر انہیں پتا چل جائے کہ میں صبح سے غائب ہوں تو وہ کیا سوچیں گے۔ ہائے میرے پیارے پاپا۔۔۔!“

ارمنان بڑی ترنگ کے عالم میں اسلام آباد کی بھیگی کشادہ سڑکوں پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا، کہ بار بار گھڑی دیکھتی روشان کا شدید ٹینشن کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہونے کو تھا۔

ارسلہ باہر آ کر روشیان پر برس پڑی۔

ابھا۔

☆☆☆

”اے کہہ دو ارسلہ! میری محبتوں اور میرے مان کا اتنا عبرت ناک صلہ نہ دے۔ وہ لوگ اس کے ردِ جال بن رہے ہیں۔ ان کا ہر اٹھتا قدم نیا فریب ہے تم دونوں کے نام لکھی گئی میر دولت کو، تھیانے ا۔ وہ ہمارے ہوئے انداز میں اگلے دن اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔“

”پاپا۔۔۔ وہ۔۔۔“ ارسلہ کو بتانا محال لگ رہا تھا۔
”رضوان ماموں کا ابھی فون آیا تھا۔ وہ روشیان کی ایما پر رشتہ مانگنے آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ روشیان نے کل ہی ساری صورت حال ارمنغان کے گوش گزار کر دی تھی فون پر۔ اسی وجہ سے۔۔۔“
ارسلہ سر جھکا کے بھرمانہ لہجے میں انہیں مطلع کر رہی تھی۔ ضیاء صاحب کارنگ پیلا پڑ گیا۔
”بہت بری طرح توڑا ہے مجھے روشیان نے۔ میں تو خود اپنے نظریات سے ہار گیا ہوں۔ خود بچے آپ میں جھوٹا پڑ گیا ہوں۔“

”ہائے میرے پاپا۔۔۔“ ارسلہ کا دل دکھ گیا۔

اسے روشیان پر جی بھر کے غصہ آیا۔

”روشیان نے کہا ہے کہ شادی کرے گی تو صرف اور صرف ارمنغان سے۔ ورنہ تمام عمر یونہی گزارے گی۔“

ارسلہ نے انہیں اس کے آخری فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔

”وہ اپنے دامن میں انگارے بھر رہی ہے۔ بے وقوف۔۔۔“ وہ بڑبڑاتے تھے۔

”مگر وہ اپنی ہٹ کی پکی ہے۔ اس کی ضد سے تو آپ واقف ہیں۔ پھر کچھ بھی سہی ارمنغان ہے تو ہمارا ماموں زاد، سگارشتہ بنتا ہے۔ اتنا بھروسہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ ارسلہ نے دبے لفظوں میں موجود صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا اور باپ کو آئندہ اقدام کے لیے سوچ بچار کرنے کے لیے نکتہ پیش کیا۔ ضیاء صاحب کے کندھے نیچے ڈھلک گئے۔ اولاد پر سختی کرنے والوں میں سے تو وہ کبھی بھی نہیں رہے تھے۔

☆☆☆

”بٹ۔۔۔“ ارسلہ نے نہایت غصے کے عالم میں گاڑی کا بونٹ نیچے ٹھپ سے مارا تھا۔

”اس مصیبت کو بھی ابھی خراب ہونا تھا۔ شاہ صاحب کے ہال جانا ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے آفس سے ناظم نکال کر چار بجے پہنچیں گے۔ بلکہ پہنچ چکے ہوں گے۔ صرف دس منٹ ہی تو رہ گئے ہیں چار بجے میں۔“

پریشانی کے مارے وہ با آواز بلند بڑبڑا رہی تھی۔

کچھ سوچ کر اس نے موبائل سے آفس کا نمبر ملایا۔

”شہروز! میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ ایف ایٹ مارکیٹ کے پاس۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”کیا ہوا۔۔۔؟“ وہ فوراً بولا۔

”آخر کیا ضرورت تھی تمہیں پاپا کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی۔ گھر سے کالج کے لیے نکلیں اور سے چپکے سے کھسک لیں اس لڑکے کے ساتھ۔۔۔! شیم آن یو روشیان! یہ کتنی گری ہوئی حرکت کہ تم نے نا صرف ہمیں بلکہ اپنے اساتذہ کو بھی دھوکا دیا۔۔۔“

”تم یقین کر دو ارسلہ! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ارمنغان دو تین دن سے بار بار کہہ رہا ماموں، ممائی مجھے یاد کر رہے ہیں۔ وہ یہاں تو نہیں آ سکتے تھے، اس لیے میں ان کے ہاں چلی گئی۔ وہ یہاں کیوں نہیں آ سکتے۔ پاپا کو اتنے ناپسند کیوں ہیں وہ؟ حالانکہ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ پتا ہے! بار تہہ راپو چھ رہی تھیں۔“

ارسلہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

”جس بات سے والدین روکتے ہیں، اس سے رک جانا چاہیے۔ خواہ وہ کے جواز نہیں دے جائیں۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی پاپا کی ناپسندیدگی کی۔“

”کوئی وجہ نہیں، بس وہ کچھ غریب ہیں۔ اس لیے۔“ کو اچھے نہیں لگتے۔“ روشیان نے بگڑ کر ارسلہ اور روشیان کی امی لاشانہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ خدا نے انہیں حسن کے سے نواز رکھا تھا۔ میجر ضیاء جو اس وقت نئے نئے کیپٹن بنے تھے۔ اچانک ان کی نظر کا شکار، لاشانہ چار بہنوں میں بی بی تھی۔ ایک بھائی، بھابھی تھے جو ان کے ذمہ دار تھے۔ رضوان نے کچھ ہی کیپٹن ضیاء سے بہن کی شادی کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ضیاء صاحب جدی پشتی امیر تھے۔ آری ا محض ان کا شوق، ان کی پسند تھی۔ لاہور کے نواحی علاقے میں ان کی وسیع زرعی اراضی تھی۔ شا بعد بہن کے گھر آ کر اس نے کبھی کاروباری امداد کے بہانے، کبھی کسی ناگہانی آفت کا حوالہ دے کبھی کسی بہن کی شادی کے اخراجات کے لیے کیپٹن ضیاء سے آئے دن رقمیں مانگنا شروع کر دیں صاحب اپنی عزیز از جان بیوی کے منہ کو دیکھ کر اپنے نکتے اور کام چور سارے کو نوازتے تھے۔ پھر بعد لاشانہ کی وفات کے بعد بھی رضوان نے اپنی ہڈ حرامی اور بے غیرتی کا مظاہرہ ترک نہیں کیا صاحب کو سختی سے کام لینا پڑا۔

اس دن لاشانہ کی دوسری برسی تھی۔ رضوان نے کاروبار کے لیے پچاس ہزار مانگے تھے۔ میاں بیوی اٹھ سالہ ارسلہ اور پانچ سالہ روشیان کو چوم چاٹ رہے تھے۔

ضیاء صاحب کو ان کے خود غرض رویے کی یہ لینا پونہ زہر لگ رہی تھی۔

”برائے مہربانی آپ دونوں میاں بیوی دوبارہ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کریں بچیاں ماموں، ممائی کی محبت کے لیے مری نہیں جا رہیں۔ یوں بھی آپ کی بہن اس دنیا میں نہیں اب آپ کا اس گھر سے کوئی رشتہ، واسطہ نہیں ہے۔ رہی بچیاں تو وہ سراسر میری ذمہ داری ہیں۔“

”محببتوں“ کے بغیر بھی وہ بڑے آرام سے ہیں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی صاحب۔“ رضوان فوراً چا پلوٹل انداز میں مخاطب ہوئے ضیاء صاحب کو ان لاپچی اور فریبی لوگوں سے مزید تعلق رکھنا منظور نہیں تھا لہذا دو ٹوک دوبارہ نہ آ۔

”پتا نہیں چلتے چلتے خود ہی بند ہو گئی ہے۔“

”خود ہی کیسے بند ہو گئی؟“

”افوہ! ایک تو بات بے بات جرح کرنے لگتے ہو۔ مجھے کیا پتا کیسے بند ہو گئی۔ یہ تو گاڑی سے پوچھ کے بتا سکتی ہوں کہ تمہیں کیا مرض لاحق ہوا ہے۔“ وہ جل کر کہہ رہی تھی۔ ”تم یہ بتاؤ، اب کروں؟“

”جاہل لڑکی! میں اس لیے وجہ پوچھ رہا تھا کہ اگر کوئی چھوٹی موٹی گڑبڑ ہے یا کرنٹ کی تار اتار ہے تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ کیسے نقص دور ہوگا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”اچھا میں بونٹ کھولتی ہوں، تم بتاؤ۔ کیا چیک کروں۔ کرنٹ کی تار کہاں ہوتی ہے۔“ وہ بونٹ کھول کے موبائل کان سے لگا کے کھڑ پٹر کرنے لگی۔ شہرہز کچھ ہدایات دے رہا تھا مگر وہ سیدھی سید اس کے سر سے گزر رہی تھیں۔

”افوہ! میں خود ہی پہنچتا ہوں، تم سے نہیں کچھ ہوگا۔ بیس منٹ لگ جائیں گے۔“ تنگ آ کر شہر نے کہا۔

”دیر ہو جائے گی شہرہز۔۔۔ تم جانے کب پہنچو گے، میں پہلے ہی لیٹ ہو رہی ہوں۔ میں ٹیکس کر لوں؟“

”ہرگز نہیں، جب میں آ رہا ہوں تو رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ فوراً بولا۔
”رسک کی کیا بات ہے، جانے لٹی لڑکیاں روزانہ ٹیکسی پہ ایکی سفر کرتی ہیں آخر میں گاڑی کے بھی تو ایکی ہی آتی جاتی ہوں۔“

”لڑکیاں بے شک کرتی ہوں گی، مگر تمہارا یہ نیا تجربہ ہوگا۔“ وہ فون رکھ چکا تھا۔
”لو، یہ خواہو! میں میرا گاڈ فادر بنا رہا ہوں۔ اس کے پہنچتے پہنچتے دیر ہو جائے گی مجھے۔“
ادھر وہ شاہ صاحب میری جان کو رو رہے تھے۔ ”وہ بڑبڑاتی۔ وہ تھوڑی دیر میں اپنی سرخ آلتوں اسے ڈھونڈتا ہوا آن پہنچا۔“

”اور میری اس گاڑی کا کیا ہوگا؟“ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے پوچھا۔
”تمہیں کلائنٹ کے گھر ڈراپ کر کے واپس آ کر اسے کسی مکینک کو دکھانا ہوں، اگر نقص مدہ ہوا تو اسے تمہارا بے باس لے آؤں گا نہیں تو فون پر انفارم کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، اگر درکشاپ پہ لے جانی پڑی تو تم مجھے اپنی گاڑی میں پک کر لینا۔ آفس جا کر پافون کر کے ان کا آفس ڈرائیور منگوا لوں گی۔“
وہ سفیان شاہ کے جنگلے کے آگے اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اوکے مگر اپنا حلیہ تو درست کرلو۔ سارے بال بھر گئے ہیں۔۔۔ یہ لو۔“ اس نے جھک کر ڈا بورڈ سے برش نکالا جس کے پینڈل پہ شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ ملاحظہ کیا۔ گھنگھریالے بالوں چھوٹی بڑی لٹیں پیشانی اور گردن کے ارد گرد ناگن بن کر لپٹی ہوئی تھیں۔ سیاہ بے حد چمکدار خوب صورت آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لکیر انہیں مزید واضح اور روشن کر رہی تھی۔

بال درست کر کے از سر نو پنوں میں جکڑنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا شہرہز اس کی طرف بچہ تھا۔ اس کے دیکھنے پر نظروں کا زاویہ بدل کر گاڑی اشارٹ کرنے لگا۔
”اللہ حافظ۔۔۔“ وہ گاڑی آگے بڑھالے گیا۔

”آئی ایم سوسوری، سفیان شاہ صاحب! آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ دراصل ری گاڑی۔۔۔“
وہ جاتے ہی شروع ہو گئی تھی۔

”وجہ کوئی بھی رہی ہو مس ارسلا! اس اوکے پلیز۔ یہو اے سیٹ!“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہجہ رسائیت اور نرمی لیے ہوئے تھا۔
وہ بے ساختہ شرمندہ سی ہو کر بیٹھ گئی۔

”یہ لیجیے۔۔۔“ ارسلا نے فائل ان کی طرف بڑھائی۔
”اس میں فرخنگ اور ڈیکوریشن کا اسٹائل، کلر اسکیم اور ان پر آنے والی لاگت کی ڈی ٹیل ہے۔۔۔“ براؤن شلوار قمیص میں ملبوس سفیان شاہ نے بغور فائل کا جائزہ لیا، ان کے چہرے پر سنجیدگی اور ایک عجیب سا سناٹا قائم تھا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ ظاہر ہے آپ پروفیشنل ہیں۔ اماں! ابھی تک چائے نہیں آئی۔۔۔“ فائل بند کر کے انہوں نے کچن میں مصروف عمل اماں کو آواز لگائی تھی۔
”آگئی، السلام علیکم نبی!“ اماں چائے کے لوازمات سے سچی ٹرائی لیے اندر آ گئی تھیں۔
دو چار پروفیشنل باتوں کے بعد وہ معذرت کر کے اٹھ گئے تھے۔ ان کی گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی نیوں بچے اس کے پاس آ گئے۔

”تھنک گاڈ۔۔۔ ابھی ابھی ہمارے میوٹر گئے ہیں۔ آپ بتائیے مس! آپ کیسی ہیں؟“
”بالکل ٹھیک! ذرا مجھے اپنا کمر تو دکھائیے گا۔“ وہ ان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے ضروری قسم کی پیمائش بھی لے رہی تھی۔

اگلے دن وہ شہرہز کے ساتھ مارکیٹ گئی۔ سفیان شاہ کی طرف سے چیک مل چکا تھا۔ شام کو منتخب سامان لوڈ کر کے ان کی کونھی میں پچھنچا دیا گیا۔
وہ اور شہرہز در در کی مدد سے سامان سیٹ کر رہے۔

گوکہ یہ شہرہز کا پراجیکٹ نہیں تھا لیکن وہ ہر پراجیکٹ میں اس کی مدد کرتا تھا۔
دونوں وہاں سے آس آگئے اور کچھ ضروری حساب کتاب کرنے لگے۔ اسے یہ بل میڈم آصفہ کو بھی دیئے تھے۔

”ڈارک گرین لیدر کے صوفے، ڈارک گرین کارپٹ اور سلور بیجز پر مشتمل ڈارک گرین بڑے۔ دوسرا صوفہ سیٹ سلور اور گرین سلک کے کورز والا ہے اور ڈیکوریشن کے لیے گرین کرشل کے خوب صورت گلدان اور کچھ روایتی کلچرل قسم کے ڈیکوریشن پیسز مثلاً دیواروں پر رگ (rug) لٹکانا اور شاندار قسم کی پورٹریٹ، اب رہ گیا بچوں کا کمر اور شاہ صاحب کا کمر۔ اپر پورشن وہ لوگ بعد میں کرائیں

گے۔“

”ان کی مسز کب تک آرہی ہیں؟“ شہروز بونہی پوچھ بیٹھا۔

”بچے کہہ رہے تھے، وہ کینیڈا میں ہیں اپنی کسی دوست کے پاس، وہ دو تین ماہ میں آئیں گی۔“

”کیا وہاں جاب کرتی ہیں یا ان کے والدین رہتے ہیں؟“

”نہ جاب کرتی ہیں، نہ میکہ ہے وہاں۔ بس کسی وجہ سے ایک ہفتہ پاکستان رہ کر وہ واپس کر چلی گئی ہیں۔“

”یہ کیا چکر ہے؟“ شہروز متعجب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”بچے تو یہی کہتے ہیں کہ ماما کسی کام سے وہاں رکی ہیں۔ آخر کون سا کام ہو سکتا ہے۔ کوئی کر وغیرہ کر رہی ہوتی تو کم از کم بچوں کو تو خبر ہوتی۔ پس پردہ ہے کچھ۔ خود شاہ صاحب بھی اس موضوع کتراتے ہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

”بس۔“ شہروز نے ہاتھ اٹھا دیے۔ ”ہمارے پاس اپنے مسائل کم ہیں بات کرنے کے لیے جو اُدھر کی پریشانیاں سمیٹ رہے ہیں۔ تم سناؤ، تمہارے پاپا کی طبیعت کچھ کسلی؟“

”ان کی طبیعت تو ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئی ہے۔“ ارسلہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”روشان کی پر اس کا رشتہ ارمنغان سے ملے تو کر دیا ہے مگر وہ خوش ہرگز نہیں ہیں۔“

”ارمنغان کتا کیا ہے؟“ شہروز کو اول روز سے سارے قصے کی خبر تھی۔ ارسلہ اس سے اپنی بات نہیں چھپاتی تھی۔

”گزشتہ تین سال سے ایم بی اے کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اس بار کرنی گزرے۔ ایم بی اے پاس کرنے کے بعد اسے بہتر نوکری حاصل کر کے مواقع مل جائیں گے۔ صورت حال اتنی بھی مایوس کن اور بری نہیں ہے کہ تم اور انکل یوں جی بیٹھیں۔ ہمیں اچھائی کی توقع کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے انسان کو ٹھکن نہیں ہوتی، وہ تازہ دم رہے۔ یہ بتاؤ، شادی کے کب ارادے ہیں۔“ چائے آچکی تھی۔ شہروز اس کی چائے اس کے سامنے ہوئے پوچھنے لگا۔

”ناموس، ممائی کا تو بس نہیں چلتا، آج ہی بیاہ کے لے جائیں۔ رکاوٹ پاپا کی طرف سے۔ وہ مجھے اور اس کو اکٹھا بیاہنا چاہتے ہیں۔“ شہروز بے وجہ کاغذ پر پین سے لائیں کھینچنے لگا۔ اس کا سر جھکا تھا اور ساری توجہ کاغذ پر تھی۔

”پھر کیا ملے ہوا؟“ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔

”ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ تایا جان کی طرف سے فی الحال کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی اور خود میں ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ میری کوشش یہ ہے کہ میں پہلے روشناس کی شادی کر دوں، مبادا اس کے ذہنی خیال آئے کہ میری وجہ سے اس کی خوشیاں اس سے دور کھڑی ہیں۔“

”بالکل۔“ وہ قدرے ریلیکس نظر آیا۔ ”ضروری تو نہیں ہے بڑی کی پہلے ہو اور چھوٹی کی اس بعد۔“ وہ اپنی میز کی دراز کھول رہا تھا۔

”اچھا، یہ کارڈ رکھو، نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ وٹس تو میں تمہیں بارہ بجے کے بعد ہی کروں گا، ال کارڈ حاضر ہے۔“

”مامی کاڈ شہروز! تم عید، بقرعید ہر تہوار پر، ہر موقع پر مجھے وٹس کرنا اور کارڈ بھیجنا نہیں بھولتے۔“

بیرنگ اینڈ شیرنگ قسم کے دوست ہو۔“ ارسلہ کو بے ساختہ سی خوشی ہوئی تھی۔ وہ کارڈ کا بغور جائزہ لیتی تھی۔ بہت خوب صورت سا منظر تھا، شام کا سورج ڈوبنے کا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔

”جب بھی مدد کی ضرورت ہو، آنکھیں بند کر کے پکار لینا۔“ وہ کارڈ پڑھ رہی تھی اور محظوظ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

گھر میں زور و شور سے روشناس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ظاہر ہے زیادہ ”کھب“ ارسلہ لیے ہی تھی کہ وہی باہر کے کام سنبھال رہی تھی۔ پاپا بھی سرگرم عمل تھے لیکن بہت بچھے بچھے انداز۔ ممائی اب بڑے حق سے یہاں آیا کرتی تھیں اور باتوں باتوں میں اپنی فرمائشیں اور چیزوں کے

ے میں اپنی پسند، ناپسند بتا دیا کرتی تھیں۔

ارسلہ دل میں کڑھتی رہتی۔

تایا سجاد کی فیملی کو اس اچانک اور انہونے قسم کے فیصلے پر خاصا اچنکھا ہوا تھا۔ نیناں جانتے بوجھتے بے بھی خاموش رہی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ یہ تیل منڈھے چڑھ جائے گی۔

بہر حال وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن رہنے والی، بے فکری لڑکی تھی۔ اس نے اپنی ساری توجہ

کی کوکھر پورا اور ہنگامہ خیز بنانے میں لگا دی تھی۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے اسے پاپاؤں بٹھا دیا گیا تھا۔

وہ واقعہ شادی سے ٹھیک تین دن قبل ہوا۔

”میں فرینچر پوڈ کروانے جا رہی ہوں پاپا کے ساتھ تمہیں تھریڈنگ اور فیشل کے لیے پارلر کس ٹائم ہے۔“ ارسلہ نے ڈراپ کرنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

”وہ شام کو جانا ہے، آپ لوگ جائیں۔“

اس دن روشناس ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خاموش، الجھی ہوئی بلکہ فکر مند سی دکھائی دی تھی۔

ارسلہ واپس آکر اس سے پوچھنے کا سوچتی ہوئی چلی گئی مگر واپس آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

جس سے پوچھنا تھا، وہ گھر سے غائب تھی۔

ارسلہ تایا جان کے ہاں غلٹ میں آئی تھی۔ وہاں بھی نہیں ملی۔ آس پاس اپارٹمنٹ میں یہاں نے ٹکس کے دیکھا مگر کہاں۔ پارلر فون کیا۔ ادھر سے جواب آیا۔ ”ہم تو خود انتظار کر رہے ہیں۔“

یا خدا کہاں چلی گئی۔ زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔

میجر ضیاء کے چہرے پر ہوا سیاں اڑ رہی تھیں۔ ہاتھوں پیروں سے جان لگی جا رہی تھی۔

”پاپا۔۔۔ پاپا! پلیز آپ ریلیکس رہیں۔ میں اسے ڈھونڈ لاتی ہوں۔ یہیں کہیں ہوگی، شہر کے کواٹنگ سینٹر میں۔ اپنی مرضی کی کوئی چیز خریدنا ہوگی اور اس نے کہاں جانا ہے۔ پرسوں اس کی شادی

ہے اور اس کی پسند سے ہو رہی ہے۔ اس موقعے کا وہ شدت سے انتظار کر رہی تھی پھر اسے رات کیوں جانے دے گی۔ اسے بھی موقع کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہوگا۔“
وہ خود بھی از حد پریشان تھی لیکن باپ کا مرجھایا ہوا خوف زدہ چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں ہو رہی وہ خود کو زبردستی مطمئن دکھانا چاہتی تھی۔

”عزت صدیوں کی محنت اور جدوجہد کے بعد خاندان کے سرپرستار بن کر سجا کرتی ہے نیا رات کے ساڑھے گیارہ ہو گئے تو تایا سجاد نے سخت لہجے میں ضیاء صاحب کو مخاطب کیا تھا۔
”میں جانتا ہوں بھائی صاحب!“ وہ بے بسی کی انتہائی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ آنکھیں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ارسلہ نے اپنے آفس فون کر کے شہر و ز کو پک کیا اور اب دونوں باہر چھانٹے پھر رہے تھے۔“
پوری رات گزر گئی۔
بڑی قیامت کی رات تھی۔

ماموں، ممانی اور ارمدغان کو اس بات کی اطلاع پہنچ گئی تھی کہ کل سے لڑکی غائب ہے۔
”یہ سب آپ لوگوں کی سازش ہے۔ جان بوجھ کر اسے چھپایا ہے۔“ ارمدغان نے چیخا شروع دیا تھا۔ وہ بہت جارحانہ موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ آتے ہی اس نے بے وجہ چیزیں پختا شروع کر دیں۔ ضیاء صاحب صبر کے گھونٹ پی کر اس کی کن ترانیوں کے جواب میں خاموش بیٹھے رہے۔
بے بسی قابل دید تھی۔
”آپ لوگوں نے مجھے ذلیل کرنے، میرے خاندان کا نام بدنام کرنے اور بہانے سے چھڑانے کے لیے لڑکی کو کہیں بھجوا دیا ہے۔“
وہ شعلہ باز نظروں سے ضیاء صاحب کو گھورنے لگا۔

”ہوش تو ٹھکانے ہیں ماما صاحب زادے!“ ضیاء صاحب چپ رہے مگر ان کی جگہ سجاد بول پڑے تھے۔ ان کی ساری فیملی ضیاء صاحب کے گھر پر جمع تھی۔ تانی جان، نیناں، تایا، سب از ضیاء صاحب کی تسلی و تسفی کر رہے تھے اور ان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ رومی تو دودن۔ صوبائی سطح پر کھیلے جانے والے کالج کے کسی میچ کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا، البتہ اسد موجود تھا مگر چہرہ، لہجہ اور انداز کسی قسم کی ہمدردی اور اپنائیت سے مبرا تھا۔
”یہ سب آپ کا تصور ہے چچا جان! بیٹیوں کو بے لگام اور بے مہار کھلا چھوڑنے کا نتیجہ دیکھ لیں۔ کسی کام نہ آئی آپ کی یہ ”لیبرل“ سوچ۔ بہت مان اور غرور تھا نا آپ کو اپنی بیٹیوں پر۔“ اسد کا لحاظ رکھے بغیر کہا۔

ادھر ارمدغان نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔
”مجھے ہر قیمت پر روشناس چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔“ وہ روشناس کے کمرے کے دروازے کا جائزہ لے رہا تھا، گویا اسے اچانک نہیں سے برآمد کر لے گا۔
”ہم نے تو اپنی مری ہوئی بہن کے پیٹھے پیچھے رشتہ جوڑا تھا۔ کیا خبر تھی اندر ہی اندر اور

کھلائے جارہے ہوں گے۔“ رضوان نے مونچھوں کو تان دیتے ہوئے تبصرہ کیا۔
”شرم کریں آپ! غائب ہونے والی لڑکی آپ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ کم از کم سگی بھانجی کا رشتہ تو ہے نا۔ اسی کا خیال کر لیجیے۔“ ارسلہ رہ نہیں سکی تھی۔

سارا دن کی خواری کے بعد وہ یوں بھی بہت غمگین تھا۔
”تایا جی! کسی طرح ان لوگوں کو تو نکالیں یہاں سے۔ یہ تو بولے ہی چلے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے پاپا کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے ان کی حرکتوں سے۔“ ارسلہ نے موقع پا کر تایا سجاد سے بات کی تھی۔ تایا جی نے طریقے سے انہیں ٹالا۔
”اب وہ آ بھی گئی تو کیا حاصل۔ رات تو پوری گزر گئی۔ اعتبار تو بس ایک ہی بار کا ہوتا ہے، اب آئے بھی تو اسے سنبھال کے اپنے پاس ہی رکھیے گا، ہماری پہلے ہی بہت بدنامی ہو چکی ہے اب کس منہ سے لوگوں سے کہتے پھریں گے کہ جو شادی کا رڈ آپ کو دیا گیا تھا، اس کو کنسل سمجھ لیجیے۔“ ممانی اور ماموں بہت جل جل کر تبصرہ کر رہے تھے۔ ”دہن صاحبہ گھر سے غائب ہیں۔“
وہ لوگ گھر چلے گئے، دو گھنٹے بعد ان کا فون آیا۔

”ہم نے جن لوگوں کو کارڈ دیے تھے، ان سے معذرت کر دی ہے کہ کسی وجہ سے فی الحال یہ شادی ملتوی کر رہے ہیں۔“
”اوہ۔۔۔“ ضیاء صاحب کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ جو ایک امید تھی کہ کہیں سے معجزہ ظہور پذیر ہو جائے گا اور وہ اس ذلت سے بچ جائیں گے، وہ خاک میں مل گئی۔
انہیں بھی ہوش میں ہال کی بنگلے کنسل کرنا پڑی جو کہ بڑی مشکل سے ملی تھی۔
دوپہر کو ارمدغان نے پھر چکر لگایا۔ اب کے اس کارڈ عمل بہت سنجیدہ تھا۔
”کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“ ارسلہ کا چہرہ مایوسی و پریشانی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔
”گھر والے کچھ بھی کہیں پھو پھا جان! روشناس مل جائے تو میں آج بھی اس سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔“
میجر ضیاء کے چہرے پر ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ پہلی بار انہیں اس لڑکے کے خلوص پر یقین آیا تھا۔ وہ کتنا اعلا ظرف تھا۔
”لیکن تمہارے والدین۔۔۔“
”انہیں میں منالوں گا، کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا۔ ایک بار وہ ملے تو سہی۔“ وہ ہاتھ مل رہا تھا۔

”میں دنیا کی باتیں سن لوں گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہیں کہیں گے تاکہ بھاگی ہوئی لڑکی سے شادی کی ہے۔ جانے کہاں کہاں سے اور کن کن مراحل سے گزر کر واپس گھر پہنچی ہے لیکن کوئی بات نہیں، وہ میری عزت ہے اور میں ہر قیمت پر اسے اپناؤں گا۔ پتا نہیں اس جیسی سمجھ دار لڑکی نے اتنی نادانی کیوں کی۔“

ہیں صرف اپنا بندہ بنا کر رکھے۔ حاجت روائی کے لیے وہ ایک در ہے نا، جہاں ہر کسی کی سنی جاتی ہے، ہم جیسے گنہگاروں کی بھی۔“ ضیاء صاحب کا لہجہ بھیگ گیا۔

ارمغان کو راستے میں ڈراپ کر کے دونوں باپ بیٹی گھر آ رہے تھے کہ ارسلا کے موبائل کی بیل بجی۔

”میں نے ریسکیو ون فائیو پر اطلاع دی ہے۔“

”ارے، پولیس تک بات نہیں پہنچانی تھی۔“ ارسلا تو بوکھلا اٹھی۔

”بے فکر رہو، کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہوگا اس قصے کا۔ وہاں ایک انپکٹر میرا واقف کار ہے۔ میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ یہ ایک پرسنل معاملہ ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”پاپا کے ساتھ کہیں نکلی ہوئی ہوں، گھر پہنچ کر تمہیں کال کروں گی۔“ اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

”کون تھا؟“

”پاپا! شہر وز تھا۔ اس کا کوئی گہرا دوست پولیس میں ہے اور اس نے یقین دلایا ہے کہ پولیس کے ریکارڈ پر آپ کا یا میرا کوئی حوالہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے طور پر لڑکی کی تلاش جاری رکھیں گے اور سراغ ملتے ہی اطلاع دیں گے۔“

”پولیس۔۔۔؟“ میجر ضیاء کا سانس رکنے لگا۔ ”یہ تو میں بھی کر سکتا تھا مگر میں تھانے کچہری کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”آپ بے فکر رہے پاپا! یوں سمجھ لیجیے۔ گھر کی بات ہے۔ اگر انہوں نے بازیاں کرائی تو کبھی بھول کر بھی کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ پولیس گھر پر نہیں آئے گی وہ صرف شہر وز سے رابطے میں رہے گی۔ کچھ بھی آن ریکارڈ نہیں ہوگا۔“ ارسلا نے تسلی دی۔

”میری محبت اس قابل تو نہیں تھی روشاں بیٹی! کہ تم اتنی بری طرح جوتا مارتیں۔“ ایک آنسو بند آنکھوں سے لڑھک کر گال پر سفر کرتا ہوا ٹھوڑی کے پاس آ کر گم ہو گیا تھا۔

گاڑی چلائی ارسلا نے ایک نظر باپ پر ڈالی۔ اسے گہرا شاک لگا۔ دل سے شعلے سے اٹھنے لگے۔

”ہائے روشاں، یہ کیا قیامت ڈھائی ہے تم نے۔“

فولادی اعصاب کے مالک، اس پیار لٹانے والے وسیع القلب انسان کو کس بے دردی سے کانٹوں پر گھسیٹ ڈالا ہے۔

شہر وز کل سے اب تک مسلسل اس سے رابطے میں رہا تھا۔

کل تو وہ اس کے ساتھ پورے اسلام آباد، پٹری میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ آج پولیس سے خفیہ مدد لے رہا تھا۔ شام ہوگئی۔ کل مہندی تھی اور پرسوں رخصتی۔

ارسلہ نے مہندی کے لیے گھر کا لاؤنج کتنا شاندار قسم کا تیار کرایا تھا۔ یہ بہت بڑا ہال نما ایریا تھا

جنہاں سے فرنیچر ہٹا کر لڑکیوں کے بیٹھنے کا بڑا اچھا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ایک سائیڈ پر اسٹیج بنایا گیا تھا۔ دو روایتی قدیم کرسیوں کو مصنوعی پھولوں اور آرائشی لڑیوں سے بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔

”سارے ہسپتال، سارے ادارے، ہر سڑک کھگال ماری ہے۔ جانے کہاں چلی گئی وہ۔“ ضیاء صاحب کی آواز میں گہری اذیت تھی۔

”ایک حل ہے میرے پاس، ادھر پنڈی میں ڈبل روڈ پر کوئی بزرگ رہتے ہیں۔ سنا ہے، وہ لوگوں کے مسائل اور پریشانیوں کا فوری حل بتاتے ہیں اور اس پریشانی کی بنیادی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ان کے پاس چلتے ہیں، شاید وہ ہماری مدد کر سکیں۔“

”میں ان ذریعوں پر یقین نہیں کرتا لیکن چلو، چل کے دیکھ لیتے ہیں۔“ ضیاء صاحب اس پیرز فیکری کے بہت خلاف رہے تھے مگر اس وقت بیٹی کے گھر سے غائب ہونے کا دکھ اس درجہ حادی تھا کہ

سب فراموش کر بیٹھے تھے۔

ارسلہ نے روتے ہوئے دل سے ان کی طرف دیکھا۔

اس کے اتنے پروقار، اتنے بارعب پاپا اس وقت لاچاری و بے بسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ان کی ذہنی حالت بہت ردی ہو رہی تھی۔

ارسلہ بی ڈرائیو کر رہی تھی، وہ جھکے کندھوں، ستے ہوئے چہرے اور بے خواب اذیت بھری آنکھوں سمیت اگلی سیٹ پر بیٹھے جانے کس آس پر بے تابی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ارمغان پچھلا

سیٹ پر بیٹھا تھا۔ عجیب و غریب، تاریک بل کھاتی گھٹیاں عبور کر کے وہ عجیب سے بوسیدہ قسم کے مکان میں پہنچے تھے۔

یہاں پہنچ کر مزید گھٹن اور اذیت کا احساس بڑھ گیا۔ پچاس روپے فیس دے کر وہ لوگ لمبی قطا میں لگ کے انتظار کرنے لگے جو شاید گھنٹوں تک محیط تھا۔

”لو! اگر یہ بزرگ کوئی کرشمہ ساز ہوتے تو خود اپنی حالت نہ سنواری ہوتی۔ اس پرانی دھرائی گھڑ

زدہ جگہ پر ہاش پذیر ہونے کے بجائے کسی اچھی جگہ پر نہ ہوتے۔ انسان کے پاس کچھ ہو تو سب پہلے وہ اپنی ذات پر لگتا ہے، اپنے لیے خرچ کرتا ہے پھر خدمتِ خلق کی طرف آتا ہے۔“ ڈیڑھ گھنٹے بو

باری آئی۔

بزرگ عربی زبان میں لکھے ہوئے کچھ تعویذ دے کر استعمال کا طریقہ سمجھانے لگے۔ مزید توڑ۔

لیے کل تشریف لانے اور پانچ سو روپے کا ایک عمل کرانے کی تاکید کی۔

”ان لوگوں کے چکروں میں نہیں آنا چاہیے پاپا! اپنی جگہ خدا بن کے بیٹھے ہوتے ہیں۔ دیکھا کیسے رعونت سے بات کر رہے تھے اور مسئلہ پورا سنا بھی نہیں تھا کہ ٹوک دیا۔ جیسے قافٹ بھٹتا رہے ہوا

اور یہ کم فیس بھی دراصل دھوکا ہے۔ پچاس روپے غریب بھی با آسانی دے سکتے ہیں۔ پہلے یہ انہیں۔ چنگل میں پھنساتے ہیں پھر جو پیسے والا ہوا ہے آنے بہانے سے نچوڑنے لگتے ہیں اور جو غریب، اسے سو پچاس میں نال دیتے ہیں، ان جگہوں پر تو کبھی نہیں آنا چاہیے۔“

ارسلہ نے باہر آ کر پاپا سے کہا۔

”میں کون سا خوشی سے آیا تھا بیٹی! بس پریشان دل ہی تو بھٹکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرے!“

جاسکے۔ ریسک و نفاذ والے اپنا کام کر رہے ہیں۔ اچھا اب کام کی بات سنو، میں نے کل مختلف ن میں اپنا نمبر لکھوایا تھا نا۔“ احتیاط و عزت کے پیش نظر ضیاء صاحب کا نمبر نہیں لکھوایا گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہاں سے کوئی رسپانس آیا؟“ وہ بے صبر ہو گئی۔
”ادارہ فیض الاسلام کی ایک شاخ ہے دارالامان۔ کھنہ پل کے پاس۔ انہیں کل ایک بائیس سالہ بلی ہے۔ وہ سر کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ اس نے نیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے۔ گورارنگ ہے اور براؤن کھنکھریا لے بال ہیں۔ گلے میں ایک چین بھی ہے۔“ وہ مزید بھی کچھ بتا رہا ارسلہ سے رہا نہ گیا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ ہی حلیہ ہے۔ یقیناً روشناس ہی ہوگی۔ تم مجھے وہاں لے چلو، میں گاڑی لٹی ہوں۔ تمہیں آفس سے پک کر لوں گی۔ اپنی آٹو وہیں چھوڑ دینا۔“ وہ بے قرار ہو گئی۔
”ایک منٹ۔ میں آفس میں نہیں ہوں، اپنے گھر پر ہوں۔ آئی ایٹ فور کے فلیٹ نمبر بارہ بلاک بی تم کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر سے پک کر لیتا ہوں۔“

”نہیں، شاید یہ مناسب نہ لگے۔ پایا تو تمہارے بارے میں اچھی طرح آگاہ ہیں کہ میں باہر کے رج کے معاملات ان سے شیر کرتی ہوں مگر شاید اسد کو یہ اچھا نہ لگے۔ میں خود آ رہی ہوں۔“ وہ اڑتی ہوئی مطلوبہ جگہ پہنچی تھی مگر اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی امیدوں پر افسوس پڑ گئی۔

”یہ روشناس نہیں ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس آئی تھی۔ شہر و گواپس ڈراپ کر کے آئی تو اس کے قدم دبلیں پر ہی جم گئے۔

اڑی ہوئی رنگت، بھرے براؤن بالوں اور ہلکے کپڑوں میں ملیں بے اوسان سی مہر بہ لب آنسو اروشان سامنے آؤج میں بیٹھی تھی۔ تائی اماں اور نیناں اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ تاپا جان کسی کی پشت پکڑے کھڑے تھے۔ اسد نیل کا کنارہ تھا مے بری طرح روشناس کو گھور رہا تھا اور نے کے سے انداز میں۔۔۔ صوفے پر بیٹھتے تھے۔

”یہ کیا طریقہ تھا پریشانی کرنے کا بیٹی!“ تائی اماں اس کے بال سنوارتے ہوئے خفگی سے پوچھنے لگی۔

”مم۔۔۔ مجھے کسی نے اغوا کر لیا تھا۔“ وہ سر جھکائے آنسو بہاتی ہچکیوں میں بتا رہی تھی۔ ”میں جانے کے لیے نکلی تھی کہ مین روڈ پر ایک گاڑی رکی، دوسرے ہی لمحے وہ مجھے رومال سنگھا کر بے ہوش کے اٹھالے گئے۔“

”کہاں لے کر گئے تھے تمہیں۔“ ارسلہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”پتا نہیں پایا! وہ ایک بند کمر تھا، کل شام سے آج شام تک وہیں بند رکھا پھر جانے کیا سوچ کر چھوڑ دیا مگر لے جانے سے پہلے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ گھر کے پاس آ کر پٹی کھولی ہے۔ آئی لڑیا! انہوں نے مجھے ”کسی“ قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

میں تو یقین کر لوں گا بیٹا کہ میری مجبوری ہے۔ میں ایک باپ ہوں مگر تم ان لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں جن کے ساتھ عمر گزار رہی ہے۔“ پاپا دل گیر لہجے میں بولے۔

دیواروں پر بھی آرائش کی گئی تھی۔ بے شمار چمکتی لڑیاں، غبارے، چمکتی پتیوں سے بنے پھول ستار۔ جانے کیا کیا کچھ۔

روشان کے لیے مہندی کا سوٹ اس نے خود ڈیزائن کیا تھا۔ ہر اگوٹا، دوپٹے کے پلوؤں پر موتی اور کاچ کی چوڑیوں کا انوکھا امتزاج۔

پاپا اس کی فرمائش پر تین دن پہلے سے ڈھونڈ لے آئے تھے۔ فریج بے شمار قسم کے اسٹیکس۔ ہوا تھا۔ روشناس، نیناں اور ارسلہ کی سہیلیاں آتیں، گانے گاتیں، کیک، مٹھائیوں اور سینڈوچز کے ڈرائی فروٹ اور نمکو وغیرہ سے شغل فرماتیں اور رات کا کھانا کھا کے واپس جاتی تھیں۔

ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اور اب کل سے جیسے موت کا سا سکوت طاری تھا۔
ارسلہ نے نیناں کو فون پر بٹھا ہوا تھا۔ وہ سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں کے آنے والے فون کی آمد پر کسی ایمر جنسی کا بہانا کر کے انہیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔
”ارسلہ! ہم سارے رشتہ داروں اور میل ملاپ کے لوگوں میں بدنام ہو گئے ہیں۔ نہ نہ ہوئے بھی سب کو پتا چل گیا ہے۔“

تائی اماں فکر مندی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی ابھی نیناں کے ہمراہ آئی تھیں سجاد، پاپا کے کمرے میں جانے کوں سی تجویز لے کر گئے تھے۔ سوائے اسد کے وہ پوری فیملی پریشانی میں برابر کی شریک تھی۔

”اب کیا ہو سکتا ہے تائی اماں! ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کب تک چھپا سکتے ہیں ہم اس گمشدگی کا خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ارے نیناں! یہ ٹرے کیا ہاتھ میں ہی پکڑے رہو گی۔ رکھو ادھر میز پر اور اپنے چچا اور ارسلہ کے لیے کھانا نکالو۔ کل سے کچھ نہیں کھایا پایا۔“ انہوں نے لوازمات سے کچی ٹرے ہاتھ میں تھامے؛ ٹھوکا دیا تھا۔

فون کی بیل پھر بجی تھی۔ نیناں نے ارسلہ کے اشارے پر ٹرے رکھ کر کونے میں جا کر فون اس کے پاس آگئی۔

”آپ کے آفس سے فون ہے ارسلہ!“
”جی۔“ وہ مارے باندھے فون تک آئی۔

”ارسلہ! میں ہوں شہروز۔“ وہ رساں سے گویا ہوا۔ ”کیسی طبیعت ہے انکل کی اور تمہارا کھایا پیابھی ہے یا نہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لیے فکر مند تھا۔

”ابھی تائی اماں کھانا لائی ہیں، نیناں نکال رہی ہے، کچھ نہ کچھ لے ہی لوں گی۔“ وہ بے دہلی بولی۔

”اوہو، سرال والوں کی جانب سے خد متیں ہو رہی ہیں، بہت خوب۔“
”اس وقت تو کوئی بات بھی خوش نہیں کر رہی شہروز۔“ وہ ٹوٹ سی گئی۔
”اونہوں، ہمت نہیں ہارتے۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ دنیا کی کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے جس

”وہ بھی یقین کر لیں گے۔ ارمنان انہیں سمجھالے گا۔“

”مگر ارمنان کو کون سمجھائے گا۔“ ارسلا افسردگی سے اس کے پاس بیٹھ گئی اور کمر تھپتھپائی۔ اپنے باپ کے حوصلے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ کوئی روایتی باپ ہوتا تو بنا صورت حال جانے بیٹے الزام ٹھہرا کر برا بھلا کہتا۔

ارمنان اور اس کی فیملی کو اطلاع دی گئی۔ پایا خود گئے تھے۔

ارمنان تو ابھی بھی اسے اپنانے کو تیار تھا مگر ماموں ممانی بہت شور کر رہے تھے۔

”ہم کیسے سارے جہان کی کالک اپنے منہ پر لیں۔ ساری دنیا کو خبر ہے۔ سب ہم پر تہہ رہے ہیں۔ دودن باہر گزار کے آئی ہے۔ ہم کس سے ”سرسٹیکٹ“ لیں پاکیزگی کا۔ کیا خبر کیا کچھ؟ اس پر۔“

اب یہ حال تھا کہ پایا مغلوب تھے اور وہ غالب۔ پایا جانتے تھے، اگر ان لوگوں نے نہ روشناس ساری عمر یونہی گھر بیٹھی رہ جائے گی۔ ایک دنیا جان گئی تھی۔ گھر گھر رسوا کی داستان بچ تھی۔ کون تھا جو آنکھوں دیکھی کبھی ٹھکنا۔

انہوں نے تاپا جان کو بیچ میں ڈالا۔ دو تین دن تک وہ ماموں ممانی کے گھر کے چکر لگاتے رہے۔ تاپا جی نے مقدور بھر کوشش کی معاملہ سلجھانے کی۔ بالآخر بہت سی تاویلوں، وعدوں اور فرمائشوں۔ بادل ناخواستہ وہ اس ”رسوائی“ کو بیانے اور گھرانے پر مجبور ہو گئے۔

”آپ کا کیا جائے گا، آپ تو گھر سے رخصت کر کے ہمارے متھے ماریں گے۔ بھگتتا تو پڑے گا ساری عمر۔ بھائی ہوئی لڑکی کو گھر میں بسنا کسی کا ہی جگر اہوا کرتا ہے۔ یہ ہمارا ہی طرز جو رشتے کا لحاظ کر کے آپ کی بیٹی کو قبول کر رہے ہیں، کوئی غیر ہوتا تو۔۔۔ اور آپ نے تو ہمیں سے ہی کمتر اور حقیر جانا۔ ہم سے رشتہ داری نبھانا اپنی توہین سمجھا تھا۔ آپ دیکھ لیں، کون کام آیا۔ صورت حال میں۔“ واقعی پایا قائل سے ہو گئے۔ (گھٹا ل تو پہلے ہی تھے)

”اب ارمنان کے مستقبل کے لیے کچھ کریں۔ آپ کی بیٹی تو ہم نے بنادی۔“ ماموں دو بات کر رہے تھے۔

”اے کہیں سیٹ کرا دیں اور پانچ دس مرلے کا پلاٹ دلوادیں۔ کل کلاں کو اپنا گھر بنانا۔ اسلام آباد، پنڈی میں کوئی پلاٹ تو ہوگا نا بلکہ ایسا کیوں نہیں کرتے، آپ کو حکومت کی طرف سے؟ میں دو اپارٹمنٹ ملے ہیں، ایک روشناس کو جہیز میں دے دیں۔ جہیز کا سامان وہیں سیٹ کرا دیں۔ میں گاڑی مل جائے گی۔ یوں دونوں چکالہ سے ہمیں ملنے آرام سے آتے جاتے رہیں گے۔ پر جو آپ نے اپنے آفس کی ایک براچنگ کھولی ہے، اس میں ارمنان کو جاب دلوادیں۔“ ماموں نے دی

”ٹھیک ہے۔“ پایا نے خاموشی سے سارے مطالبات مان لیے۔ جن باپوں کو بیٹیوں کی ہارنا پڑے، وہ اسی طرح سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

”سجاد بھائی! میں چاہتا ہوں، اب ارسلا کو بھی رخصت کر دوں۔“ روشناس کی شادی کے صرف دو ہفتے بعد ضیاء صاحب از خود چل کر تاپا سجاد کے پاس گئے تھے۔

”تمہاری خواہش سر آنکھوں پر ضیاء! بلکہ یہ فرمائش تو اصولاً ہماری طرف سے ہونی چاہیے تھی مگر۔۔۔“ وہ چپ ہو گئے اور ضیاء صاحب کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

”اسد قابو میں نہیں آ رہا دراصل۔۔۔“ سجاد صاحب نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ”وہ پہلے بھی کافی معترض تھا مگر اب روشناس والے واقعے کے بعد۔ اچھا ایسا کرو، ارسلا بیٹی کی جاب چھڑوا دو کچھ عرصے کے لیے۔ شاید اسد کو یقین آ جائے اور اس کے اعتراضات اور شکوک دور ہو جائیں۔“

☆☆☆

”ہمیں آپ کی سیٹنگ بہت پسند آئی ہے مس۔ صرف دو ماہ کے عرصے میں آپ نے پورے گھر کا نقشہ بدل دیا ہے اور ہمارا کمر تو بہت ہی اچھا سمجھایا ہے۔ لاؤنج، گیٹ روم، پایا کا بیڈ روم، فریڈول کا اسٹڈی روم۔“

پنک اونچی جرسی نما شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں تانیہ مشرقی نقوش، مشرقی رکھ رکھاؤ، مغربی لباس اور مغربی لب و لہجے کے ساتھ بڑا دلچسپ تاثر دے رہی تھی۔

”اچھا۔“ ارسلا مسکرائی۔

”مجھے بھی بہت اچھا لگا آپ کے ہاں آنا۔ آپ کے میز، آپ کی پیاری پیاری باتیں، میں واقعی بہت مس کروں گی۔“

اسے سچ سچ یہ بچے بہت عزیز ہو گئے تھے۔ بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

”مس! کیا آپ دوبارہ نہیں آئیں گی؟“ عالیہ پریشان نظروں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کے فادر کا اسائن کیا ہوا پروجیکٹ کمپلٹ ہو گیا ہے، میرا کام ختم ہو گیا ہے، اب کیا کرنے آؤں گی۔“ وہ مسکرائی۔ بچوں کے چہرے پر مایوسی پھیلنے لگی۔

”ایسا کرو، میرا موبائل نمبر لکھ لو۔ جب جی چاہے بات کر لیا کرنا بلکہ میرا ایڈریس بھی لے لو۔ آپ لوگ کبھی چکر لگنا۔ یہ بتاؤ، آپ کی ماما کی واپسی کا کیا بنا؟“

”کچھ نہیں، پایا کہہ رہے تھے، وہ شاید مزید کچھ ماہ تک نہ آسکیں۔“ جانے ارسلا کے دل میں کیا آئی، وہ بچوں کو نال کے کچن میں مصروف عمل اماں کے پاس آ گئی۔

”اماں! آج میرا آخری دن ہے، آج تو یہ معہ حل کر ہی دیں۔ بچوں کی ماں کہاں ہے، وہ صرف ایک ہفتہ پاکستان رہ کر کیوں واپس چلی گئیں۔ آخر وہ کیا راز ہے جو بچوں سے چھپایا جا رہا ہے؟ یقیناً آپ جانتی ہوں گی۔ مجھے بتاے سفیان صاحب گھر بیٹو معاملات میں آپ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔“

”بیٹی! دراصل بی بی کو کینسر ہے۔ آخری اسٹیج پر ہے۔ صاحب ان دنوں کینیڈا گئے ہوئے ہیں۔ بچوں سے تو بزنس ٹرپ کا بہانہ کیا ہے لیکن اصل میں وہ علاج کے لیے مزید رقم لے کر بیوی کے پاس گئے ہیں، اسی لیے اوپر والے پورشن کی فی الحال سیٹنگ نہیں کرائی۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ کسی

طرح لی بی کو آرام آجائے۔ بی بی وہاں علاج کے لیے رہتی ہیں اور اب پچھلے ایک ماہ سے مسلسل ہسپتال میں داخل ہیں۔ ان کے ڈاکٹر نے فون کر کے انہیں کینیڈا بلوایا ہے کہ اب چل چلاؤ ہے بس جو چند دن کا سائیس رہ گئی ہیں، وہ اپنے گھر والے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں۔

”اوہ مانی گاڈ۔“ ارسلہ کے سر پر چھت آ رہی۔

”اور جو یہاں بیچے اپنی ماں کے لیے کمراسجائے، ان کی پسند کے کپڑے خریدنے، انہیں نئے گم کی خوب صورت ڈیکوریشن اور سیننگ دکھانے کو بے چین تھے اور طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے۔۔۔“

بچوں پر ہونے والے تقدیر کے کاری دار نے ارسلہ کا دل بھی چھیدا تھا۔

”اللہ اپنا کرم کرے۔“ وہ کچھ دیر تک بیٹھ کر آگئی تھی مگر اس کا دل مسلسل کسی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

گھر آ کر ایک نئی خبر، نیا حکم اس کا منتظر تھا۔

”ارسلہ! تم کل آفس سے ریز ان کرو، بہت ہو گئی جاب۔ اب کچھ عرصہ گھر بیٹھو پھر میں تمہارا شادی کروں گا۔“

پاپا کے حکم پر وہ لب بستہ کھڑی رہ گئی تھی۔

یہ بھی نہ کہہ سکی کہ پاپا کسی کے کیسے کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔ اس نے آفس جانے کے بجائے فون پر شہر دو کوساری صورت حال بتا کر اپنی طرف سے ریز ان ٹاپ کر کے میڈم کو دینے کا تاکید کر دی تھی۔

☆☆☆

”بیٹے! اب تو وہ ملازمت چھوڑ چکی ہے۔“

”کچھ بھی ہو، میں کسی قیمت پر اس سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ پہلے بھی مجھے کبھی پسند نہیں رہی تھی اور اب تو اس کی بہن کے عظیم ترین کارنامے کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اسد پر تاپا اور تائی کی وضاحتوں، منتوں بلکہ دھمکیوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت اس رشتے کو برقرار رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ مجبوراً تاپا سجاد کو ضیاء صاحب کو صورت حال بتا کر معذرت کرنا پڑی۔ ان کے جھکے ہوئے کندھے مزید جھک گئے۔ ٹوٹا ہوا حوصلہ مزید ٹوٹ گیا۔ کم کم بات کرنے والا عادت مستقل خاموشی میں بدل گئی۔

ارسلہ نے بغیر کسی احتجاج یا اعتراض کے ان کا جاب چھوڑنے کا فیصلہ مان لیا تھا مگر اب اسے بے مقصد انداز میں گھر میں ادھر ادھر بولائے پھرتے دیکھتے تو مزید دلبرداشتہ ہو جاتے تھے۔

☆☆☆

”مس! پاپا آپ سے اوپر والا پورشن بھی ڈیکوریٹ کر دانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آپ کے آفس فون کیا تھا۔“ تابندہ کا فون آیا تھا۔

”بیٹے! اب میں یہ کام چھوڑ چکی ہوں، ریز ان کر چکی ہوں۔ تم بتاؤ، اپنی ماما کے چالیسویں برکتے

ارے پڑھے تھے۔“

”دوسپارے۔“ عانیہ نے ایک پڑھا تھا اور فریدوں نے پہلا سپارہ۔“ ان کی ماں کے انتقال کو دو ماہ زرخچے تھے۔ بچے یا وہ خود انہیں فون کرتی رہتی تھی۔ بچوں کو بالآخر اس ایسے کی خبر ہو گئی تھی۔ تدفین لٹان میں ہو گئی تھی۔

موبائل فون آف کر کے وہ پلٹی تو روشان کھلے دروازے سے اندر آ چکی تھی۔

”آؤ روشان! کیسے آنا ہوا؟“ اس نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ مخلص تو وہ آج بھی اس سے اسی رخ تھی مگر دونوں کے بیچ ایک نامحسوس سافا صلہ، تکلف اور گریز آچکا تھا۔

”میری نیناں سے بات ہوئی تھی فون پر۔ وہ بتا رہی تھی، اسد بھائی نے منگنی توڑ دی ہے جبکہ پاپا کو جاب چھڑوا کر گھر بٹھا چکے ہیں۔ میری وجہ سے ہوا نایہ سب کچھ۔“

”تمہاری وجہ سے نہیں، قسمت کی وجہ سے۔“ وہ جمل سے مسکرائی۔

”اور اسد بھائی تو یوں بھی مجھے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں تو بہانہ چاہیے تھا۔ رہی جاب کی تو سچی بات ہے، اب میں خود بھی اس بھاگ دوڑ سے ہلک چکی تھی۔ پاپا نے بھی کہتے تو چھوڑ دیتی۔“

”نہیں۔“ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

”اس سب کی ذمہ دار میں ہوں، میری کم ظرفی، میرا خود غرضانہ رویہ، میری ذلیل اور بچ حرکت۔۔۔ میں کیوں اتنی اندھی ہو گئی تھی۔ پاپا اور آپ اتنے عالی ظرف نکلے، میرے جھوٹ کو بھی نبھاتے ہیں، ان کی تدلیل آمیز حرکتیں اور باتیں برداشت کرتے رہے اور میں نے ان کے پیکاوے میں کر۔۔۔“

”اچانک وہ چھوٹ چھوٹ کر رو دی۔ شاید احساس جرم کے بوجھ سے پھیننے پراگئی تھی۔

”میں کہیں نہیں گئی تھی، کسی نے مجھے اغوا نہیں کیا تھا۔ میں ماموں کے گھر پر تھی اس دن۔ ان کے بپے پر بڑا رمدار چایا تھا۔“ ارسلہ کے اعصاب پر جیسے کوئی بم پھٹ گیا تھا۔

اس کی نہایت بے یقین نظریں اور ہوائیاں اڑتے چڑھنے کے تاثرات سوال کر رہے تھے۔ ”مگر بول؟“

”ماموں، ہممانی کا خیال تھا کہ پاپا مارے باندھے میری ضد کی وجہ سے ارمنان سے رشتہ کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں مگر ساری عمر اسے اور ماموں ہممانی کو وہ عزت و قدر دانی نہیں ملے گی جو بیٹی کے شوہر رسرالیوں کو میکے سے ملا کر ملی ہے۔ ارمنان ہمیشہ ان کا نمبر دو داما در ہے گا۔ پاپا سیدھے منہ بات کرنا ڈرائیں کیا کریں گے۔ وہ دل سے اس رشتے کو قبول نہیں کر رہے۔ کچھ ایسا کیا جائے کہ وہ از خود خوشی لیں اس بندھن کو جو ان کی خواہش کریں اور اسے قائم رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں۔ میں ایک آدھ دن کے لیے غائب ہو جاؤں گی اور پھر بازیاب ہوں گی تو ان کے دل میں قدر ہوگی کہ یکھاماموں، ہممانی اور ارمنان ہمارے ساتھ کتنے مخلص ہیں۔ اس حال میں بھی لڑکی کو قبولنے پر رضامند ما۔ اس طرح پاپا دل سے ان کی فیملی کو مقام اور محبت دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

وہ بول رہی تھی اور ارسلہ سانس روکے سن رہی تھی۔

”مجھ پر جانے کون سا کمینہ، خود غرض لمحہ حملہ آور ہوا تھا کہ میں نے ان کی بات مان لی۔ یہ تو شادی

کے وقت کھلا کہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔ مقام اور محبت نہیں بلکہ مال و دولت اور آسائشوں حصول کے لیے یہ گھٹیا حربہ اپنایا گیا۔ اس طرح ایک تو پایا کو نیچا دکھانے کا موقع مل گیا کہ ہم تمہاری ہوئی بدنام لڑکی کو گھر میں بسا رہے ہیں اور دوسرا بے دھڑک فرمائش منوانے اور خوب پیسہ بوزر موقع ہاتھ لگ گیا جو کہ ان کا اصل مقصد تھا جس سے میں انجان رہی تھی۔ ماموں ممائی میرے ہار پارٹنٹ میں رہتے ہیں۔ ارمنٹان نے یہ پارٹنٹ ماموں کے نام کر دیا ہے۔ گاڑی ارمنٹان کے ہے۔ پایا کے آفس میں مفت کی کھار ہا ہے بیٹھ کے۔ ٹمٹا بیٹھا کھیاں مارتا رہتا ہے یا کبھی موڈ ہو تو سے آفس ہی نہیں جاتا۔ مجھ پر بھی احسان کہ میں تو تمہارے باپ کے ہاں ملازموں کی طرح کام ہوں۔ تنگ آکر پایا نے اسے ملازمت سے نکالنے کو کہا ہے۔ ماموں ممائی مفت کی روٹیوں پر میز رہے ہیں۔ بیٹھے بٹھانے اتنا لکڑی پر پارٹنٹ نام ہو گیا۔ اس سے پہلے پنڈی کی تنگ گلیوں میں کرا کے دو کروں میں رُلتے تھے۔“ وہ خنی سے گویا تھی۔

”اب ایک مہربانی کرنا۔ اصل صورت حال پایا کو ہرگز مت بتانا۔ مجھے ڈر ہے کہ اصل صور حال جان کر کہیں وہ صدمے سے پاگل نہ ہو جائیں۔ بہت بری بیٹی کی مثال پیش کی ہے تم نے یہ قدم کرنا اتنا مان دینے والے باپ کی عزت کو سڑک پر روند دیا۔“

ارسلہ حقیقت جان کر از حد برگشتہ دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

”ویکم ہوم۔“ شہرہ ز نے سیاہ پھولدار سوٹ میں ملبوس خوش باش سی ارسلہ کو دیکھ کر بے اختیار اسے اٹھ کر شرارت کی تھی۔

”کسی مہربان کی فون کال پر پایا کچھ ایسے پگھلے کہ انہوں نے فوراً مجھے آڑو کر دیے۔ کل سے ان جوائن کرلو، اپنا ریزائن واپس لے لو۔“ وہ شوق سے مسکرا دی۔ وہ اس کی ٹیبل کے سامنے پڑی کر رہا جہان ہو چکی تھی۔

شہرہ ز کے ایک ایک انداز سے زندگی کی ترنگ اور تازگی چھلک رہی تھی۔ اسی نے فون کر کے بڑے طریقے سلیقے سے ضیاء صاحب کو قائل کر کے ارسلہ کو دوبارہ آفس جوائن کرنے کی اجازت دلوائی تھی۔ ارسلہ تو وہ اس ایک ماہ کی ”چھٹی“ کے دوران مسلسل رابطے میں رہا تھا۔ ہر معاملے سے آگاہ تھا۔

”میں نے بالآخر انہیں قائل کر ہی لیا کہ ایسے لوگوں کی خاطر جن کا اب ارسلہ کی زندگی میں رول بھی نہیں رہا۔ آپ اس کا بہترین کیریئر کیوں تباہ کر رہے ہیں۔ اتنا عرصہ قریب رہنے کے باوجود اگر وہ شخص آپ کی بیٹی کی طبیعت کو سمجھ نہیں سکا، اس سے کمزور مائز نہیں کر سکا تو پھر اس کی رائے پاپنہ پسند کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ لازمی تو نہیں ہے کہ اگر ایک اولاد آپ کے جذبات کو گھیس پچھائے آپ اس کی فرسٹریشن دوسری اولاد کے حقوق ضبط کر کے نکالیں۔ وہ سمجھ دار آدمی تھے۔ سمجھ گئے اور فوراً طور پر عمل بھی کر ڈالا جس کے ثبوت کے طور پر آج تم یہاں ہو۔“

”اچھا بھئی! مہربانی، شکریہ۔ اب یہ بتاؤ، کوئی نئی اسائنمنٹ ہے یا نہیں؟“

”وہی شاہ ہاؤس کی اپر اسٹوری کی ڈیکوریشن کرانی ہے۔ وہ پارٹی تمہارے علاوہ کسی دوسرے

نہ کر سائن کرانے پر آمادہ نہیں ہیں۔ کیا بات ہے کوئی چکر دوگر تو نہیں ہے۔“ تقریباً ایک ماہ بعد جب وہ اس اسائنمنٹ سے فارغ ہوئی تو سفیان شاہ نے بڑی بردباری اور گی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پروپوز کر ڈالا۔

”دیے تو مجھے یہ بات آپ کے فادر سے کہنی چاہیے تھی مگر چونکہ میرا پروپوزل ایک خاص قسم کا گراؤنڈ رکھتا ہے، اس لیے پہلے آپ کی طرف سے سپورٹ درکار ہے۔ میں بچے ہیں میرے۔ باہر تقریباً چھتیس سال ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گی۔ میری خواہش ہے کہ مجھے گھر کو آپ جیسی سچی ہوئی اور میچور لڑکی کا ساتھ ملے۔ آپ سوچ لیجیے گا اچھی طرح۔ اگر منظور ہو رہی خوش بختی لیکن کسی بھی حالت میں میرے دل میں آپ کی عزت اور وقار میں کمی ہرگز نہیں ہوگی۔“ وہ بے حد سچاؤ سے بڑے پیچور انداز میں نرمی سے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ وہ زمانے کی گردش پر غور کرنی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ بہت بری طرح جھڑکا تھا۔

ارسلہ نے تو یونہی بات کی تھی۔ سرسری سے انداز میں اس سے نئی پوزیشن شیئر کا تھی جیسا کہ وہ اس سے کرتی آئی تھی۔

”مجھے تمہارا غصہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے تو تمہیں صرف ایک بات بتائی ہے کہ سفیان شاہ نے اپنے اپنا پروپوزل پایا کے حضور پیش کیا ہے۔ پہلے انہوں نے مجھ سے اجازت مانگی تھی۔ میں نے ہاں دیا تو مجھے کرنی ہی ہے پھر روشان کی حرکت کی وجہ سے ہماری فیملی کو جو بدنامی اٹھانی پڑی اس بعد اس قسم کا پروپوزل کوئی اپنا مل بات بھی نہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی، اس میں اتنا۔۔۔“

”ہر بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے مگر جو سامنے کی بات ہو، وہ سمجھ میں نہیں آتی۔“ وہ بری طرح چڑ گیا۔

ارسلہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ”یہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟“

”تمہیں کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے، جاتے ہوئے موڈ کیوں آف کر رہے ہو۔ ناراضی کر سکتی کرتے۔“ اس نے اپنی طرف سے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”دروںے کہ بھی سفر نہیں کیا کرتے۔“ وہ اسے بری طرح گھور کر پیر پختا ہار نکل گیا تھا۔

”افو، خواہ مخواہ ناراض ہو گیا ہے۔ لو بتاؤ، اب دودن بعد لوٹے گا۔ اتنی دیر تک خواہ مخواہ ٹینشن میں رہے گا اور مجھے بھی یہاں پریشان رکھے گا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی سیٹ پر آئی۔ ایک کارڈ لفافے سے نکال رہا تھا۔

”ارسلہ۔۔۔“ یہی نیوایز کا کارڈ دیکھ کر اسے شہرہ ز کی مخلصانہ وابستگی پر بے ساختہ ناز ہونے لگا۔ ان ہر موقع پر وہ اسے یاد رکھتا تھا۔

”اچھا اس لیے کہہ رہا تھا کہ ابھی میری ٹیبل پر بیٹھو۔ جب میں نکل جاؤں، تب اپنی ٹیبل پر جانا۔“

”یاد رکھا۔“ اسے یاد دلاتا تھا۔

”تمہیں حیات کا حاصل سمجھ لیا ہے مگر

تمہیں ہم اپنا بنالیں، یہ دسترس بھی نہیں

بہت عزیز دوست۔

برسوں سے دل پر حکمران ساتھی۔

دل میں چھپے اس بھید کو آج میں تم پر عیاں کرنا چاہتا ہوں تاکہ کل یکم جنوری کو تمہارے افر پھولوں سے اپنی بقیہ ساری عمر مہکا لوں۔“

بہت سارے بیٹے پل آگے پیچھے اس کی نظروں میں دوڑتے چلے گئے۔ وہ جانے کتنی درہا ہی میں گم رہی۔

وہ قدم قدم پر سایہ بن کے ساتھ رہنا۔

ہر لمحہ خیال، توجہ، احساس، اپنائیت۔

روشان والے معاملے میں دن رات اپنا ہوش بھلا کر کی جانے والی کوششیں۔ ہر وہ بے ساختہ، بے اختیار اسی پر بھروسہ کرنی تھی، اسی کو بلاتی تھی۔

”اتنے برسوں سے گونگے کا گڑ کھا کے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے کیوں نہیں پھوٹے منہ اگلے ہی پل اس کے موبائل کا نمبر ملا کر اس سے جھگڑ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے بے وجہ اشا رہے تھے۔

”تم ممکنہ شدہ سب سے ملتی تھیں، کسی کی امانت تھیں، میں کیا کہتا اور کیسے کہتا؟“ وہ اسلام آباد باہر آچکا تھا اور نیکسلا کی طرف سفر کرتے ہوئے گاڑی کی اسپینڈ کم کر کے اس سے بات کر رہا تھا۔

”اور اب اظہار کا ارادہ باندھ کے تمہارے پاس آیا تھا کہ تم نے نئی زنجیریں دکھا دیں مجھے پہنا۔“

”کوئی زنجیر نہیں ہے۔“ وہ بے ساختہ رو دی تھی۔

”اے خبردار! یہ آنسو میری امانت ہیں۔ خبردار! جو انہیں اتنی بے دردی سے بہایا تو۔“

ایک اشک کا حساب لوں گا۔ فوراً پوچھو انہیں، ورنہ میں خود پہنچ جاؤں گا یہ نیک فریضہ سرانجام دینے شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

”کل آ جاؤ گے؟“ وہ آہستگی سے پوچھ رہی تھی۔ انداز میں عجب سی اپنائیت اور نئے نئے اقرار گھلا ہوا تھا۔

”کیوں؟ کل کہا ہے؟“

”کل ہماری زندگی کا نانو یلا سورج طلوع ہوگا۔“ وہ مان سے بولی۔

”ہاں، کل تو لازمی ہے مگر تمہارے پاس نہیں، تمہارے پایا کے پاس۔ اس التجا کے ساتھ کہ کے ساتھ ساتھ ایک ہفتے کے اندر نکاح بھی کر دیں۔ بھئی! ہم پتی مہر لگائیں گے آپ کے اوپر بارہ بجے پتی نیوایز کہنے کے لیے فون کروں گا، انتظار کرنا۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”ضرور۔“ ارسلہ نے بہت یقین کے ساتھ فون بند کیا تھا۔

☆☆☆

لو بہار آگئی

”ڈاکٹر کہاں ہے۔ ارے کوئی دولہا کی بہن کو ڈھونڈو۔“

اور مہندی کی تیاری کے لیے ہال سیٹ کرتے ہوئے لڑکیوں میں جس کی ڈھنڈیا بجی ہوئی تھی وہ کچھ بعد کے اس ٹائم میں پچھلے لان میں بوسیدہ سی آثار قدیمہ ٹائپ کرسی پر بیٹھی سکون سے تلیوں دل کو گلاب کے تختوں پر منڈلاتے دیکھ رہی تھی، یوں جیسے سرکس لگی ہو اور وہ اس کی واحد تماشا کی

”کہاں گئی؟ ابھی تو ادھر تھی۔ کہیں ہسپتال تو نہیں چلی گئی۔ اس پر ڈیوٹی ادا کرنے کا بھوت شدت رہتا ہے۔ دو ماہ ہوئے ہیں جو ان کے ہوئے اور ہم گھڑی بھر کی سلام دعا کو ترس گئے ہیں۔“

عالیہ، اس کی تایا زاد کرن تشویش و شرشی کا مظاہرہ بیک وقت کر رہی تھی۔

”لو بتاؤ بھلا۔ سگے بھائی کی شادی ہے اور وہ بھی چچا زاد بہن سے۔ اور اس کی لا پرواہی اور لی کا جواب نہیں ملتا۔ آج اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو۔۔۔“

اماں بی ان سب کی مشترکہ دادی، ٹھنڈی آہ بھر کر نہ جانے کیا داستان چھیڑ بیٹھی تھیں۔

”بابا ہوتے تو ہم یہاں اس شہر میں بھی نہ پائے جاتے۔۔۔“ اس نے ہال کمرے کی کھڑکی سے وازوں پر کان لپیٹ لیے تھے۔ حالانکہ یہ اس کی دوھیال تھی مگر بچپن سے جوانی تک اتنا کم آنا جانا کدو ڈھنگ سے اس وسیع و عریض گھر اور اس کے بے شمار یکمنوں سے متعارف بھی نہ ہو پائی تھی۔

بابا کلگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پروفیسر تھے سو اپنی موت تک بیوی بچوں کے ساتھ مستقل میں مقیم رہے تھے۔ اماں بی اور بابا جی کے پاس مہمانوں کی طرح سال میں ایک دو دن کے لیے لوٹے کر ملنے آ جاتے تھے۔ پھر جب زرتاب نے میڈیکل میں داخلہ لیا تو گویا یہ رسم بھی چھٹ گئی۔

لیا پڑھائی اور بس پڑھائی۔ زرتاب نے ایم بی بی ایس کے پانچ سال ایسی ہی تعلیم ”ہندو نصائح“ لراہ کر کیے تھے، اس دوران امی دل کے آپریشن میں زندگی ہار کر ان سے بہت دور چلی گئی تھیں۔

ان اس سے پانچ سال بڑا اس کا بھائی ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکہ جا رہا تھا۔

اور پھر آخری تازیانے کے طور پر بابا ایکسڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے۔ چھ ماہ پہلے کا وہ حادثہ اس نرلی کا عظیم ترین سانحہ تھا۔ رضوان امریکہ سے واپس آ گیا۔ اول اول تو وہ لاہور چھوڑ کر اماں بی کے

پاس آنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اسے اس گھر سے امی اور بابا کی خوشبو آتی تھی مگر پھر رضوان کے بچھانے اور اباجی کی شفقت و حلاوت پر ان کے ساتھ آگئی۔ لاہور میں اب اس کا تھا بھی کون، پہلے وہ اور رضوان یہاں آئے تھے۔ رضوان کی بات سن سے طے تھی۔ اماں بی نے اسے شادی بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ کیا خبر رضوان کا موڈ بدلتا اور وہ پردیس سدھار جاتا۔

اس کے قدموں کے لیے ”زنانی زنجیر“ کا اہتمام کرنا ضروری تھا۔ وہ تو زرتاب کو بھی لگام ڈالنے کے لیے بے تاب تھیں مگر وہ مان کر نہ دی۔ چونکہ اسے اباجی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے اماں بی اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس نے سرکاری ہیز میں جاب شروع کر دی تھی۔

”بات سنئے، آپ زرتاب ہیں؟ یا ان کو جانتی ہیں؟“ وہ بڑے دھیان سے ایک بھورے اور تلی کو تار بجی اور سرخ شیڈ کے تروتازہ گلاب پر پہلے کرنے کی جستجو کرتے دیکھ رہی تھی کہ عقب سے ایک تھکی تھکی سی آواز نے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سیاہ شلوار قمیض میں تھا۔ کام کی زیادتی نے کچھ بال بے ترتیبی سے پیشانی پر بکھرا دیے پاؤں میں سادہ چپل آستینیں کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی اور چہرے پر سنجیدگی کا تاثر۔

وہ یقیناً اسے نہیں پہچانتا تھا کہ وہ شازہ بی دن کے اوقات میں گھر میں پایا جاتا تھا۔ کہیں اس بڑی بھی ہوگی تو گھر کے کمینوں کے میل ملاپ کے لوگوں یا مہمانوں میں شمار کرتے ہوئے دھیان نہ تھی زحمت نہ کی تھی۔ لیکن زرتاب اسے دیکھ کر پہچان گئی تھی کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔ کافی سال پہلے جب رضوان اپنے والد کے ساتھ اس پرانے قصبے میں واقعی اپنی آبائی حویلی داد ادا دی سے ملنے گیا تھا تو اس نے واپس آ کر بہن کو بتایا تھا۔

”ارے بھئی زری! حویلی میں ایک عجیب و غریب کیریکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ مجھے تو ابھی بتا چلا۔ ورنہ یہ بات تو پرانی ہو چکی ہے۔“

”کون سی بات؟ ٹھیک طرح سے بتاؤ نا بھائی۔“

”تمہیں پتا ہے، ابو لوگ تین بھائی ہیں اور ان کی اکلوتی بہن طیبہ جنہیں ہم نے صرف تصویر میں دیکھا ہے انہیں پسند کی شادی کے جرم میں ہمیشہ کے لیے خاندان بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ بیاہ کر شہر آ گیا ایک بیٹا بھی ہوا۔ خاوند کی موت کے بعد کسی وجہ سے پھپھو گوشہ تنہائی میں چلی گئیں اور اسے بے نصیب نہایت منت سماجت کے بعد اباجی کے حوالے کر دیا۔ اباجی نے صرف اسی صورت میں اسے گھر میں قبول کیا ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا تعارف نہیں بنے گا بلکہ حویلی کے ملازمین کی طرح رہے گا۔ سو ہو رہا ہے۔ بے چارہ اسید ہا سادہ کم گو بندہ ہے، چچی اور تائی امی اور اماں جی کا رویہ خاصا سرد و پا ہے۔ اماں جی کہتی ہیں اسے دیکھ کر ان کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کے چال باز اور مکار باب ان کی پھولوں جیسی بیٹی کو کانٹوں پر رول دیا۔ کزنز نے بھی زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔ اصل میں وہ بندہ خود پس منظر میں رہنے کا عادی ہے۔ خاموش، تنہا اور بور، عباد بھائی کہتے ہیں صبح کی دو منٹ کی قربت بندہ کو حلق تک بے زار اور بور کر دیتی ہے۔“

اتفاق سے زرتاب جب بھی بابا کے ساتھ ایک آدھ دن کے لیے یہاں آئی اس سے براہ راست

فات نہ ہو سکی تھی اور اب جبکہ ہمیشہ کے لیے وہ یہاں آ چکی تھی تو عالیہ کی نشاندہی پر اس نے صبح کا اچھی جگہ جائزہ لے ڈالا تھا، تاہم اس کی گھر میں غیر اہم سی حیثیت کے پیش نظر کسی نے اسے متعارف نہیں دیا۔ سمجھو وہ خود بھی دوسروں سے میل ملاپ سے کتراتا تھا۔ وہ جھکی نظروں اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ کام ختم کرنے کے بعد کمرے میں بند ہو جاتا۔

”ہیں، وہ یہاں نہیں ہیں۔“

زرتاب نے اس کی کم علی سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ آرام سے جواب دے کر دوبارہ اپنے پسند مشغلے میں گم ہو گئی۔ بھورا نارنجی و سرخ شیڈ کے پھول پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تلی ابی رنگ کے پھول پر منڈلانے لگی۔

”کہاں مل سکیں گی؟ ہال میں سب انہیں ملارہے ہیں۔“ وہ تذبذب کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کافی دن ہو گئے تھے اس لڑکی کو گھر میں چلتے رہتے دیکھتے ہوئے۔ نہ کسی نے زحمت کی تھی اور نہ خود اس کی ہمت ہوئی تھی کسی سے پوچھنے کی کہ آخر وہ رشتے سے اتنے استحقاق سے یہاں رہ رہی ہے۔

وہ بہت سکون سے پھولوں کے تختے پر نظریں جمائے خدا جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس سے لے کر زرتاب کوئی جواب دیتی پیچھے سے عالیہ کی جھنجھلائی آواز کان پڑی۔

”زرتاب! جد ہو گئی بھئی، تم یہاں بیٹھی ہو؟ پورا گھر چھان مارا ہم نے۔“

”میں آ رہی تھی۔“ وہ دھیرے سے کہہ کر فصیح کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اگلے ہی لمحے شرمندگی میں بگئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ صبح کی شاکی نظر نے اسے تادم کر ڈالا تھا۔ وہ مڑا اور

رک کی طرف بڑھ گیا۔

عالیہ نل اسپینڈ میں اسے ملامت کر رہی تھی۔

”اکھوتے بھائی کی شادی اور اتنی بدولی۔ تو بہ ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ منمننا کر صفائیاں دینے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ صبح سے ملے بلے بھی تو ر

فان دی اور شکناں دی مہندی والے گانوں کی کورس میں پریکٹس سن کر وہ نیم پاگل ہو گئی تھی۔ لڑکیاں

فانلے کے لیے ہر خاں پر قابو پانا چاہتی تھیں اس لیے بار بار گلے پھاڑے جارہے تھے۔

”چل کر تیار ہو جاؤ، اماں بی نے اپنی پسند سے تمہارا جوڑا بنایا ہے۔ انہیں پتا تھا کہ تم پر چھوڑا تو اٹھا

وگ پھر کوئی کائن، فلائین۔“

وہ عالیہ کے ساتھ چلتی ہوئی سعادت مندی سے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن رہی تھی۔ دوستی اس اسٹیج پر

لی جہاں اطراف سے برسنے والے پتھر بھی پھول سمجھ کر وصول کیے جاتے ہیں۔

”جیسے باقی کزن ہیں وہ بھی ان ہی کی طرح تھا۔ مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس کا

ماس دل فصیح کی شاکی نظروں میں الجھ گیا۔

”اماں بی! آپ جانتی ہیں میں گھریلو معاملات میں بالکل اناڑی ہوں، اور پھر آپ سب جو ہیں

نظامات سنبھالنے والے۔“

وہ سچ سے اماں بی کی ڈھیروں ناراضی کے جواب میں انہیں رام کر رہی تھی اور یہ سچ بھی تو اتحاد اور

ابا جی اپنی ساری توانائیاں رضوان کی شادی میں خرچ کر رہے تھے۔ رضوان گھر بھر کا پسندیدہ تھا۔ وہ اٹھ کر چچی کے پورشن میں آگئی۔ شرمائی لجائی سمن کے چہرے پر رنگوں کی بہار چھائی ہوئی تھی وہ خود کو فضاؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ زرتاب سے کرید کرید کر رضوان کی باتیں پوچھتی اور رہی، وہ واپس مرکزی پورشن یعنی ہال کی طرف آگئی۔

”کب آئیں گے کیئرنگ سروس والے، آرڈر بھی دیا تھا یا یونہی ہوا میں تیر چلا آئے ہو۔۔۔“ چچی کے بڑے سپوت اور گھر کی سیکنڈ ان کمانڈ عباد بھائی درستی سے فصیح سے مخاطب تھے۔ وہ کم بھی اس سے نرمی سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ نہ جانے کیا پر خاش تھی کہ مخاطب ہوتے ہوئے ان کا لہجہ خود بخود درخونت و خشونت سے لتھر جاتا تھا۔

”جب کہا ہے تو آ بھی جائیں گے۔ آپ تسلی رکھیے عباد بھائی!“ نہ جانے کیوں زرتاب سے رہا نہ گیا۔ اس نے دیکھا فصیح سیکر خاموش تھا نہ تائید نہ تردید، اس کی خاموشی نے زرتاب کو بولنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسے عباد بھائی کا فرعون لہجہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ”اچھا! اور اگر موصوف بھول گئے ہوں تو؟“ اس کے دفاعی لہجے نے عباد بھائی کو چونکا دیا، ایک گہری نگاہ اس پر ڈال کر لہجہ بدل کر سوال کرنے لگے۔ ”میں اپنے کام اور اپنی اوقات نہیں بھولتا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“ وہ اسے مشکل میں پھنسا دیا کہ جواب بولا۔ لہجہ بڑے سکون اور دھیمہ تھا۔

اسی لمحے تصویر نے کیئرنگ سروس کے بھیجے ہوئے بندوں کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اللہ کا بندہ ”دیکھ میں نہ کہتا تھا۔“ قسم کا کوئی بھی جتنا تامل ہوا جملہ بولے بغیر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

”اسے اس کی اوقات یاد کرتے رہنا چاہیے۔ باغی ماں کی نشانی ہو نہ۔“ عباد بھائی نخوت سے ہر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

زرتاب کے قدم زمین نے جکڑ لیے۔

گھر بھر کے روتیوں نے بتا دیا تھا کہ فصیح کو ملازم سے کچھ ہی اوپر کا درجہ دیا گیا ہے اور اب اس کی یہی انداز اپنانے چاہئیں۔ خاندانی روایات کے مطابق۔

☆☆☆

شادی کے پانچویں دن ولیمہ ہوا۔ تائی کے لاڈلے سپوت خرم بھائی، ان کی بیگم اور چھوٹا بچہ یام سعودیہ میں تھے۔ یام سر پر پگ کلاس کے پرچے دے رہا تھا اس وجہ سے وہ شادی پر نہیں آسکے تھے۔ البتہ ولیمے پر ان کی شمولیت یقینی بنانے کے لیے تاریخ آگے بڑھا دی گئی تھی۔ پرسوں اس کے امتحان ختم ہوئے تھے اور آج وہ لوگ پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ولیمے کی تقریب گھر میں ہی منعقد کی گئی تھی۔

مہمان دو پہر کے کھانے پہ بلائے گئے تھے اور شام کی چائے کے بعد واپس بھیجے جانے تھے۔

”زرتاب بی بی! آپ اس وقت بھی ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو جا کر نوں سن لیجیے۔“ وہ شامیانے کے نیچے کھانے کی میزوں کے آس پاس منڈلاتے لوگوں کو بے دھیانی کے عالم میں دیکھ رہی تھی جب پشت کی طرف سے سادہ سا لہجہ کان پڑا۔ وہ مڑی۔

”صبح کے ایک ہاتھ میں بھنے ہوئے مرغ کی ٹرے تھی جسے وہ قریبی میز رکھ رہا تھا۔ مہندی سے

”اس لیے کہ گھر میں زمینوں کا حساب کتاب رکھنے کے لیے منشی کی ضرورت تھی۔“

”زمینیں کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھیں۔“ اس نے ڈانٹنے والے انداز میں اسے دیکھا۔ ”پڑھائی مکمل کرنے کے بعد بھی یہ کام سنبھالا جاسکتا تھا۔“

”اور کسی کو نہ سہی مجھے خود کو تو پالنا تھا۔ یہ دھیان میں رہے کہ مجھے اپنے اس ننھیالی محل میں صرف نام اور کمرے کی پناہ دی گئی ہے۔ ناتاجان میرا تعارف اپنے قریبی عزیز کے بیٹے کے طور پر کراتے ہیں جسے لاوارث جان کر ازراہ ہمدردی گھر میں جگہ دے دی۔“

اس کا لہجہ بالکل ہموار، سیدھا اور پرسکون تھا۔ وہ لب بستہ کھڑی رہ گئی۔

”آپ کب تک واپس آئیں گی؟“ حالانکہ اس قسم کے حسابات رکھنا گھر کی عمر خواتین یا ذمہ دار افراد کی ہالی تھی۔ پھر وہ کس ناتے اور کس کھوج میں دریافت کر رہا تھا۔

”شاید شام کے چھ سات بجے تک کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

وہ تقریباً سات بجے گھر پہنچی تھی۔ خلاف معمول گھر میں سناٹا تھا۔ ”کیا دلیسے کی تقریب اتنی جلدی نپٹ گئی؟“ اس نے گیٹ پر کھڑے ملازم سے دریافت کیا۔ پتا چلا دو لہا دو لہن اور دیگر مہمان دلیسے سے نپٹ کر چچی کے میکے میں دعوت پر گئے ہیں، یوں بھی ولیہ ایک ہفتے بعد ہوا تھا۔ رشتہ داروں کو اپنی دعوتیں بنانے کی جلدی تھی۔ رضوان کو واپس امریکہ جانا تھا کہ اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ آپ کے لیے اماں بی کا پیغام ہے کہ تیار ہو کر فوراً دھر پہنچ جائیں۔“

وہ نیم دلی سے سر ہلا کر مرکزی پورشن کی طرف آگئی۔ سنگ روم میں ساٹھ واٹ کا ملگجا سابلب روشن تھا۔ گھر کی زیادہ تر لائٹس آف تھیں، سنگ روم اور چکن ملحقہ تھا۔ چھ کرسیوں کی میز، صوفہ کم بیڈ، ایڑی چیئر اور صوفہ چیئر کے علاوہ فرنیچر اور ڈیپ فریزر بھی یہیں سیٹ کیے گئے تھے۔ کوکنگ رینج کے دائیں بائیں وسیع و عریض کاؤنٹر تھا اور عین اوپر کراکری کے لیے خلیف بنائے گئے تھے۔

وہ تھکی ہاری آتے ہی صوفہ کم بیڈ پر گر گئی۔ پوٹے ملتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ کھینچ کر ایڑی چیئر پر اچھالا، پھر سفید اڈول آل اتار کر ایک طرف ڈالا اور جسم کا کھنچاؤ دور کرنے کے لیے ایک بھر پورا انگڑائی لے کر دھم سے صوفے پر دراز ہو گئی۔

”چچی کے میکے جانا تو پڑے گا۔“ وہ ارد گرد کے ماحول پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کسل مندی سے سوچ رہی تھی۔ وہی تصنع، جبری مسکراہٹ اور پُر تکلف گپ شپ۔ اس کا جی اوب گیا۔ یوں ہی سامنے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے جیسے اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ کوکنگ رینج کے پاس کھڑا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور جھپٹ کر دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”کیا میں اندھی ہو گئی تھی کہ چھٹ کا بندہ کھڑا نظر نہ آیا۔“ اس کا چہرہ تپ کر سرخ انار ہو گیا تھا اور خجالت کہتی تھی زمین شق ہو تو اس میں سما جاؤ۔

”چائے پیئیں گی آپ؟“ وہ بڑے سکون سے کہہ رہا تھا۔

”اتفاقاً ہی دو کپ بن گئے۔ لیجئے نا۔“ وہ اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے دانستہ انجان بن رہا تھا۔ نظر بھی منطاق اور چھکی ہوئی تھی، مگر زرتاب کی بدحواسی کم نہ ہوئی۔ یہ میرا بیڈ روم تو نہیں تھا جو بلا جھجک آکر گر گئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مجھے اطمینان کر لینا چاہیے تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔

”کس چیز کی ڈاکٹر ہیں آپ؟“ وہ اس کے مقابل صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا۔

”عام سی ڈاکٹر ہوں۔ اسپیشلائز نہیں کیا ابھی۔“ اس نے کپ تھام کر کھنکی نظروں سے بھاپ اڑائی چائے پر نگاہ جمادی۔ لہجہ بہت ہی مدہم اور کترایا ہوا تھا۔

”آپ آن ایزی میل نہ کریں۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ مہمانوں کی بہتات کے باعث آج کل میرا ٹھکانا یہیں ہوتا ہے۔ اس لیے جب غلطی دونوں میں سے کسی کی نہیں ہے تو شرمساری کیوں؟ ہم کوئی اور بات کیوں نہ کریں اچھی سی۔ آپ کس میں اسپیشلائز کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟“ اس کا انداز اتنا رسانیت لیے ہوئے تھا کہ زرتاب کے کھنچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔

”ابھی سوچا نہیں ہے۔“ وہ چائے پینے لگی۔

”دل کے امراض میں کر لیں۔“ زرتاب نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

”مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اور آل اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے، آپ تو خفا ہو گئیں اور چائے بھی نہیں پی۔“ اس نے اس کا کپ دیکھا جو آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔

”میں خفا نہیں ہوں۔ تھکی ہوئی ہوں اور پھر ابھی چچی کے میکے بھی جانا ہے۔“ وہ بے دلی سے قدم بڑھانے لگی۔

”اگر آپ کا دل نہیں چاہ رہا تو مت جائیں۔“

”بہت سے کام ہیں دل کی مرضی اور اجازت کے بغیر کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ مڑ کر ایک لکھلکے کو مسکرائی اور پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”زندگی کی سب سے خوب صورت حقیقت شادی ہے۔ مجھے تو اپنی اب تک گزری زندگی بے کار لگ رہی ہے۔ اصل رشتہ اور لطف تو شوہر کے دم سے ہے۔ دو ہفتوں میں ہی رضوان زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے ہیں۔ میری مانو تو تم لوگ بھی شادی کر لو اب۔“

”تو اچی منٹا نہیں رہنے دے۔“ سدا کی منہ پھٹ عالیہ نے براؤن نقشی اور موتیوں کے کام سے بوجھل شرارے میں ملبوس سمن کو ایک جملے میں بھگتا دیا۔

سمن کے اٹھتے بیٹھتے شوہر اور شادی کے فوائد و اہمیت پر دیے گئے لیکچر نے انہیں حلق تک بے زار کر دیا تھا۔ زرتاب تو پھر لچلچلا میں چپ رہتی تھی، مگر عالیہ صاف منہ پر کہہ دیتی تھی۔

سمن بے چاری بھی کیا کرتی زندگی میں پہلی مرتبہ خاندان والوں کے سامنے اہمیت ملی تھی۔ ڈیگیں مارنا اس کا حق بننا تھا۔

”اسے اس کے حال پر چھوڑ دو یہ ان دنوں ہوش کھوئے ہوئے ہے۔ شروع میں تو شب کو ہی خمار چڑھا ہوتا ہے۔ بعد میں پتا لگتا ہے آٹے دال کے بھاؤ کا۔ آغاز جانم جانو اور ڈارلنگ سے ہوتا ہے اور انتقام احمق، بے وقوف عورت، مصیبت اور جان کی دشمن سے۔“ عالیہ استہزائیہ انداز میں زرتاب سے غائب ہوئی۔

شادی کیا ہوئی تھی سمن نانس پر چاڑھی تھی شنی دکھانے میں تو پہلے بھی کم نہیں تھی اب اور دھار لگ گئی تھی۔ مہارانی بنی سب کی دعوتیں بھگتا رہی تھی۔ چال میں خمر، انداز میں غرور و ناز، لہجے میں احساس برتری اور آواز میں نخوت رقص کرتی تھی امریکہ پلٹ خوبرو و جوان مرد بیاد کئے لایا تھا آخر کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ (اس کے نزدیک)

عالیہ اس کی شوخی و طراری پہ ہنسا کرتی تھی۔

”غریب کو پہلی مرتبہ کوئی نشان امتیاز ملا ہے۔ اب بھی بڑھکیں نہ مارے بھلا، ویسے تو معاذ اللہ ہر میدان میں صفر بانی صفر رہی ہیں۔ ایف اے میں شاندار نمبروں سے ٹپل، گھریلو معاملات میں اناڑی اور اب ایک دم اتنی خاص ہو گئی ہے۔ خاوند کا لاڈ پیار ابا کی ناز برداریاں نئی دہلی ہونے کے ناتے رشتہ داروں اور جاننے والوں کا ملنے کے لیے اشتیاق۔ اس کے لیے بدلی ہوئی فضا جنت سے کم نہیں ہے۔ تب ہی تو اپنے سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ اتر آئے گی تھوڑے دنوں میں خواہوں کے آسمان سے۔ دہلی دہائی گھریلو لڑکیاں شادی کے شروع کے دنوں میں اکثر مارے خوشی کے آپے میں نہیں رہا کرتیں۔ بڑی عام سی بات ہے یہ۔“

عالیہ ایسی ہی تھی۔ سدا کی صاف گو۔ حالانکہ مزاجاً زرتاب بھی اسی جیسی تھی لیکن وہ ظاہری اعتبار سے عالیہ سے مختلف تھی۔ بولنے سے پہلے تو لے کے کلیے پر کار بند رہتی تھی۔ وہ اس بات کی قائل تھی کہ انسان کو موقع محل دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ بے موقع کی صاف گوئی بد الحاشی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ کچھ وہ فطرتاً بھی نرم دل، مصلحت کوش اور امن پسند لڑکی واقع ہوئی تھی۔

”سمن ڈیر! تم اپنی خوشی میں مست رہو۔ ہماری فکر چھوڑو۔ شادی ایک دن سب کی ہونی ہے۔ کچھ کی جلدی ہو جاتی ہے کچھ کی دیر میں اس میں اتنا اتلاؤ لا ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا اور اگر تم خواہو اور بار بار ہماری شادیوں کا ذکر کر کے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی ہو تو اطلاع عرض ہے کہ کم از کم مجھے اور زری کو تم جذباتی چند اڈال کر شکار نہیں کر سکو گی۔ ہم دونوں اپنی ایک واضح شناخت پا چکے ہیں، زندگی میں اک مقام، ایک نام رکھتے ہیں اور اپنا آپ منوانے یا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے شوہر کے نام کی ضرورت نہیں ہے۔“

عالیہ کے دونوں جواب پر سمن بلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیسی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ میں ایسا تھوڑی بھگتی ہوں۔“

”تو پھر یہ بہانے بہانے سے اپنی خوش گوار و دوامان پرور زندگی کی جھک دکھلا کر ہماری بردقت شادیوں کا تذکرہ کرنے اور پردہ پردہ ہم پر ترس کھانے کی روٹین بند کرو۔ انسانوں کی طرح رہو۔ جذب برداشت بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔ اتنا سامرتبہ ہضم نہ ہوا، نیویارک جاؤ گی تو شاید ہمیں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھنے لگو۔“ اس کے بھڑکنے کا عالیہ پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس کا لہجہ بے نیازی لیے ہوئے تھا۔ سمن تلملا کر پیر پٹنے لگی۔

”زری! دیکھ رہی ہو اپنی لاڈلی دوست کے تیور۔ جلتی ہے یہ مجھ سے ہونہر۔“ جب عالیہ کے منہ کو نہ اسکی توند کی امداد طلب کر لی۔ زرتاب بیچ میں پھنس کر رہ گئی۔

”عالیہ تمہاری بھی دوست اور کزن ہے۔ چلو دونوں سیز فائر کر لو عالیہ! تم تو شاید اپنا لیکچر تیار کرنے جا رہی تھیں۔۔۔“

عالیہ مقامی کالج میں لیکچرار تھی۔ زرتاب نے کسی طرح معاملہ رفع دفع کر ادا کیا۔

رضوان آج کل ویزے کے چکروں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد واپس جا رہا تھا۔ فی الوقت سمن کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی اسٹڈیز مکمل ہونے میں چھ ماہ باقی تھے پھر اس کے بعد جاب ڈھونڈنے اور سیٹل ہونے میں مزید وقت لگتا۔ رضوان نے فیصلہ کیا تھا کہ سمن کو ایک سال بعد اپنے پاس نیویارک بلائے گا تاکہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرنا اس کے لیے مشکل نہ رہے۔ سب بڑے اس کی تجویز پر متفق تھے۔ یوں بھی خاندان میں اکثر ایسا ہوتا آیا تھا۔ بیویاں پاکستان میں شوہر کی اولاد اور گھر سنبھالتی تھیں اور مرد مل ایٹ یا امریکہ میں کمائی کرتے تھے۔ سال میں ایک دوسرے پاکستان آ جاتے تھے یہ فیصلہ سمن پر بچی بن کر گرا۔ وہ رضوان کی بری طرح عادی ہو چکی تھی اب اس کے لیے اس کی محبت، اس کی قربت سے دور رہنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ رورو کروہ آدھی ہو گئی مگر رضوان کی بھی مجبوری تھی۔

”یار! تم پہلے بھی تو رہتی تھیں نا۔ اب کیا انوکھی بات ہو گئی۔“ رضوان اس کے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دیتا۔ ”پہلے کی بات اور تھی، مجھے اپنی محبت کا عادی بنا کر اب چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“

”مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔ تم سے بچھڑنا میرے لیے بھی امتحان سے کم نہیں ہے۔ مگر مجبوری ہے ڈارلنگ! اچھے مستقبل کے لیے کچھ قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں نا۔ میں چاہتا ہوں جب تم نیویارک میں اپنے گھر میں قدم رکھو تو تمہارے پاس زندگی کی ہر ضروری سہولت موجود ہو۔“

جانے والوں کو جانا ہی ہوتا ہے۔ لاکھ دلجوئی کے باوجود کم وقت رخصت بلک پڑی۔

زرتاب بھی اپنے دل میں اداسی محسوس کر رہی تھی۔ ماں باپ کے بعد وہی اک مضبوط ترین رشتہ رہ گیا تھا اور اب وہ بھی ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

رضوان کی دن کی فلائٹ تھی، اتفاق سے زرتاب کی بھی صبح کی ڈیوٹی تھی مگر رضوان کو اللہ حافظ کہنے کے لیے اس نے اپنی ڈیوٹی اپنی ساتھی ڈاکٹر طوبی سے بدل لی تھی۔ اب اسے شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک ڈیوٹی دینا تھی۔

☆☆☆

”کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔!“

وہ حسب معمول پچھلے صحن میں پھولوں کی باڑھ پہ پھنوروں کا قصص انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ عباد بھائی ادھر نکل آئے۔

”کچھ نہیں عباد بھائی! یونی اندر بیٹھی بور ہو رہی تھی تو ادھر آ گئی۔ عالیہ ابھی تک کالج سے نہیں لوٹی اور میرا ڈے آف ہے، اس لیے گھر پر نظر آ رہی ہوں۔“

”سرکاری ہسپتال کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کسی چوڑی ڈیوٹیاں نہیں بھگتانی پڑتی۔ نہ بے وجہ پریشاںز ہوتا ہے بندہ۔ پرائیویٹ ہسپتال کے ڈاکٹر زکو زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”یہ بات نہیں ہے، جاب بہر حال جاب ہوتی ہے۔“

”مستقبل کی کیا پلاننگ ہے تمہاری؟“

”کچھ نہیں اسپیشلائز کر دوں گی اور اس کے بعد ظاہر ہے اپنا کلینک سیٹ کرنے کا انتظام کر دوں گی۔“

”عباد بھائی کچھ دیر تک اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے۔“

”باہر چلو گی سیر کرنے۔“

”ضرور چلوں گی، مگر اس وقت یہ آفر دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ ان کی عجیب و غریب آواز پر حیران رہ گئی تھی۔

”ہر بات کی وجہ سمجھ میں آنے لگے تو کوئی مشکل مشکل نہ رہے بہر حال آؤ۔۔۔“

”کچھ دیر انتظار کر لیں عباد بھائی! عالیہ بھی آتی ہوگی۔ مل کے چلتے ہیں بلکہ آپ اپنی بہن سمن سے بھی پوچھ لیجیے۔ اس کا دل بھی بہل جائے گا۔“

”میں نے سب کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔“ وہ بے طرح چڑ گئے۔ ”آخر تمہیں دے رہا ہوں سارے ٹبر کو نہیں کہ اٹھ کر ساتھ چل دیں۔“

زرتاب کو عجیب سا محسوس ہوا۔

بچا کے یہ بیٹے مزاج میں بھی تو لہکھی ماشکی حیثیت سے مشہور تھے۔

آج کل گھر میں ان کی شادی کے تذکرے چل رہے تھے۔

زمینوں کا کام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا اور اباجی کے دست راست کی حیثیت سے مشہور تھے۔

☆☆☆

”عالیہ! ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ وارڈ روب سے ٹائیٹ سوٹ نکالتے ہوئے عالیہ سے مخاطب ہوئی۔

”عالیہ! اور وہ ایک ہی بیڈروم میں سوتے تھے۔“

”یہ فصیح کی امی یعنی ہماری پھوپھی آج کل کہاں ہوتی ہیں اور اگر چیچ زندہ ہیں تو فصیح کو اپنے ساتھ شہر کیوں نہیں لے جاتیں۔ مجھے اس شخص کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ وہ عمر جو کچھ بننے کچھ کر دکھانے کی

ہوتی ہے وہ یہاں غلامی میں تباہ کر رہا ہے۔ تیرے میرے کے احکامات کے پیچھے بھاگنا، گھر کا سودا سلف، زمینوں کا حساب کتاب، ٹوٹی چیزوں کی مرمت کرنا اور آئے گئے کا خیال کرنا۔ یہ کام اس پرزید نہیں دیتے۔ اتنا توانا اتنا بھرپور جوان آدمی ہے۔ اس عمر کے مرد تو تعلیم سے فراغت پا کر کسی اچھی نوکری کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے ہیں اور یہ ابھی تک بی اے کے پیپر ز بھی نہیں دے سکا اور نہ ہی

غالباً اسے اس بارے میں سوچنے کی فرصت ہے۔“

”ارے بابا! کیسے سوچے اس کے کام دھندے ختم ہوں تب نا۔“

عالیہ اگلے دن کے لیے الگش لٹریچر کا لیکچر تیار کر رہی تھی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی ہوئی تھی۔

”مگر گھر والے تو اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں نا! اباجی، اماں جی، اس کے نانا نانی ہیں وہ بھی سکے۔ ان کا فرض بنتا ہے کہ اپنے لاوارث نواسے کے اچھے مستقبل کے لیے اس کی چی

مت میں رہنمائی کریں۔ اسے دوسرے درجے کے افراد کی طرح ذلیل مت کریں۔“

”تم اپنا ننھا سا دماغ اس مسئلے پر مت کھپاؤ میڈم! یہ بڑے گجھک اور پیچیدہ مسائل ہیں۔ اماں جی اور اباجی اس مسئلے پر کسی کی بات سننے کے روادار نہیں ہیں۔ دیکھتی نہیں ہوں دونوں کے رویے فصیح سے کس

قدرت خیر آمیز ہوتے ہیں۔ اماں جی تو صاف کہتی ہیں کہ اسے دیکھ کر اپنی بیٹی کی بربادی کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے اور اباجی کا بس چلے تو اس کا خون پی جائیں۔ تم دیکھیں نہیں کہ جان بوجھ کر اس سے کیا

سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے اس کے باپ کے گناہوں کی سزا دینے کے لیے۔“

عالیہ نے کتاب کا دوسرا صفحہ پلٹا۔

”مگر کیا جرم ہے اس کے باپ کا۔ یہی نا کہ اباجی کی بیٹی اس کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور ایسی دیوانی ہو گئی کہ اسے پانے کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اباجی نے کہا تھا اسے چھوڑ دیا مجھے چھوڑ دو اور

یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ بیٹی نے محبت پانے کے لیے باپ کو چھوڑ دیا اور یہاں سے بہت دور چلی گئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد فصیح کا باپ مر گیا اور طیبہ پھپھو منت سماجت کر کے فصیح کو اباجی کے سپرد کر کے خود روپوش ہو گئیں۔ اس سارے قصے میں فصیح کا کیا تصور نکلتا ہے۔ اباجی اور اماں جی کو طیبہ پھپھو سے شکایت

ہوتی چاہیے نہ کہ فصیح اور اس کے مرحوم باپ سے۔“

”اس کی وجہ کیا ہے یہ تو میں نہیں جانتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس گھر میں اس موضوع پر بات کرنا سخت ممنوع ہے۔ وہ طیبہ پھپھو کا حوالہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ندامی اور چچی پسند کرتی ہیں اور عباد

بھائی کا تو تمہیں پتا ہے انہیں تو یوں بھی فصیح سے اینٹ کتے کا بیر رہتا ہے۔“

”مگر یہ غلط ہے عالیہ! جو کچھ بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔ فصیح بے قصور اور غیر جانبدار ہے اس معاملے میں۔ اس کی زندگی کا کیریئر بیڑ تباہ کر کے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی جا رہی ہے۔ اس

زیادتی کا کوئی ازالہ ہونا چاہیے۔“

”مثلاً کیا؟“ عالیہ غور سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”ہماری آنکھوں کے سامنے ایک شخص کا مستقبل دم توڑ رہا ہے عالیہ! کیا ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹھٹھنے لگی۔

”کیا مدد کرو گی اس کی؟ کیا اپنے ہسپتال میں وارڈ بوائے لگوادو گی! کیا کر دو گی۔ ایک بندہ جس کا لپا سے بھی مکمل نہیں ہے اور جس کے پاس کوئی ہنریافن بھی نہیں ہے اسے تم کہاں اور کس شعبے میں فٹ کر

سکو گی۔“

”کچھ نہ کچھ تو بہر حال کروں گی۔“ وہ دل ہی دل میں اپنا ارادہ مضبوط کر رہی تھی۔

”مگر کس ناتے سے؟“ عالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”انسانیت کے ناتے سے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

☆☆☆

”فصیح! ادھر آؤ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔“

زرتاب نے پچھلے کھن میں پیڑ کے پاس کھڑے انہماک سے کچھ سوچتے فصیح کو اپنے پاس بلا یا تھا۔

”میں اس پیڑ کے مرجھائے ہوئے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔“

”کبھی اپنی مرجھائی ہوئی زندگی پر بھی غور کیا ہے۔“ زرتاب کا لہجہ تیز اور ناراض تھا۔
”صبح نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہم سمسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔“

”زندگی جیسی قیمتی چیز یوں بے کار گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ آزمائش کے لیے دی گئی ہے
ہر ایک کو اپنی اپنی توفیق اور استطاعت کے مطابق اس آزمائش پر پورا اترنا ہوتا ہے۔ پھر تم کنارے
کیوں کھڑے ہوا بھی تک۔ پار اترنے کے لیے چھلانگ کیوں نہیں لگاتے کیا سوچ کر خاموشی تان
بیٹھے ہو۔“

وہ اس کی ٹھیک ٹھاک کھچائی کرنے کے موڈ میں تھی۔

”میری خاموشی ہی میری عافیت ہے، زرتاب بی بی! کاش آپ سمجھ سکیں۔“ وہ کہیں دور دیکھ
تھا۔

”میری مثال اس قیدی پرندے کی سی ہے جس نے خود کو باور کرایا ہے کہ اس کے پر ہی نہیں
کہ وہ اڑ سکے۔ اسی لیے وہ اپنے سالم پروں کو پھڑ پھڑانے کا رسک نہیں لیتا۔ مبادا ایسا کرنے کے بعد
اڑ ان بھرنے کو جی چل اٹھے اور وہ بے قابو ہو جائے۔ انسان جب تک صبر کرتا ہے، سکھ میں رہتا ہے
صبر چھوڑ دو تو ایسی تڑپ جاگتی ہے کہ ایک ایک لمحہ گڑا رن عذاب بن جاتا ہے۔ اور میں اس عذاب میں
کو مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔“

زرتاب دم بخور رہ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی وہ سطحی سوچ رکھتا ہے، گہرائیاں ناپنے کا فن نہیں جانتا
وہ تو جانے زندگی کی کن پہنائیوں میں اتر کے سطح پر آیا تھا۔

”جب اتنا سمجھتے ہو تو یہ بھی مان لو کہ انسان ڈوبے یا تیرے اسے رسک تو بہر حال لینا ہی
ہے۔ بھلا کنارے پر کھڑے ہو کر کب تک دریا کا بہاؤ دیکھتے رہو گے۔ لہریں گتے رہو گے۔“

”آپ مجھے یہ سہانی نصیحتیں نہ کریں زرتاب بی بی! زندگی کے بارے میں سوچنا اور اسے خوش
زاویے سے دیکھنا آپ کے لیے آسان ہے مگر میرے لیے از حد مشکل ہے۔ آپ کا دماغ آزاد
میری سوچیں بندھی ہوئی ہیں۔ آپ کے خیالوں پر کسی کا پہرہ نہیں میری ہر سانس مشروط ہے۔“ وہ ہونہ
چبارہا تھا۔

زرتاب مضطرب نہ ہوا تھا ملنے لگی۔

”آپ تو بس اچھی اچھی باتیں کیا کریں۔ اپنے جیسی نرم اور میٹھی۔“ یک لخت وہ کھل کر مسکرا
اور بغور اس کی صورت دیکھنے لگا۔

”تم سے کس نے کہا میں بہت نرم ہوں۔ ارے میں تو بڑی سخت اور روکھی پھسکی سی لڑکی ہوں۔“
”کس نے کہا۔“ وہ بے اختیار بولا۔ ”میری نگاہ اور دل تو ایسا نہیں کہتے۔“ باقی جملہ دل میں
کیا۔

زرتاب کو اس کی خود پر جی چمکتی ہوئی نگاہوں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

”ایک بات کہوں زرتاب بی بی؟“ وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

”ماں کا کردار بہت فیئر ہونا چاہیے۔ ایک عورت کو اپنا وقار، اپنی عزت اور اپنے شفاف کردار کا
زیادہ خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس پر دھبہ پڑے گا تو آنے والی نسلوں کا غرور و فخر بھی اس سیاہی کی
ہو جائے گا۔ ایک لڑکی جب پیار پانے کے لیے اپنے گھر والوں سے بغاوت کرتی ہے اور انہیں چھوڑ
گھر سے نکلتی ہے تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ جب وہ ماں بنے گی تو اس کا کیا اس کی اولاد کو کس کس موڑ پر
نار پڑے گا۔“

صبح کی فطرت نچی، چہرہ سرخ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”ماں باپ خوش نام اور صحیح اطوار کے مالک ہوں تو اولاد دینے تان کر معاشرے سے اپنا حق وصول
تی ہے، خود کو منوانی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو اولاد کا سر ہمیشہ جھکا ہی رہتا ہے۔ آپ کہتی ہیں میں زندگی
اپنا حصہ لوں اور میں کہتا ہوں زندگی نے مجھے جو دینا تھا وہ مجھے مل چکا۔ اس سے زیادہ میرا اس میں
نہیں ہے۔“

صبح کے پیروں میں چپل تھی اور وہ انگوٹھے سے اس کی سطح پر کید رہا تھا۔

”صبح! ارے بھی کہاں مر گیا یہ چھو کر۔ جب کام کی باری آئے تو غائب ہو جاتا ہے۔ کونے
دروں میں گھس جاتا ہے۔ نکلتا نہیں کا۔“

چچی کی تیز جھپتی ہوئی آواز پر صبح اس پر ایک تھکی ہوئی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

وہ کم کم کیفیت میں کھڑی کچھ سوچنے لگی۔

☆☆☆

”بھلے وہ تین سال بعد آئے یا تین ہزار سال بعد بس اتنا یاد رکھو ہرہ خاتون! وہ اس حویلی کی دہلیز
چھونے کی حق دار بھی نہ ہوگی۔ میں اسے یہ اختیار بھی نہیں دوں گا کہ وہ اس قصبے کی زمین پر قدم بھی
لگے۔ اس سے کہنا خود کو وہوں کہیں شہر میں غرق کر لے۔ لاہور چھوٹا موٹا شہر نہیں ہے۔ اسے بھی کہیں نہ
میں بنا دل ہی جائے گی۔ آخر اتنا عرصہ بھی تو رہی ہے نا۔“

ہال کمرے میں اباجی کی گھن گرج نے جہاں بہت سوں کو متوجہ کیا وہاں ناشتے کے لیے نیچے آتی
تاب کو بھی قدم اس طرف موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے دیکھا ہال کمرے میں کوئی بھی نہیں جا رہا
سب آس پاس بظاہر کسی بے کار سے کام میں مشغول تھے۔

اندر صرف اماں جی اور اباجی تھے۔

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے چھپ کر اس چھوکرے کے ساتھ جاتی رہی ہو اس سے ملنے۔ لیکن ایک
شکان کھول کر سن لو زہرہ! وہ اس گھر میں آئی تو میں زہرہ کھالوں گا۔“

”خدا نہ کرے۔“ اماں جی ہول کر رہ گئیں۔

”لیکن میری بات تو سنئے۔ وہ اتنے برن بعد باہر نکلے گی۔ پیسہ دھیلا، روزی روٹی کہاں سے
رے گی وہ۔“

اماں جی کے لہجے میں منت تھی۔

”کیوں! اتنے سال سے جیل میں ہے۔ خوب بنی سیکھ گئی ہوگی زندگی گزارنے کے ڈھنگ۔“

اورے تم دیکھنا چند سال بعد رہا ہو کر آئے گی تو کیسی ”گنوں“ والی بن چکی ہوگی۔ جیل میں کس نا پر عورتیں ہوتی ہیں تمہیں نہیں معلوم کیا! جرائم پیشہ، چرپی، شرابی، دھندے والی، جعل ساز، چور۔۔۔“

اباجی کے لہجے میں طنز اور کٹی گئی تھی۔

زرتاب کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

اس نے آہٹ پر گردن موڑ کر دیکھا۔ صبح نہ جانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

سودے سلف کا بھاری تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ آنکھیں لہوڑ تھیں اور چہرہ خطرناک حد تک پیلا۔

اس نے اذیت کی تیز لہر کو دبانے کے لیے ہونٹ بھیجنے رکھے تھے۔ زرتاب کو اس بد قسمت ٹھم جی بھر کے رحم آیا۔

تقدیر نے اس کے ساتھ کیا مذاق کیا تھا۔

غالباً وہ یہی بتانا چاہ رہا تھا کل۔

”معاشرے نے مجھے جو کچھ دینا تھا دے دیا۔ اس سے زیادہ میرے لیے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

زرتاب کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھیں۔

”عالیہ! تم جانتی تھیں یہ سب۔۔۔؟“ اس نے موقع پاتے ہی ایسے پکڑ لیا۔

”قسم لے لو جو گھر میں بھی ایسا ذکر بھی ہوا ہو۔۔۔“ وہ نگار نگارہ گئی تھی۔

”ہمیں تو یہی پتا ہے کہ طیبہ پھپھو کہیں روپوش ہو گئی تھیں۔ اصل حقیقت سے امی اور چچی لوگ واقف ہوں گے اماں جی اور اباجی کے علاوہ۔ لیکن وہ جیل کیوں گئیں؟ کس جرم میں اور اتنے

سارے سال۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔“

اب وہ اس پکڑ میں تھی کہ فصیح سے بچ اگلاوے۔

”کیا کریں گی آپ یہ سب کچھ جان کر۔“ فصیح کا لہجہ سخت اور قدرے غصیلیا تھا۔

”کیا کروں گی؟ ارے بھئی وہ میری گئی پھپھو ہیں۔ ان کے ساتھ جو بیتی ہے اس کو جاننے کا

پورا حق حاصل ہے۔“

”تا کہ نہ کر میری بے بسی اور لا چاری کا مزید مذاق اڑا سکیں۔“ وہ استہزاء سے گویا ہوا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ مٹا ہوا تھا۔ شاید وہ یہ سب کچھ زرتاب سے چھپانا تھا، شومی قسمت کہ اباجی کی زبانی اس پر سب کچھ افشا ہو گیا۔

”پلیز فصیح! مجھے بتاؤ۔ طیبہ پھپھو کے ساتھ کیا ہوا۔ پلیز مجھے اپنا ہمدرد سمجھو اور ایک بات جا تمہارا ماضی کچھ بھی رہا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تمہاری عزت اور وقار اتنا ہی اہم ہے

کہ اس گھر کے کسی فرد کا تم خود کو اس گھر سے یہاں کے مکینوں سے الگ کیوں سمجھتے ہو۔ پلیز فصیح! بتاؤ تاکہ صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملے۔“

”کیا بتاؤں؟“ وہ ہار کر بولا۔ ”میرے پاس بتانے کو کچھ بھی اچھا نہیں ہے زرتاب بی بی۔“

اب وہ اس کی طرف پشت کر چکا تھا۔

”میرے والد کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ شہر میں رہتے تھے۔ آپ کی طیبہ پھپھو اس زمانے سے ایف اے کر رہی تھیں۔ ابو ایک ہول میں منیجر تھے۔ کہیں اتفاق سے ان کی ملاقات ہو گئی اور بات پسندیدگی میں بدل گئی۔ اباجی نہیں مانے اور امی گھر چھوڑ کر ابو کے پاس آ گئیں، شادی پھر میں پیدا ہوا۔ میں اس وقت چھ سات سال کا ہوں گا جب امی ابو کے چھٹڑے انتہاؤں کو لگے۔ چھٹڑے تو شادی کے ابتدائی سال میں ہی شروع ہو گئے تھے مگر اب مجھے بھی ان کے سمجھنے کی ایک دوسرے پر الزامات تم نے مجھے تباہ کیا، تمہاری وجہ سے میری زندگی برباد ہوئی۔ تم ہی کے آئی تھیں میرے پاس، تم نے ورغلا یا تھا مجھے وغیرہ وغیرہ۔“

پھر ابو کی اور عورت میں دلچسپی لینے لگے۔ اس سے دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ امی نے آتش فشاں بن گئیں۔ آئے دن لڑائیاں مجھے یاد ہے اس روز ابو اپنے پہلو میں ایک سخی حسین عورت کو لیے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے سرخ کا مدار کپڑے اور ڈھیروں زیور لٹا تھا۔

امی اس وقت تیز دھار چھری سے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے

چہرہ اور پہلو میں دہن لیے کھڑے ابو کو دیکھا پھر ہر منظر ان کی نظروں میں دھندلا گیا۔ چھری بے

زنجی وہ انھیں۔ چھری والا ہاتھ پشت پہ تھا۔ ابو کے قریب آئیں۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ چھری سیدھا ابو کے پیٹ میں اتار چکی تھیں۔ ابو کے لیے یہ افتادنا گہانی

جب تک سمجھ پاتے زنجی ہو کر گر چکے تھے۔

”میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے عبدالاحد! میں نے کہا تھا میں ساری کشتیاں جلا کر تمہارے پاس

دوں۔ واپسی کا ہر دروازہ بند کر کے۔ اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو میں تمہاری جان لے لوں گی اور اس

ما جو میرا گھر برباد کرے گی۔“ وہ وحشت کے عالم میں بول رہی تھیں۔

وہ خاموش ہو گیا۔

”پھر کیا ہوا۔۔۔؟“ زرتاب نے جھرجھری لے کر پوچھا تھا۔

”پھر کیا ابو موقع پر دم توڑ گئے۔ وہ عورت تھانے چلی گئی۔ امی کو گرفتار کر دیا۔ مقدمہ چلا۔ امی

ن کے لوگ حقین کا پتہ لیا گیا تو انہوں نے جانے کیا سوچ کر اس حویلی کا انڈر لیس دے دیا۔ اباجی اور

ماموں کو آنا پڑا پیشی پر۔ اماں جی اپنی بیٹی کو سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر نیم پاگل سی ہو گئی تھیں۔

بڑے ماموں نے اونچا وکیل کروا کے امی کو سزائے موت سے تو بچا لیا مگر عمر قید مع جرمانہ بہر حال

اندر ٹھہری۔ جرمانہ اباجی نے ادا کر دیا تھا۔

بڑے ماموں کے اصرار، اماں جی کی آہ و زاری اور چھوٹے ماموں کی رضامندی کے بعد اباجی

ناخواستہ مجھے جیل سے گھر لے آئے۔ ایک اور بڑی جیل میں جہاں میرا جسم تو آزاد ہے مگر روح قید

اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔ وہ ابھی تک اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

زرتاب دھڑ دھڑاتے چلتی اس کے سامنے آئی تو دھک سے رہ گئی۔

وہ اونچا لمبا کڑیل مرد آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

تقدیر نے کیا کاری دار کیا تھا اس پر۔

”میں ہر ماہ ان سے ملنے جاتا ہوں۔ کبھی بکھارا ماں جی بھی چھپ کر میرے ساتھ چلی جاؤ پچھلی ملاقات میں امی نے بتایا کہ ان کے اچھے چال چلن اور جیل میں عورتوں کو پڑھانے کے باوجود حکام نے ان کی سزا میں دو سال کی تخفیف کر دی ہے۔ یعنی اب وہ تین سال بعد رہا ہو گی۔“ وہ دھیرے سے گالوں پر بہتے پانیوں کو تھیلی میں چن کر ایسے ہو گیا جیسے کبھی یہ دل مرد نہ ہو۔

”میں تو کہتا ہوں کیا ضرورت ہے رہا ہو کے آنے کی، وہیں رہیں۔ اس دنیا میں اب ان کو کیا رکھا ہے۔“ وہ بے رحمی سے بولا۔

”بہت بری بات ہے! تم اس درجہ مایوس اور بددل کیوں ہو۔“

”آپ میری جگہ ہوئیں تو میں آپ سے پوچھتا۔“ وہ سنجی سے بولا۔

”جانتے ہو میری تمہاری جگہ ہوتی تو کیا کرتی؟“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں ارادے کی شفاف چمک نمایاں تھی۔

”میں تمہاری جگہ ہوتی تو بھی دنیا کی باتوں کی پروا نہ کرتی، بھلے وہ آپ کو ایک قاتلہ ماں دھوکے باز عیاش باپ کی اولاد کہتی رہتی۔“

وہ سرخ طنز یہ نگاہیں اس پر گاڑ کے بولا۔

”کسی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات اپنے ضمیر کے سامنے بہادری سے کھڑا ہونا۔“

تم ضمیر کی عدالت میں قصور وار نہیں ہو تو دنیا سے ڈرنے یا ان سے چھپ کر پس منظر میں چلے جا کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں جانتی ہوں کہ میں نے غلط کام نہیں کیا اور میں کسی طرح بھی بچ

ٹھہرتی ہوں تو میں دنیا کی باتوں کو سوچ کر اپنے دل کو تکلف نہیں پہنچاؤں گی بلکہ جو صلے کے ساتھ دیکھوں گی۔“

فصیح کی سوالیہ نگاہ اس پر جمی رہی۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں سب سے پہلے معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل

کے لیے جدوجہد کرتی۔ جس کا سب سے اہم اور اولین ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم مکمل کر کے ایک اچھی

کام حصول اور۔۔۔“

”بہت خوب۔“ وہ حد درجہ تلخی سے اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔

”اپنے بیک گراؤنڈ میں اتنی ساری خوش نما ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ سجا کے میں اس معاشرے

باعزت مقام حاصل کر سکتا ہوں۔ کیا مذاق ہے۔ کیا لطیفہ ہے۔ یہ میرا بھیا تک ماضی اور اس کے دار

پچھا نہیں کریں گے؟ کیا معاشرے میں عزت حاصل کرنے دیں گے؟ محترمہ زرتاب صاحبہ!

کس مستقبل کی بات کر رہی ہیں۔ ہونہر۔“ وہ طنز اسر جھٹکنے لگا۔ جیسے کسی چھوٹی بچی نے بچکانہ

کہہ دی ہو۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔“ وہ زور سے چلائی تھی۔

”بہت کچھ ہوتا ہے اس دنیا میں۔ لیکن سب ریت پہ لکھا نقش ثابت ہوتا ہے جو وقت کی اگلی ہی تیز

باہر جاتا ہے۔ جب کسی قابل بن جاؤ گے تو کوئی نہیں پوچھے گا تم سے تمہارا بیوہ بنا۔ سب مرتبے

نق کو سلام کرتے ہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو اس شہر میں نہ سہی کسی دوسرے شہر میں جا کر جاب کر لو،

لہر لے لو کر آئے۔ امی جیل سے رہا ہو کہ آئیں گی تو انہیں بھی خاموشی سے وہیں لے جانا اور نئے

سے زندگی شروع کرنا وہاں کوئی تمہارے ماضی کو نہیں جان سکے گا جب تک کہ تم خود منہ سے نہیں

کہو۔“

وہ خاموش ہو گئی۔

فصیح بہت دیر تک مسمرائز ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ یک نک اسے دیکھتا ہوا جانے خیال کے گھوڑے کہاں کہاں دوڑا رہا تھا۔

”اور۔۔۔ اگر۔۔۔“ بہت دیر بعد اس نے آہستگی سے سوال کیا۔

”اگر کسی جاننے والے سے آمناسنا ہو گیا تو۔۔۔؟“

اس کے انداز سے واضح تھا کہ زرتاب کا آئیڈیا سیدھا اس کے دل کو لگا تھا۔

”تو کیا ہوگا؟“ وہ سختی و لا پرواہی کے ملے جلے انداز میں بولی۔

”تمہارا کیا خیال ہے کوئی آشنا مل گیا تو وہ تمہارے گھر کے آگے مجمع لگا کے چیخ چیخ کر لوگوں کو

بی اور تمہاری امی کی اصلیت بتائے گا؟ ارے کچھ بھی نہیں ہوگا بے وقوف آدمی! وہ تم سے سلام دعا

لے گا یا زیادہ سے زیادہ طنز کرے گا اور اپنی راہ لے گا اور یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے جس پر گہری

چٹائی جائے۔“

”پھر بھی آخر کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو پتا چل سکتا ہے جہاں میں رہوں گا یا جاب کروں

۔۔۔“

وہ متذبذب تھا۔

”بے شک دنیا اتنی بڑی نہیں ہے مگر اب اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ ہر دوسرے موڑ پر آپ کو جان

نا کا بندہ ٹکرا جائے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ بدنام زمانہ لوگ ایک محلے سے اٹھ کر دوسرے محلے میں

نہ ہوں تو اپنی نئی شناخت اور مقام بنا لیتے ہیں اور لوگ بلا جلیل و جت کے اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں

پھر تم تو شہر میں بدل لو گے ایسا کرنا اسلام آباد یا پنڈی جا کر رہائش پذیر ہو جانا۔ اور یوں بھی آج کل تو

اے کو مسائے کی خبر نہیں ہوتی تم شہروں کی بات کرتے ہو، کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف اور

نہ ایک مضبوط ارادے اور ایک بھرپور مقصد کی ضرورت ہے۔“ فصیح بے یقینی سے اس کی طرف

ننگا۔

اچانک ہی ارد گرد کے سارے منظر صاف ہو گئے تھے۔ سوچوں پہ لگے جالے ہٹ گئے تھے اور

گراں تہ دکھائی دینے لگا تھا۔

”آپ نے تو اپنی باتوں سے مجھے مسحور ہی کر ڈالا زرتاب بی بی! میں خود کو کسی دوسرے سیارے

”اگر بالفرض اسے گھسیٹ گھسیٹ کر کھڑا کر بھی دیا تو کہاں تک چل پائے گا، وہ اب یہ تو نہیں
 تاکہ لہ دین کے چراغ کا جن دنوں میں اس کی حالت بدل دے اور پھر تمہارے مقابل آنے تک
 بہت وقت لگے گا اور تم مزید انتظار کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ اباجی آج کل میں تمہارا عباد بھائی سے
 یہ پکا کرنے والے ہیں۔ پھر کیوں ایک سادہ دل انسان کو آس دلا کر اسے عمر بھر کے لیے ملال بخشی
 “

”شٹ اپ عالیہ۔“ وہ اشتعال سے کانپنے لگی۔
 ”نہ میرا فتیخ سے ایسا کوئی ریلیشن ہے اور نہ عباد بھائی کے سلسلے میں میرا کوئی رجحان ہے۔ کہہ دینا
 ا جی سے۔“ وہ بری طرح ہونٹ چبا رہی تھی۔
 ”وہ تو جب مجھ سے تم سے پوچھیں گی تب ہی بات ہوگی مگر جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا تمہارے
 ن کیا جواب ہے؟“ عالیہ سابقہ پرسکون موڈ میں تھی۔
 ”اس کا اور تمہارا کوئی میل نہیں زرتاب! یہ بھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔“
 ”میرا دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا۔“ وہ گھور کر عالیہ کو دیکھنے لگی۔
 ”اگر نہیں ہوا تو بہت اچھی، بہت ہی اچھی بات ہے اور اگر ایسے کسی چور جذبے نے خفیہ طریقے
 سے تمہاری سوچوں تک سرنگ بنالی ہے تو اس جذبے کو فوراً ختم کر دو، پنپنے سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ
 داسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“
 ”اگر تم سے دوبار ایسی بات کہی تو میں تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی آئندہ۔“ وہ غضب ناک ہو
 گئی۔

”اوسکے، اوکے بابا! میں سمجھ گئی۔“ عالیہ ہاتھ اٹھا کر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بی بی
 خدمت خلق! جو بھی کرنا اپنا دامن بچا کر کرنا۔ اچھا آؤ ذرا باہر کا ایک چکر تو لگا کے آئیں۔ آج میں تمہیں
 اپنی ڈرائیونگ کے جوہر دکھائی ہوں۔“
 ”کیا تم نے ڈرائیونگ سیکھ لی؟“

”اور کیا یار! عباد بھائی کی تھوڑی سی منت خوشامد کے بعد ان سے ڈرائیونگ کی الف بے کی
 ٹریننگ لے لی۔ تم بھی ان سے سیکھ لو نا۔ تمہیں تو وہ خوشی خوشی سکھائیں گے۔“
 عالیہ نے شرارت سے ایک آنکھ بند کی، زرتاب نے غصے سے کٹن اٹھا کے دے مارا تھا۔

☆☆☆

”بہار کا موسم کیا ختم ہوا قہر بھرا موسم گرما جاں کو آگیا۔ سردیاں کھرا آلودہ ہوتی ہیں اور گرمیاں قہر آلود،
 کیا بات ہے بھئی۔“

عالیہ قہر پیٹے ہوئے خود ہی اپنی بات سے محظوظ ہوئی تھی۔ وہ سینے میں شرابور ہو رہی تھی۔
 ”وہ جو تمہیں دیکھنے آ رہے ہیں تمہاری یہ بھیکے اڑانی حالت دیکھ لیں تو شاید دروازے سے ہی
 پلٹ جائیں۔“

سمن نے ناک چڑھا کر عالیہ کو دیکھا تھا۔

سے آیا ہوا تصور کرنے لگا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے کہ اتنا عرصہ میں کسی تاریک دنیا میں صبح و شام
 ہوں آج زمین پر آیا ہوں اور قدم جمار ہا ہوں۔“
 وہ بہت ہلکے ہلکے انداز میں مخاطب تھا۔
 ”یاد رکھو ایک بار پھر۔“ وہ مڑتے مڑتے دوبارہ بولی۔
 ”زندگی یوں بے کار گنوانے کے لیے نہیں ہوتی۔“
 ”صحیح کہا آپ نے۔“ وہ صدق دل سے بولا۔
 ”یہ تو آپ جیسی چیز کو حاصل کر کے دل میں چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔“ یہ جملہ اس
 میں کہا تھا۔

☆☆☆

”یہ تم کیا کر رہی ہو زری! کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ جانتی ہو اباجی یا گھر کے کسی اور
 بھٹک بھی پڑ گئی تو تمہارے ساتھ اور صبح کے ساتھ کتنا برا ہوگا۔“ وہ بی اے کی انگلش لٹرچر کی بک
 کی سری بنا رہی تھی۔ جب عالیہ نے کڑے تیور لیے اسے مخاطب کیا تھا۔
 ”جو راستہ تم اس کو دکھا رہی ہو وہ تمہارے لیے بھی خطرناک ثابت ہوگا اور اس کے لیے بھی
 اب وہ پریشانی کے عالم میں اس کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔
 ”ارے بھئی پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔ ہلا دیا نا پین۔“
 ”جہاں بیٹھ کر بھی بات کروں گی یہی بات ہوگی آج۔“ عالیہ نے اس کے ہاتھ سے رجز
 سائیڈ پر رکھ دیا۔

”تم کیوں اباجی اور چچا لوگوں کی مخالفت میں چل رہی ہو۔ جانتی ہو گھر میں فصیح سے
 نفرت آمیز سلوک کیا جاتا ہے؟“ وہ اسے ڈپٹ رہی تھی۔
 ”اور تم ہو کہ صاحب کا مستقبل سدھارنے کی فکر میں ہلکان ہو رہی ہو۔“
 ”میں کچھ نہیں کر رہی۔ میں نے تو صرف راستہ دکھایا ہے۔ اس پر چل تو وہ رہا ہے۔“
 ”مگر تم ہر قدم پر اس کا ساتھ دے رہی ہو۔“

وہ خفگی سے زرتاب کو گھورنے لگی۔
 ”اگر یہ غلط ہے تو یہ غلطی میں کر رہی ہوں لیکن بغیر کسی لالچ یا فائدے کے، ایک قدم
 آنکھوں کے سامنے ضائع ہو رہا تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو۔ اباجی ایک مرد کا سہارا
 عورت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت ٹوٹے ہوئے جڑا
 گرے ہوئے مرد کے کچے حوصلوں کو جمع کر کے اسے پھر سے تناور درخت بنا دیتی ہے۔“ زرتاب
 ٹھوس تھا۔ عالیہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔

”تمہاری کیا دلچسپی ہے اسے تناور درخت بنانے میں، بچ بچ بتاؤ؟“
 ”حد ہو گئی قسم سے۔“ وہ بری طرح تپ کر کرسی سے اٹھی تھی۔ مگر عالیہ پر اس کے بھڑکے
 اثر نہیں ہوا۔

”کچھ خبر تو رکھتیں۔ کہیں ایسے ویسے کے ساتھ نہ رخصت کر دیں۔“ زرتاب کو پریشانی لاحق

ہوئی۔ ”جو میری قسمت میں ہوگا اس سے فرار بہر حال ممکن نہیں ہوگا، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“
”خدا کرے اچھا ہی دیکھنے کو ملے۔“ زرتاب نے دعا کی۔

☆☆☆

عالیہ کی منتہی دھوم دھام سے کی گئی تھی، یہاں کے رواج کے مطابق لڑکے والوں کی ساری برادری اور ابا جی اور اماں جی کے پچاس ساٹھ جاننے والے رشتہ داروں اور دوست احباب کو بمعہ فیملی دعوت دی گئی تھی۔

شام ہی سے لڑکیوں بالیوں نے ڈھولک سنجال لی تھی اور زرتاب حسب عادت اس دھوم دھڑکے والے پنجابی گانوں کے شور سے بچنے کے لیے پچھلے صحن میں پناہ لے چکی تھی۔
”کیا بات ہے۔ آپ یہاں آکر کیوں بیٹھ گئیں؟“ فصیح اسے ڈھونڈتا ہوا پچھلے صحن میں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے یہیں ملے گی۔

”مجھ سے شور برداشت نہیں ہو رہا تھا۔“

”کیا آپ کو شادی بیاہ کے گانے پسند نہیں ہیں؟“ فصیح نے بغور اس کا سراپا دیکھا۔

”سیاہ مقیش کے سوٹ میں اس کا چہرہ کم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا۔۔۔؟“ وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”آپ رضوان صاحب کی شادی پر بھی یہیں آکر چھپ گئی تھیں۔ میری اور آپ کی بالمشافہ

ملاقات یہیں ہوئی تھی۔“

”اوہ۔۔۔“ اسے سمجھ میں نہ آیا اس بات کا کیا جواب دے۔

”تمہارے بی اے کے پیپر ز کیسے ہوئے؟“

”بہت اچھے، اکناکس کا تو بہت ہی اچھا ہوا، اور انگلش لٹریچر کی تو ساری تیاری آپ نے ہی کروائی تھی۔ ویسے پرچے دیتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں بی اے کے امتحان میں بیٹھنا بہر حال ایک پُر مزاج تجربہ ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔

”مجھے امید ہے تم بہت اچھے نمبروں سے بی اے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب زلزلے کا انتظار نہ کرو اور ایم اے اکناکس کا کورس شروع کر دو۔ اگلے سال تمہیں پارٹ ون اور پارٹ ٹو دونوں کے پیپرز اکٹھے دینے ہیں۔ یہ تمہاری ول، تمہاری محنت اور ہمت کا امتحان ہے۔ مشکل تو بہر حال پیش آئے گی مگر مجھے یقین ہے یہ سال گزرتے دیر نہیں لگے گی اور تم خود کو ثابت کرنے میں ضرور کامیاب رہو گے۔“

اور فصیح نے اس کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے جان لڑادی۔ اس کی اتنی بے رنگ، پھیکٹی اور ایران زندگی میں یہی تو ایک پُر بہار درپچہ تھا۔

وہ اس کے لیے سر تاپا بہار کی علامت تھی۔ جیسے بہار آتی ہے تو ہوائیں ٹھنڈی پہنچاتی ہیں۔ وہ اس

”کیوں کیا ان کے ہاں گرمیاں نہیں آئیں یا انہوں نے کچن میں بھی اسے سی لگوار کر دیں؟“

عالیہ تنک کر بولی۔

”یہ تو اب تم ان ہی سے پوچھنا۔ بائی داوے چھکا چک ٹرین سے آرہے ہیں یا اپنی گاڑی استعمال کریں گے۔“

”ابھی دائر لیس پہ رابطہ کر کے پوچھتی ہوں۔“ عالیہ فرما کر داری سے برجستگی کا مظاہرہ کر گئی۔
”مٹن کڑا ہی کے لوازمات جمع کرتی زرتاب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ سمن نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔
یوں بھی آج کل حد سے زیادہ چڑی ہو رہی تھی۔ رضوان سال بعد ایک ماہ کی چھٹی گزار کر پھر واپس امریکہ چلا گیا تھا۔ اسے ساتھ لیے بغیر اس کی پڑھائی مکمل نہیں ہوئی تھی۔

انتظار کی آگ میں جلتی سمن کے لیے آنے والی تنہا اور انتظار سے بوجھل گھڑیاں مزید طو اور مہیب ہو گئی تھیں۔ وہ دن بھر بے قرار اور بے چین پھر کرتی۔ راتوں کو نیند کی گولیاں لے کر سوتی تھی۔

”بہت غصہ آ رہا ہے مجھے تمہارے بھائی پر۔“ وہ پلٹ کر خواہ مخواہ زرتاب سے الجھ گئی تھی۔

”لو سنا تھا نندیں بھابیوں پر حاوی رہا کرتی ہیں۔ یہاں بھابھی مند کے کان کتر رہی ہے۔“ عالیہ نے ٹھٹھا لگایا۔

”اب وہ پڑھائی مکمل کر کے لوٹے گا مائی ڈیر بھابھی سمن جی!“ زرتاب نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

”یہ پڑھائی تو میری سوتن ہی بن گئی ہے۔“ وہ پیر پختی کچن سے باہر آ گئی۔

”بے چاری۔“ زرتاب کی افسوس بھری نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ ”میرا بس چلے تو رضوان بھائی کو کان سے پکڑ کے لے آؤں۔ میں اسی لیے اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھی۔ میں چاہتی تھی پہلے رضوان پڑھائی مکمل کر کے وطن واپس آجائے اور یہاں آکر سیٹل ہو جائے تو شادی کا سلسلہ شروع ہو۔ مگر ابا جی اور اماں جی کو بے اعتباری تھی۔ بے وجہ اس غریب کی سیدھی سادی زندگی کو انتظار اور اضطراب کا نمونہ بنا دیا ہے۔“

”خیر ان صاحبہ کو کبھی خوب ہی آفر آئی ہوئی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کل کی ہوتی آج ہو جائے اب بھگتے جلد بازی میں کی گئی شادی کا خمیازہ۔“

عالیہ صاف گوئی سے بولی۔

”یہ جو تمہیں دیکھنے آرہے ہیں یقیناً ابا جی یا اماں جی کے جاننے والے ہوں گے۔“ زرتاب بات کا رخ بدلا۔

”ظاہر ہے۔“ عالیہ انہماک سے شامی کباب کی نکلیاں بنا رہی تھی۔

”لڑکا کیا کرتا ہے۔۔۔؟“

”یہ بھی ابا جی یا اماں جی کو ہی معلوم ہوگا۔“ عالیہ نے کندھے اچکائے۔

کے دل کی ٹھنڈک تھی۔

بہار آتی ہے تو پھول رنگ اور خوشبو نکھرتے ہیں۔ وہ اس کی سوچوں کے آئینے کا پھول تھی۔
بہار آتی ہے تو نرم گرم سی دھوپ سارے منظر روشن کر دیتی ہے۔ وہ اس کی سرود و بریلی صحوں کا
تروتازہ اور حرارت بخش دھوپ تھی۔
وہ صرف اس کا تصور کر کے بشارت ہو جاتا تھا۔

☆☆☆

”پہلے تو تم اپنی تنخواہ میری ہتھیلی پر رکھا کرتی تھیں۔ اب اتنے عرصے سے ایک دھیلا بھی نہیں دیا۔
کیا کرتی ہو اتنے پیسوں کا۔۔۔؟“
اماں جی بہت غور سے زرتاب کی صورت دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی
تھیں۔ انہوں نے عالیہ کے ہاتھ پیغام دے کر زرتاب کو بلایا تھا۔
زرتاب کو ان کی نفیشتی نظروں اور جارحانہ لب و لہجے سے خوف آنے لگا۔
”وہ اماں جی! اصل میں چیک ملتا ہے نا۔ میں وہیں سے اپنے بینک میں جمع کر ادیتی ہوں۔“

ہٹکا کر بولی۔

”تو پھر فصیح کی کتابوں اور امتحان میں بیٹھنے کے لیے داخلہ فیس کون جمع کراتا ہے۔“
اماں جی بہت گہری نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔
زرتاب پسینے میں نہا گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تاہم کچھ دیر بعد اس نے فوراً
سنجھال لیا۔

”لو بتاؤ ہماری ناک کے نیچے کھیل کھیل جاتا رہا اور ہم بے خبر رہے شک تو مجھے بھی کئی بار ہوا تھا کہ
میرے بد بخت بہانے بہانے سے تمہارے گرد منڈلاتا رہتا ہے مگر تمہارے مزاج اور کھڑکھاؤ کو دیکھتے ہوئے
میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔“
”ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں جی! میں نے صرف ہمدردی کے ناتے اس کی مدد کی ہے تاکہ
کچھ بن جائے۔ اپنے لیے کچھ کر سکے۔“

”اس نے جو بننا تھا وہ بن چکا۔“ وہ درشتی سے بولیں۔ ”وہ کچھ بھی بن جائے رہے گا ہمارے
قدموں کے نیچے۔ کون سی بیاں پڑھانے چلی ہو اسے بی بی! ہوش کے ناخن لو۔ اگر یہ صرف
ہمدردی ہے تو عباد کے رشتے سے انکار کیوں کر رہی ہو؟ بہانے بہانے سے ٹال رہی ہو نہیں۔
اب تو تمہارا اسپیشل نریشن بھی ہو گیا۔ اب کیا رکاوٹ ہے بولو؟“ وہ ان کے لہجے کی سختی سے
خائف ہو گئی۔

”اماں جی۔۔۔!“ کچھ دیر بعد وہ جھجکتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئی۔

”میری بات چھوڑیں۔ صرف فصیح کی بات کریں۔ اماں جی! وہ آپ کا نواسہ بھی تو ہے۔ صرف
میرے پھوپھو کے شوہر کا بیٹا نہیں ہے، طیبہ پھوپھو کا بھی بیٹا ہے۔ اور پاپا بتایا کرتے تھے کہ آپ طیبہ پھوپھو
ب سے زیادہ چاہتی تھیں۔ بہت لاڈلی بیٹی تھی وہ آپ کی۔ پھر ان کی نشانی، ان کی اولاد کے ساتھ آنا

خاترت آمیز سلوک کیوں؟“ اماں جی کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔

”مرگئی میرے لیے وہ۔۔۔“ وہ بھرائی ہوئی ناراض آواز میں گویا ہوئیں۔

”مرگئی ہیں تو پھر چوری چھپے ان سے ملنے جیل کیوں جاتی ہیں؟“ اس کی بات سن کر اماں جی کا چہرہ
دھواں دھواں ہو گیا۔ ان کے ہاتھ واضح طور پر کانپنے لگے۔

”ہمیں تو مار ہی دیا ہے اس نے۔ گھر چھوڑ کر شادی کرنا کیا کم رسوائی تھی جو اس کو قتل کر کے جیل کی
سلاخوں کے پیچھے عمر برباد کر کے ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔“

”تو آپ نے ان کی ضد پر ان کی خود شادی کیوں نہ کرائی۔“ اس نے جرح کی۔
”ہم سمجھ رہے تھے گھر چھوڑ جانے کی دھمکی سن کر وہ خاموش ہو کر بیٹھ جائے گی، مگر وہ تو سچ سچ
ہمیں چھوڑ گئی۔ ہمارے مقابلے میں اس شیطان کو جن لیا، کیا ملا، خود بھی تباہ ہوئی اور ہمیں بھی منہ
دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ اس لڑکے کو دیکھتی ہوں تو اپنی بیٹی کی بربادی کا زخم پھر سے تازہ ہو جاتا
ہے۔“

”جو سلوک آپ لوگ فصیح سے کر رہے ہیں، یہ تو طیبہ پھوپھو کو مزید برباد کرنے اور ظلم ڈھانے کے
مترادف ہے۔ ان کا لاڈلا بیٹا یہاں ملازموں سے بدتر حالت میں پڑا ہوا ہے۔ ملازموں کو تو پھر مہینے بھر
بعد تنخواہ مل جاتی ہے اس بے چارے کو یہ آسرا بھی نہیں۔ اگر میں نے اس کی ضرورتیں دیکھ کر چند ہزار
اسے دے دیے تو آپ کو اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے اگلے سیدھے الزامات کی بوچھاڑ کر دی؟“ اب کے
اماں جی خاموش رہیں۔

”آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ وہ کمپری اور بے بسی کے عالم میں آپ کے پاس کیوں چپکا
ہوا ہے۔ وہ جوان ہے۔ عاقل و بالغ ہے۔ ہاتھوں پیروں میں طاقت ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ
یہاں سے جانا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا۔ وہ یہاں رہنے کا پابند تو نہیں تھا وہ صرف آپ سے
وابستگی، آپ سے محبت اور رشتے کے مان کی خاطر آپ سے جڑا رہا۔ آپ کا کیا خیال ہے آپ نے
اسے قید کر رکھا ہے؟ یا اگر وہ یہاں سے گیا تو اسے کہیں پناہ نہیں ملے گی؟ آپ کی غلط فہمی ہے اماں
جی! وہ کہیں سے بھی اپنی زندگی شروع کر سکتا تھا مگر اس نے اپنوں کے ساتھ کو ترجیح دی۔ وہ کوئی لڑکی
تو نہیں تھا جسے زمانے کی گرم ہوا مر جھا دیتی؟ مرد کے لیے اس دنیا میں بڑی جگہ ہے اماں جی! اس کا
ماضی کچھ بھی رہا ہوا ہے بھولنے میں یہ دنیا بس چار دن ہی لگاتی ہے۔ ہاں لڑکی کا معاملہ البتہ الگ
ہے۔“

”بہت بولتی ہو تم، بہر حال تم اس لڑکے کے معاملے سے دور ہی رہو تو بہتر ہوگا۔ خواہ مخواہ اپنے ابا
جی کے عتاب کو دعوت نہ دو اور عباد کے رشتے کے لیے۔۔۔“

”پلیز اماں جی! رضوان کو تو آنے دیں۔ میرا ایک ہی تو بھائی ہے اس بھری دنیا میں۔ کیا میری
منگنی یا شادی اپنے سب سے قریبی خونی رشتے کی غیر موجودگی میں ہو سکتی ہے؟“

اس نے بہت سوچ سمجھ کر جذباتی بلیک میلنگ کا یہ نکتہ استعمال کیا تھا جو بہر حال کارگر ثابت ہوا۔
”ٹھیک ہے اب کے رضوان آیا تو اس کے آتے ہی تمہارا فرض ادا کر دوں گی۔ غضب خدا کا اپنی

عمر تو دیکھو۔ اس عمر میں تو لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں۔ ارے دقت گزر گیا تو کوئی نہیں پوچھے گا لڑکی!“

”اچھا اماں جی!“ وہ خطرہ ملتے ہی شکر کرتے اٹھ کھڑی ہوئی، اب اسے رضوان کی لمبی مدت تک واپس نہ آنے کی دعا مانگتی تھی۔

☆☆☆

”یہ کیا غضب ہو گیا بھی میں تو تمہاری اس قدر عادی ہو گئی ہوں کہ سونے سے پہلے تمہیں سارے دن کی کھانا سالوں تو چین نہیں پڑتا۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے سوتی ہوں۔“

عالیہ بری طرح بوکھلا گئی تھی۔

”یہ عادت تو تمہیں یوں بھی بدلنا ہی تھی۔ شادی کے بعد تو بہر حال میں تمہاری یہ خدمت نہیں کر سکتی تھی۔ چند ماہ کی تو بات ہے۔ پھر تم اپنے نئے گھر روانہ ہو جاؤ گی۔“

زرتاب سوٹ کس میں احتیاط سے اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔

”ارے تمہیں ذرا دکھ نہیں ہو رہا یہاں سے جانے کا؟“ عالیہ نے تپ کر اس کے ہاتھ سے ہینگر چھین لیا۔

”کیا کروں، سرکاری آرڈر آیا ہے۔ ٹرانسفر ہوا ہے میرا نوکری میں ایسا تو بہر حال ہوتا رہتا ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہے جس پر حیرت کے سمندر میں غوطہ لگانے لگوں۔“ وہ پرسکون انداز میں پیلنگ کرتی رہی۔

”تم سرکاری نوکری چھوڑ کر اپنا ذاتی کلینک کیوں نہیں سیٹ کر لیتیں؟ یہاں ویسے بھی اچھے کلینک کی کمی ہے۔“

”وہ بعد کا منصوبہ ہے۔ فی الحال تو نوکری کروں گی۔“

اباجی اور اماں جی بڑی مشکل سے اسے اکیلا بھیجنے پر راضی ہوئے تھے۔ نوکری چھوڑنے پر بھی حتی الوسع زور ڈالا گیا۔

عباد بھائی بہت مشتعل نظر آ رہے تھے۔

”آخر کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ غصے کے عالم میں اس کے پاس چلے آئے۔

”کیوں خوانخواہ معاملہ لگا رہی ہو۔ واضح جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟“

”کیا جواب دوں۔ یہ تو بڑوں کے معاملے ہیں، یوں بھی ابھی رضوان واپس نہیں آیا۔ وہ آجائے نبات آگے بڑھے گی۔۔۔“

وہ مصلحت سے کام لینے پر مجبور تھی۔

”آپ جارہی ہیں۔۔۔؟“ صبح موقع پا کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی رت تھی۔

”ہاں جانا تو ہوگا، میرا پنڈی ٹرانسفر ہو گیا ہے۔“

”میرے سفر کو ادھورا چھوڑ کر جارہی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

”کیونکہ مجھے یقین ہے باقی کا سفر تم بڑی سہولت سے طے کر لو گے۔ وقت کم ہے۔ ایم اے کے امتحانات سر پر ہیں۔ اس وقت سب کچھ بھول جاؤ اور پوری توجہ پیپرز پر رکھو۔ اس کے بعد یہاں یا کسی اور شہر میں اچھی جاب کی تلاش شروع کر دینا۔“

”یہ مراحل آپ کے بغیر کیسے طے کروں گا؟“ وہ واضح طور پر اداس دکھائی دے رہا تھا۔

”اب یہ سارے مرحلے ہی آسان ہیں۔“

”مگر میں خود کو کیسے سمجھاؤں کہ آپ کا ساتھ صرف اندھیروں تک میرے ساتھ تھا، روشنی آتے ہی آپ مجھے اس چکا چوند میں الجھا کے خود سائیڈ پر ہو گئی ہیں۔“

”اچھا چھوڑ دو یہ باتیں، کچھ اور کہو۔“

”کہہ دوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

تم جو پل بھر کو ٹھہر جاؤ تو یہ لمحے بھی آنے والے کئی لمحوں کی امانت ہو جائیں

تم جو ٹھہر جاؤ تو یہ رات یہ مہتاب

یہ سبزہ، یہ گلاب اور ہم دونوں کے خواب

سب کے سب ایسے مبہم ہوں کہ حقیقت ہو جائیں

تم ٹھہر جاؤ کہ عنوان کی تفسیر ہو تم

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ زرتاب کا دل یوں کانپا جیسے شدید طوفان باد و باران میں گھرا ڈولتا ہوا جہاز۔

تم سے خفی اوقات کا موسم بدلے

رات تو کیا بدلے گی حالات تو کیا بدلیں گے

تم جو ٹھہر جاؤ تو میری ذات کا موسم بدلے

مہرباں ہو کے نہ ٹھہرو تو پھر یوں ٹھہرو

جیسے بل بھر کوئی خواب تمنا ٹھہرے

جیسے درویش مدح نوش کے پیالے میں کبھی

ایک دو پل کے لیے خفی دنیا ٹھہرے

تم ٹھہر جاؤ کہ مدارات کے مے خانے سے

چلتے چلتے کوئی ایک آدھ سبو ہو جائے

اس سے پہلے کہ کوئی لمحہ آئندہ کا تیر

اس طرح آئے کہ پوست گلو ہو جائے

”پلیز صبح!“ زرتاب نے بہت سنجیدگی اور خشکی سے قدم آگے بڑھا دیے۔

”میں نے تو صرف ایک نظم سنائی ہے۔“ وہ انجان بن کر سادگی سے وضاحت کرنے لگا۔

”آپ کو کیا لگا؟“ اس نے مبہم نگاہ اس پر ڈال کر چہرہ موڑ لیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ خائف سی ہو کر باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

پنڈی ٹرانسفر کے بعد اس کی زندگی بہت مصروف ہو گئی۔ وہ وہاں ہاسٹل میں رہتی تھی اکثر دو تین بعد ویک اینڈ پر گھر آ جاتی تھی۔ وقت کچھ اور آگے سرکا۔ رضوان کو ابھی تک واپس آنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ عالیہ کی شادی ہو گئی اور بالآخر فصیح نے ماسٹرز کے پرچے دے دیے تھے۔ اور جب چھ ماہ بعد رزلٹ آیا تو فصیح کو اپنی اس کامیابی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔

اسے آج اپنا آپ بہت مضبوط اور مکمل محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے اب اس کے پاس سر اٹھا کر چلنے کی طاقت آ گئی ہے۔

”اب میں اپنے لیے اور اپنے سے وابستہ رشتوں کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے طمانیت سے سوچا۔ زرتاب نے جانے سے پہلے کہا تھا۔

”تمہاری جگہ یہاں نہیں ہے فصیح! تمہارا گھر وہ ہوگا جو تم اپنے لیے اور اپنی ماں کے لیے بناؤ گے۔ یہاں تم ایک مہمان ہو اور مہمانوں کو گھر والوں پر غیر ضروری بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ تمہاری ٹہلی تمہاری ماں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔“

”اور تمہارے ساتھ بھی۔“ اس نے سوچا۔

”صاحبزادے کے بڑے پرنکل آئے ہیں۔ ذرا پوچھیں تو نواب زادے سے آج کل شہر کے بار بار چکر کیوں لگائے جا رہے ہیں؟“ عباد کا لہجہ نفرت سے سلگ رہا تھا۔

اباجی نے کافی بگڑے تیوروں سے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ جہاں عباد بھائی پہلے سے موجود تھے۔

”کیوں بھی خبیث کے پتر! کہاں دفع ہوتے ہو روز روز۔۔۔“ اباجی بھڑک کر شعلہ بن گئے۔

”میں نوکری کی تلاش میں جاتا ہوں۔“ ادب مانع تھا اس لیے سر جھکا کر جیسے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

”بہت خوب، اب یہ دو نکلے کا انسان نوکری کرے گا۔ اپنی مرضی کرے گا۔“ عباد بھائی نے طنز سے اس کی طرف دیکھا۔

”کس سے پوچھ کر تم یہ سب کر رہے ہو۔“ اباجی نے دانت پیس کر پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

”یہ جو تم نے ہماری نافرمانی کر کے اپنی ضد سے پرچے دے دیے یہ تمہارے لیے بہت کافی ہے۔ یہاں رہنا ہے تو پھر ہماری مرضی اور شرطوں کے مطابق رہنا ہوگا۔ ورنہ دفع ہو جاؤ جہاں جی چاہے۔“ وہ بہت ناراضی سے گویا تھے۔

”تمہارے ذمے جو کام لگائے گئے ہیں وہی تمہاری نوکری ہے، ہمیشہ کے لیے سمجھ گئے؟“ عباد

آئی قنارت سے بولے۔

”فصیح کو اپنے دل و دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔“

”جس تعلیم کو اتنی تاخیر سے حاصل کیا ہے اسی کو استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔“ اس نے احترام ملحوظ

طرز سے ہونے احتیاط سے اپنا منہ عابیان کیا وہ چاہتا تو ضد یا ہٹ دھرمی سے بھی کام لے سکتا تھا مگر وہ

ماں فراموش نہیں کہلاتا چاہتا تھا۔ کچھ بھی تھا اس حویلی نے اسے اس وقت پناہ دی تھی جب وہ بھری دنیا

ماکیلا جھٹکنے کو تھا۔ گوکہ اس احسان کا تاوان وہ ابھی تک ادا کر رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے۔ اس نے کچھ ترس کھا کے پڑھائی

لہائی کا سامان کیا کر دیا خود کو ہیرو سمجھنے لگے، اباجی میرا تو خیال ہے اس کی زرتاب پر نیت خراب ہے۔

ن بھولی بھائی لڑکی کو اپنے چنگل میں پھنسا کر مجھ سے بدظن کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے تو وہ مجھ سے شادی

سے بدک رہی ہے۔“

”بس کریں عباد بھائی!“ وہ بری طرح پھٹ پڑا۔ اب بات اس کی برواشت سے باہر ہو گئی تھی۔

”ایسے گھناؤنے الزام لگاتے ہوئے آپ کو شرم آتی چاہیے۔“ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا

ن۔

”میرے ساتھ بدتمیزی کرتے ہو، میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔ گندی ماں کی گندی اولاد۔“

وہ چنگھاڑتے ہوئے اس کے پاس آئے اور گریبان میں ہاتھ ڈال کے دوسرے ہاتھ سے زوردار

چڑلگانا چاہا۔ مگر ان کا ہاتھ ایک جھٹکے سے فصیح نے روک لیا تھا۔

”بس عباد صاحب! بہت ہو گیا۔ بہت سہ لیے آپ لوگوں کے طنز اور طعنوں کی مار، بہت لے لیا

اپ نے میری برداشت کا امتحان۔ آپ نے کوئی جانور نہیں پالا تھا گھر میں۔ نہ میری ماں نے تاوان کی

سورت میں مجھے آپ لوگوں کو سونپا تھا کہ ہر طرح کے بدترین سلوک کا حق دار سمجھا جاتا۔ اباجی اگر میری

اں کے گناہوں کا کفارہ پورا ہو گیا ہو اور آپ کے سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو تو مجھے اجازت دیجیے گا۔ میں

یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“

وہ عباد بھائی کا ہاتھ جھٹک کر پرے کرنے کے بعد سرخ آنکھیں لیے اباجی کے پاس آ کر کا، اس

کے لہجے میں دھتھا۔

”تیزی تو۔۔۔ ہمارے ٹکڑوں پہ پلٹنے والے کتے۔“ عباد بھائی کف اڑانے لگے۔

حیرت انگیز طور پر اباجی ابھی تک خاموش کھڑے تھے۔ فصیح سلگتے ہوئے اعصاب لیے ایک آن

دیکھے لاؤ میں جلتا ہوا ہار ا گیا تھا۔

پھر اس نے وہاں سے نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔

اس کی اگلی منزل پنڈی کا جنرل ہاسٹل تھا۔ جہاں زرتاب ان دنوں تعینات تھی۔ اتفاق سے وہ

ڈیوٹی آؤرز میں ہی اسے مل گئی۔

”تم یہاں۔۔۔؟“ وہ حیران تھی۔

”یوں اچانک آ گئے؟ کیا نوکری ڈھونڈنے آئے ہو؟“

”اس کے لیے شاید اتنی جلدی نہ آتا۔ مگر اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ آنا ہی پڑا۔“ وہ خود کو بہت حد تک پُر سکون کر چکا تھا۔ تمام واقعات اس کے گوش گزار کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

”یہاں کہاں رہو گے فصیح؟ اور وہ بھی پیسوں کے بغیر۔“

”اسی لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”مجھے کچھ رقم چاہیے ادھار، اتنی کہ جس سے ایک کرا کر اے پر لے کر رہ سکوں اور جب تک نوکری نہیں ملتی اپنے کھانے پینے اور رہنے کا بندوبست کر سکوں۔“

”کیوں نہیں؟“ اس نے بیک سے چیک بک نکال کر دس ہزار کی رقم لکھی اور اسے چیک تھادیا۔ ”مجھے یقین ہے بہت جلد تم یہ قرض لوٹانے کے قابل ہو جاؤ گے۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

”شکر یہ سفر اتنا سہل بھی نہیں تھا۔“ دو ماہ گزر گئے جوتیاں چٹاتے پھر تیسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا۔ اور جب وہ مایوس ہونے لگا تھا تو اچانک ہی قسمت مہربان ہو گئی۔ اسے بلیو ایریا میں ایک ٹریول ایجنسی میں بہت اچھی جاب مل گئی۔

اس دن وہ بہت خوش تھا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ لیے مٹھائی کے ڈبے سمیت وہ شام کو زرتاب کے ہاسٹل میں موجود تھا۔

”یہ باوقار زندگی کی طرف جانے والے راستے کا پہلا پڑاؤ ہے۔ ایسے بہت سے نئے موڈ کی منزلیں تمہاری منتظر ہوں گی۔ بس ہمت نہ ہارنا۔“

”اگر آپ جیسا کوئی ہمیں ہمت بندھانے والا مل جائے تو۔“ اس نے اچانک اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔

”بہت زیادہ بولنے لگے ہو تم۔“ وہ غصے سے گھور کر مٹھائی کا ڈبا کھولنے لگی تھی۔

☆☆☆

فصیح کا گھر چھوڑ کر جانا قصہ پارینہ بن چکا تھا۔

گھر میں جس جس نے بھی اس کے اچانک گھر سے جانے کی خبر سنی تھی اس نے اس عمل کو اپنی مال کے نقش قدم پر چلنے سے عبارت کیا تھا۔

کچھ عرصے تک لعنت ملامت کرنے کے بعد اب سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ کام کاج کے لیے ایک ادھیڑ عمر ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ کسی کو اس کے جانے سے فرق نہیں پڑا تھا،

اماں جی بہت گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔

”طیبہ کی امانت تھا وہ ہمارے پاس۔ ایسے کیسے جانے دیا اسے، جہاں اتنا عرصہ رکھا وہاں۔۔۔“ وہ اکثر خود کلامی کے سے انداز میں کہتی تھیں۔

”اس کے ساتھ جاکے طیبہ سے دو گھڑی کو مل لیتی تھی۔“ اماں کو اپنے اکلوتے نواسے کے اس طرز چلے جانے کا بڑا رنج ہوا تھا۔ ”جانے کہاں اور کن حالوں میں ہو گا۔“

پھر ایک دن زرتاب نے آکر بتایا۔

”وہ تو خیرت سے ہے اماں جی! گزشتہ آٹھ نو ماہ سے پنڈی میں رہ رہا ہے۔ اسے اچھی نوکری بھی ملے۔“

اماں جی کے چہرے پر دے روشن ہو گئے۔

”شکر ہے خدا کا، مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں ملی ہوں اس سے۔“ اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہیں۔ غالباً اس کی شکل سے بات کی گہرائی جانچنا چاہ رہی تھیں۔

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ مہربان ہو گئیں۔

”رضوان ماہ بعد آ رہا ہے اس کے آتے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔“

”ہوں۔“ وہ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

وہ سوچ رہی تھی رضوان کو گھر سے فون کرے یا باہر پی سی او سے، رضوان امریکہ میں پلا بڑھا تھا۔

دی رائے کا قائل تھا۔ اس نے بڑے عمل سے ساری بات سنی تھی۔

”تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔ اور شادی بیاہ زبردستی کے سودے تو نہیں ہوا

تے۔“

زرتاب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے ریسیور رکھا تھا۔

☆☆☆

”اباجی! بے شک آپ ہمارے بزرگ ہیں آپ کو ہر فیصلے کا حق ہے مگر اس فیصلے میں فریقین کی

نابھی شامل ہونی چاہیے۔“

رضوان بہت ٹھوس دلائل، اعتماد اور سکون کے ساتھ اباجی کے ہر سوال اور غصیلے تیروں کا جواب دے رہا تھا۔ وہ پرسوں امریکہ سے آیا تھا۔

اس کے آتے ہی من کا موڈ گل و گلزار ہو گیا تھا۔ اباجی اور اماں جی نے یہ سنہری موقع ہاتھ آتے ہی

نہن چار سال پرانا بکھیرا بنانے کی تحریک شروع کر دی تھی۔

”ہم نے کبھی کسی معاملے میں فیصلہ کرنے میں اتنی تاخیر نہیں کی نہ ہی کسی کے بہانے سنے ہیں۔

ابن سے کہو ہماری دی ہوئی آزادی اور محبت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ ہم صرف اس لیے برداشت لیتے ہیں کہ بن ماں باپ کی بچی ہے، نادان ہے۔ مگر اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ شادی کی عمر نکلی

ہی ہے اور سال دو سال بعد ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملے گا۔“

اباجی نے آغاز بڑی گھن گرج کے ساتھ کیا تھا۔

”جورشتہ آپ کی نظر میں ہے، زرتاب کی ادھر مرضی نہیں ہے۔“

”تو پھر اور کدھر مرضی ہے اس کی؟“ وہ جلال میں آگے اور دانت پیس کر گویا ہوئے۔

”ہمارے یہاں آج تک لڑکوں کو اپنی مرضی بتانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہاں کل کی چھو کر

مرضی بتائے گی ہمیں۔“

”اگر یہ حق نہیں دیا گیا تو غلط کیا گیا۔ یہ باعثِ فخر نہیں، باعثِ افسوس ہے۔“ رضوان بہرہ سے گویا ہوا۔

”آپ لوگوں کی ضد نے مجھے اور سن کو وقت سے پہلے باندھ دیا جس کی وجہ سے وہ تین سال انتظار کا عذاب کاٹ رہی ہے۔ شادی کا ٹائم تب تھا جب میں مکمل طور پر سبٹل ہو جاتا۔“ اس کا لہجہ کے روایتی جذباتی دماغ کو شکست دے گیا تھا۔ وہ غضب ناک ہو کر گرجنے برسے لگے۔ زرتاب لپیٹ میں آئی، لیکن ہوا وہی جو رضوان نے چاہا۔

اس نے بہت اچھے طریقے سے بہن کا مقدمہ لڑا تھا۔

”جیسا تم نے چاہا ویسا تو ہو گیا۔ مگر تم نے ”وجہ“ سے نہیں ملوایا مجھے۔“ جاتے سے وہ زرتاب مخاطب ہوا۔

”پلیز رضوان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ہنستا ہوا۔

”اوکے مان لیا مگر ایک بات یاد رکھنا جب بھی ایسی کوئی بات ہو مجھ سے ضرور ڈسکس کر میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے یقین ہے میری بہن جو فیصلہ کرے گی خوب سوچ سمجھ کر کرے گی۔“

اس نے زرتاب کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی اور پھر ہنستا ہوا اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔

”اف میرا بھائی سلامت نہ ہوتا تو اباجی تو جھونک دیتے مجھے اپنی مرضی کے جہنم میں۔“

اس نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا۔

☆☆☆

”طیبہ پھپھور ہا ہو کر آگئی ہیں۔ فصیح انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ کیا آپ ان سے ملیں گی؟“

اماں جی کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا۔

اس دیک اینڈ پر آئی تو اماں جی کو سنانے کے لیے اس کے پاس گرما گرم خبر تھی۔ وہ بہت غور ان کے چہرے پر خوشی اور دکھ کے گھٹنے بڑھتے سائے دیکھ رہی تھی۔

”اگر آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں تو میرے ساتھ جانے کے بہانے پنڈی چلی چلیں۔ کہہ دیجئے میرے والے ہسپتال سے کچھ ٹیٹ کرانے ہیں۔ فصیح وہیں پنڈی میں رہتا ہے۔ اب تو اسے ڈیڑھ ہو گیا ہے جاب کرتے ہوئے۔“

اماں جی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ پھر دو گرم آنسو گالوں کے موم پر ٹپکے۔

”کیا کروں گی اس کی اجازت اور ویران حالت دیکھ کر۔“ انہوں نے سرد آہ بھری۔

”اب تو کافی بہتر ہو گئی ہیں۔ جب آئیں تو بالکل سوکھ کے کاٹا ہو رہی تھیں۔ ایک ماہ ہو گیا انہیں فصیح کے ساتھ رہتے ہوئے، بیٹا، ماں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اس نے اسلام آباد میں آئی ٹین ایک پورشن کرائے پر لے لیا ہے۔ تھوڑا بہت فرنیچر بھی ڈال لیا ہے۔ سال بعد اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی۔ دو ماں بیٹا ہی تو ہیں بڑی اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے پھپھو کو فروٹ

بی کھانے کھلاتا ہے۔ دودھ باقاعدگی سے رات کو پلاتا ہے۔ ان کے لیے بے شمار کپڑے رکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں گھر کے کام کاج اور سودا سلف کا حساب کتاب رکھنا اسے کام آگیا ہے اس نے بڑے اچھے طریقے سے اپنا گھر سنبھال رکھا ہے۔“

وہ شرارت سے ہنس دی۔

اماں جی مسکرا بھی نہ سکیں۔ وہ تو ماضی میں کھو گئیں تھیں۔ زرتاب ویک اینڈ گزار کر واپس پنڈی آئی ام ملاکہ طیبہ پھپھو کا دوبارہ فون آچکا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ فارغ ہو کر گھر کا چکر لگاؤ وہ ڈیوٹی پوری کرنے بعد ہاسٹل جانے کے بجائے مری روڈ سے ٹیکسی لے کر آئی ٹین آگئی۔

ٹیکٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ اس کے پاس داخلی دروازے کی ایک ڈپٹی کیٹ موجود فصیح تو پانچ بجے آفس آتا تھا۔ وہ یقیناً اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ طیبہ پھپھو اپنے کمرے میں رہیں۔

وہ اندر آئی تو وہ واش روم میں تھیں۔ چھوٹا سا کیٹ پلیئر درمیانی آواز میں بج رہا تھا۔ کوئی بہت اغزل چل رہی تھی۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا

جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

زرتاب کے پاؤں سن ہو گئے۔ اس نے مضطرب نظروں سے واش روم کے بند دروازے کی دیکھا تھا۔

یوں تو ہر شام امیدوں میں گزر جاتی تھی

آج کچھ بات ہے، جو شام سے رونا آیا

زرتاب کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ خود کو سہارا دینے کے لیے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دماغ کہیں بھٹکنے لگا تھا۔

کبھی تقدیر سے شکوہ تو زما۔ اسے گلہ

منزل عشق کے ہر گام پہ رونا آیا

”ارے تم کب آئیں بھی۔“

کچھ دیر بعد طیبہ پھپھو تولیے سے چہرہ تھپتھپاتی ہاتھ روم سے باہر آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ خوش ہو جاتی تھیں کہ فصیح کے بعد واحد خونی رشتہ تھا جو رہائی کے بعد ان کو دیکھنے کو ملا تھا۔

”کل اماں جی کے ہاں سے واپس آئی تھی۔ آج ڈیوٹی دینے کے بعد آپ کی طرف چلی آئی۔ تازہ دست بھوک لگ رہی ہے پھپھو! یہ بتائیے کیا بنا یا ہے۔“

”تمہاری پسندیدہ دال چاول اور ہری مرچ کی چٹنی بنائی ہے چلے گی؟“

”چلے گی، دوڑے گی، ٹنڈاٹ دے دیجیے بس۔“

طیبہ پھپھو کو اس کی بے تکلفی اور اپنائیت پر مارے خوشی کے رونا آنے لگا۔ جیل میں رہ کر وہ ان جذبات کو جیسے بھول ہی گئی تھیں۔

زرتاب وہی گیت دوبارہ سننے لگی۔

”یہ کیسٹ کون لایا تھا؟ آپ یا فصیح؟“ وہ بچن میں بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
 ”بہت بہت پرانی کیسٹ ہے اور کیسٹ پلیئر بھی۔ میں جیل میں سنتی تھی۔“
 ”کیا وہاں اجازت تھی ایسی تقریحات کی؟“ وہ متعجب ہوئی۔
 ”تھی تو نہیں مگر جب بندہ طویل مدت تک جیل میں رہتا ہے تو وہ گھر ہی لگنے لگتی ہے۔ جیسا ہی گویا ”شریک“ بن جاتے ہیں وہ شریکا جو رشتے کی لاج نبھانے کے موڈ میں ہوتو ہر سہولت دے ہے۔“ وہ سنسنی مہی لیے گویا تھیں۔

”اور جب سے یہ فصیح کے ہاتھ لگی ہے وہ دن رات یہی سنتا ہے۔“
 وہ خاموش ہو کر انگلی کے ناخن سے میز کی سطح کھرچنے لگی تھی۔
 ”پچھو! ایک بات بتائیں گی۔“ وہ اچانک ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔
 ”اتنی طویل مشقت زدہ زندگی گزار کے آپ نے کیا پایا۔۔۔؟“
 ”پچھتاوے۔“ ان کا جواب برجستہ تھا۔

”لیکن انسان جب محبت کر رہا ہوتا ہے یا اس کے حصول کے لیے سرگرم ہوتا ہے اس وقت اپنے آپ کو سو فیصد حق پر سمجھتا رہا ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔“
 ”میں تو اس نتیجے پہ پہنچی ہوں زرتاب کہ رشتہ وہی ہوتا ہے جو معاشرتی حدود و ثبوت اور قاعدہ ضابطوں کے ساتھ استوار ہو۔ بزرگوں سے لڑکے ان کے مخالف چل کر اکثر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔“
 ”مگر ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا۔“ وہ بے ساختہ بولی۔
 ”بے شک ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا والدین کسی ذاتی خواہش یا ضد یا اتار پستی کے چکر میں بچوں کی تقدیر کے مالک بن بیٹھتے ہیں۔“ وہ بر دباری سے بولیں۔
 ”ایک بات اور، اپنے شوہر کو مل کر تے وقت ایک لمحے کو آپ کا دل نہیں کانپا؟ آپ کو اس شرماتے ہوئے کیسا لگا جو آپ کا محازی خدا تھا۔ آپ کی محبت تھا اور جس کا جرم بہر حال اتنا بڑا نہیں ہے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔“

”پلیئر۔“ وہ زرد رسوں جیسی رنگت لیے مرتعش سانسوں سمیت ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”برسوں تک جیل کی تاریک راتوں میں دلچسپی، اس لمحے سے وابستہ دکھ کی شدت اور اپنے ضمیر کی شدید لعنت پہنکار میری سوچوں کا مرکز رہی ہے۔ میں راتوں کو سونا بھول چکی ہوں زرتاب پچھتاوے کی آگ میں مرتے دم تک سلگتے رہنا میرا مقدر ہے۔“
 اچانک ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ تھوڑا کر گریں اور جب تک زرتاب اٹھ کر انہیں نہ جلاتی کے کوئے سے سرنگر اگر فرش پر بے سدھ ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

سب کچھ اچانک ہو گیا۔

ایک طویل مدت جیل میں گزارنے کے بعد وہ آزاد دنیا میں آئیں تو اس آزادی کو ایک لمحہ محسوس نہ کر پائیں کہ ان کا دل گھبرا گیا۔

اور کچھ ایسا گھبرایا کہ ان کی روح نفس غصری سے پرواز کر گئی، فصیح نے ان کی موت کی اطلاع بھائی بھی۔ طیبہ پچھو کی یہی وصیت تھی کہ کم از کم آخری وقت میں انہیں باپ اور بھائیوں کا کندھا جائے۔ والی چلی گئی تھی تو پھر کہاں کی انا، کہاں کی لغزشیں، دشمنیاں تو زندہ لوگوں سے کی جاتی ہیں۔ ابائی پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے بیٹی کا آخری دیدار کرتے ہوئے۔ پہلی بار فصیح کو پورے دل گلے لگایا تھا۔

پھر زندگی کا عنوان کچھ اور ہو گیا۔

”تم چاہو تو حویلی واپس آ سکتے ہو اور ہمارے ہاں ایک فرد کی حیثیت سے رہ سکتے ہو۔“

چلتے ہی انہوں نے آہستگی سے فصیح کو مخاطب کیا تھا۔
 وہ لوگ فصیح کے گھر میں ہی ٹھہرے تھے اور یہ بھی جانچ چکے تھے ان تین چار سالوں کی کڑی تنہا فصیح کو اس قابل کر دیا تھا کہ اب وہ معاشرے میں مقام حاصل کرنے کی دوڑ میں برابر کا بن چکا تھا۔

”شکریہ اباجی! میری جاب بہت اچھی ہے اور اس میں ترقی کے امکانات بھی واضح ہیں۔ اس میں یہاں بہت مطمئن ہوں۔“

اس نے تالعداری سے جواب دیا تھا۔

اباجی ہونٹ چبانے لگے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

ٹھیک ایک ماہ بعد فصیح کو حویلی بلوایا گیا۔

اباجی نے اپنی جائیداد اپنے چاروں بچوں تین بیٹوں اور ایک بیٹی میں شرعی لحاظ سے تقسیم کر دی۔ ب اور رضوان کے مرحوم باپ کا حصہ ان دونوں کو ملا تھا اور طیبہ پچھو کے حصے کی جائیداد ان کے وارث فصیح کے نام کر دی گئی تھی۔

”یہ لاکھوں کی پر اپنی ہے۔ چاہو تو بیچ لیتا اور چاہو تو کرائے پر اٹھا دینا، کسی مصرف میں لے آنا یہ مال تمہارا حصہ ہے۔“

اباجی نے کاغذات کی فائل فصیح کے سپرد کر دی۔

فصیح گود میں بڑے ان کاغذات کو خالی الذہنی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ایک آنسو چپکے سے دائیں سے لڑھکتا ہوا انہیں کے بالوں میں گم ہو گیا تھا۔

”یہ حویلی جہاں کی ایک انچ پر میرا قدم پڑنے پر یہاں کے کیمینوں کے دل میں شعلے اٹھنے لگتے آج وہی مجھے میرے حق سے نوازر ہے ہیں؟“

کتنے ہی تذلیل آمیز، نفرت بھرے رویے، اور چہرے اس کی نظروں میں گھومنے لگے تھے۔

☆☆☆

زرتاب کی ٹرانسفر دوبارہ لاہور ہو گئی تھی۔

وہ جانے کی تیاریوں میں تھی، جب ہاسٹل میں اس کے لیے فصیح کا فون آیا تھا۔

”اگر آپ فارغ ہوں تو میں آپ سے ملنے آ جاؤں؟ آپ نے تو گزشتہ چھ ماہ سے میرے گھر میں

قدم رکھنا گناہ تصور کر لیا ہے۔“

”جن کے لیے آئی تھی وہ نہیں رہیں تو۔۔۔ بہر حال تم آ جاؤ۔“ وہ پیکنگ کر کے فصیح کے انڈر میں ہاسٹل کے لان میں پہنچ کر بیٹھ گئی۔

مارچ کی دس تاریخ تھی اور بہار کے سارے ہی رنگ لان میں جابجا بکھرے نظر آتے تھے۔

نرم گرم ہی جانفزا ہوا

سبز چمکتے ہوئے ننھے ننھے نوخیز پتے

ہری ہری گھاس

تروتا زہ پیر

پھولوں سے لدی شاخیں

مہکتی کیاریاں

اور چہچہاتے ہوئے رنگ برنگے پرندے

سب چیخ کر اسے کہہ رہے تھے

لو بہار آگئی ہے

وکیو بہار آگئی ہے

”السلام علیکم!“ آہٹ کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

وہ نیوی بلیو پینٹ اور لائٹ بلیو شرٹ میں لباس تھکا تھکا سا، اور بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

وہ خاموشی سے اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”ہمارے ڈپارٹمنٹ میں کچھ جابز نکلی ہیں دوہنی کے لیے۔ میں نے بھی اپلائی کر دیا۔ اتفاق۔

میرا نام لسٹ پر آ گیا ہے۔ میں اگلے ماہ دوہنی جا رہا ہوں۔ چھ سال کا انٹریکٹ ہے۔“ وہ فضاؤں میں ہکا

ٹھول رہا تھا۔ ایک معنی خیز سا نا ماحول پر طاری ہو گیا۔

”اچھی بات ہے، مجھے یہ بتانے آئے ہو؟“ وہ اچانک طیش میں آگئی تھی۔

”میں یہ کہنے آیا تھا کہ۔۔۔“ فصیح کے انداز میں شکست خوردگی نمایاں تھی۔

”کانٹریکٹ تم نے اپنی مرضی سے قبول کر کے اپلائی کیا۔ اپنی مرضی سے جا رہے ہو۔ پھر مجھے؟

بتاتے ہو۔ اطلاع کرنی ہے تو اپنے گارڈین سے کرو۔ اب تو وہ تمہاری سنتے ہیں، تمہیں اپنے برابر؟

پہچان اور مقام دیتے ہیں۔“ وہ نہایت رکھائی سے گویا ہوئی۔

”آپ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟“ وہ اس کے اس طرح بھڑکنے پر پریشان ہو گیا۔

”میں ہر ایرے غیرے سے ناراض نہیں ہوا کرتی۔“ وہ اجنبیت سے بولی۔

”چار ساڑھے چار سال تک میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک ایک قدم چلنا سکھاتی رہیں، حتیٰ کہ وہ

کے میدان میں مقابلے میں شامل کر دیا اور اب کہتی ہیں ایرا غیرا، آپ بہت پتھر دل ہیں زرتاب

بہت بے درد ہیں۔ کیا اتنے برسوں تک میرے جذباتوں نے کبھی بھی آپ کے دل کو نہیں چھوا؟ میں

مخصوص مدت تک ان کو دل میں چھپائے رکھنے پر مجبور تھا مگر کیا آپ تک کبھی ان کی خوشبو نہیں

”ہاں؟“ وہ شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”بالکل ہی احمق اور گدھا ہے، یہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتا کہ اتنے قیمتی برس کیوں بھاڑ میں جھونکتی

ہوں میں۔“ وہ دل ہی دل میں دانت پیس رہی تھی۔

”امی نے محبت پانے کے لیے بزرگوں سے بغاوت کا جو غیر مناسب اور غلط طریقہ اختیار کیا۔ اس

انہیں جیل کی ذلت آمیز سزا دینا میں رسوائی اور اپنوں کی نفرت و دوری تک پہنچا دیا۔ ساری عمر انہوں

انگاریوں پر بسر کی۔ یہ انجام مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ میں آپ کو اس الاؤ میں نہ دھکیلوں،

لیے میں نے پسپائی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے آپ سے دور چلے جانے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں

اہوں۔ اباجی بھی راضی نہیں ہوں گے اس رشتے پر بلکہ وہی کیا گھر کا کوئی فرد بھی مجھے آپ کے شوہر

اپنے داماد کے روپ میں دیکھنا گوارا نہیں کرے گا۔ اس لیے میں ان کی مرضی کے خلاف قدم

اٹھاؤں گا نہ آپ کو مجبور یا پابند کروں گا۔ میں آپ کے ذریعے اپنی ماں کی تاریخ نہیں دہرانا

تا۔“ وہ پرسکون انداز میں گویا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب اور تکلیف نمایاں تھی، مگر وہ اپنے ارادوں پر

نوبلی سے قائم تھا۔

زرتاب نے ایک طویل سانس خارج کی۔

”ٹھیک فیصلہ کیا تم نے، اچھا اب تم جاؤ۔ میں پیکنگ کروں گی۔ ملک سے باہر جانے سے پہلے

لاب ضرور کرنا۔“ وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

اور اس سے پہلے کہ صبح مزید کچھ کہتا وہ تیز تیز قدم اٹھائی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

زرتاب نے اگلی شام بی سی او سے امریکہ رضوان سے بات کی تھی۔

”سوچ لو، اس کا بیک گراؤنڈ کیا تم اس کے ساتھ سروائیو کر لوگی سوسائٹی میں؟“ کافی دیر تک

موش رینے کے بعد رضوان نے استفسار کیا تھا۔

”ہرگز ری ہوئی چیز پر وقت کی گریڈ پڑ جاتی ہے رضوان! یہاں ایک ساتھ ایک گھر میں رہتے

سے دوسرے کے بارے میں خبر نہیں ہوتی اور پھر وہ چھ سال کے لیے دوہنی میں رہے گا۔ اس کے بعد

بہم واپس آئیں گے تو بہت کچھ بدل چکا ہوگا۔“

”ہم؟ یعنی شادی کر کے اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟“ اور وہ بے اختیار جھینپ گئی تھی۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔“

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا تمہارا مطلب، فصیح کے بارے میں تم سے سب معلوم ہو چکا ہے۔ وہ

اسے خاندان کا ایک حصہ ہے۔ خون کا رشتہ ہے ہمارا اس سے اور سب سے بڑی اور ہم بات یہ ہے کہ

ہم ساروں میں خود کو تمہارے قابل بنا چکا ہے۔ خود کو اہل ثابت کر چکا ہے اس لیے محض اس کے ماں

پ کے مامی کی بنیاد پر اسے شکر انا درست نہیں لگتا۔“

”اور وہ اباجی اور اماں جی۔“ وہ جھج کر پوچھنے لگی۔

”انہیں بہر حال میں قائل کر لوں گا۔ ان کی اجازت لے کر ہی یہ شادی انجام پائے گی۔ میں اگلے

ماہ آ رہا ہوں۔ سمن کا نکلت اور ویزا بھی ساتھ لاؤں گا، اپنے پندرہ دن کے قیام میں تمہاری شادی پڑا سمن کو ساتھ لے کے امریکہ واپس آ جاؤں گا۔ تم صبح سے کہو اپنی دوہی روائی کو اگلے دو ماہ تک لے لے۔ اس دوران تم اپنا پاسپورٹ بھی بنالو اور ویزے کے لیے اپلائی کر دو۔“

”آپ کے خیال میں اباجی آسانی سے راضی ہو جائیں گے؟“

”آسانی سے ہوں یا مشکل سے۔ بہر حال یہ وعدہ رہا کہ وہ شادی اپنے ہاتھ سے کریں گے اور خود تمہیں رخصت کریں گے۔ میں ماضی کی کوئی رخ روایت دہرانا پسند نہیں کروں گا۔ نہ طیبہ پھپھو والی اور نہ اپنی اور سمن کی طرح کی۔ مجھے صبح کا نمبر دو آفس کا۔ میں ذرا اس رشتے کی تحقیقات کرنا چاہتا ہوں۔“

اور اسے رضوان پر پورا بھروسہ تھا۔

☆☆☆

”السلام علیکم! بڑی مشکل سے فرصت نکال کر آپ کو رخصت کرنے آئے ہیں۔ آج تو آپ کو رخصت کر رہے ہیں اور کچھ ہی دن کی بات ہے جب آپ کو ہمارے ساتھ رخصت ہو کر ہمیشہ کے لیے ہمارے دل اور گھر میں آباد ہو جاتا ہے۔“

وہ سامان لے کر ہوٹل سے روانہ ہونے کو تھی کہ فصیح نے اسے موبائل پر کال کر کے وہیں رکنے کو کہا تھا اور مزید پندرہ منٹ بعد وہ آچکا تھا۔

”نی الحال تو یہ چھوٹی سی سینڈ ہنڈ بائیک ہی سواری کے لیے پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں عنقریب جب ہم باہر جا کر پیسے کمائیں گے تو آپ کی خدمت میں آپ کی مرضی کی شاندار سواری پیش کریں گے۔ ویسے تو اس کام کے لیے ہمارے بازو بھی حاضر ہیں۔“

زندگی کے تمام شوخ رنگوں سے بھرپور، جاندار لب و لہجہ، پُر جوش آنکھیں جو جگنوؤں کی طرح دک رہی تھیں، بھلا زرتاب ان کا سامنا کیسے کر سکتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پللیں جھکالیں اور مصنوعی ناراضی سے رخ موڑ لیا تھا۔

”شریف لڑکیوں کو سر عام تنگ کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی؟“

”بالکل آتی ہے۔ اسی لیے تو ہم شرما شرمی میں آپ کی پلکوں کے سائے تلے چھپنا چاہتے ہیں۔ آپ کی زلفوں کے سائے میں آنا چاہتے ہیں۔“ وہ شوخ جانے مزید کیا کہے جا رہا تھا۔ اس کی بس بکلی سمجھ میں آیا کہ ”فل انشاپ“ کی غرض سے بائیک پر سوار ہو جائے۔

”میری ٹرین نکل جائے گی جلدی کرو۔“ اس نے بیگ گود میں رکھ کے سختی سے حکم دیا تھا۔

”مگر میں نے اپنی زندگی کی ٹرین پکڑ لی ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں اب۔“

وہ سرشاری کی ترنگ میں تھا۔ اس کا ایک ایک عضو پکار پکار کے داستان سنا رہا تھا کہ اس نے زندگی سے اپنے حصے کی ساری بہاریں چرا لی ہیں۔

☆☆☆

آگئے ہیں نکھار کے موسم

”آخر بکرا کب آئے گا ہمارے گھر میں؟“ اتنے شور شرابے میں بھی احمد کی چلائی ہوئی آواز بڑی کے اس وسیع و عریض اور گنجان آبا کوٹھی کے مینوں کے کانوں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔

”بکرے پہلے کیا کم ہیں ہمارے گھر میں۔“ غیر جل کر بولی تھی۔

”افوہ۔ گھر والو! جاگ جاؤ، عید قربان یعنی کہ بکرا عید سر پہ آکھڑی ہوئی ہے اور یہاں کسی کو کوئی احساس ہی نہیں ہے۔“ احمد سے چھوٹا احمر اس سے بھی بلند آواز میں شور مچا رہا تھا۔

”بقرب عید کی تیاریاں اور روٹیاں کب شروع ہوں گی ہمارے ہاں۔“ احسن نے اپنا بریف کیس ٹیبل پر اچھال کر آہ بھرتے ہوئے لہجے کو مزید دردناک بنایا۔

”اماں جی! میں کہتا ہوں اس بار پورے چھ بکروں کا جلوس نکلتا چاہیے ہمارے گھر سے تاکہ محلے والوں کو پتا چلے اور۔۔۔“

احمد نے جوش کے ساتھ اماں جی کے کندھے دبائے۔

”لوگوں کو ویسے ہی اچھی طرح خبر ہے کہ اس گھر میں ایک ندو پورے ”چھ“ بکرے رہتے ہیں۔“

غیر نے بھٹا کر گوہر افشانی کی۔

”ایک تو اس کو خواخواہ مرچیں لگی رہتی ہیں۔“ احسن نے غور سے تمللاتے چہرے اور بگڑے تیوروں والی غیر کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”اباجی آئیں گے تو ان کے سامنے کرنا میری شکایتیں۔“ وہ اسے دیکھ کر غرائی۔

”اوہو جل گئی، جل گئی۔“ احمد ہنسنے لگا تھا۔

”فصیح کیوں سوار رہتا ہے تمہاری اس مٹھی ہی ناک پہ؟“

احسن چھیڑنے سے باز کیسے رہ سکتا تھا۔ یوں بھی اسے غیر کو چھیڑ کر بہت مزا آتا تھا۔ اس کے تمللاتے روپ کی لالیاں اور آنکھوں میں لپکتے غضب کے شرارے چہرہ ابن کر سیدھا اس کے دل پر لگتے تھے۔ (ان کی بات بچپن سے طے تھی۔) وہ جی بھر کر حظ اٹھاتا تھا۔

”دیکھ رہی ہیں تانی امی آپ۔“ اس نے اپنی ”متوقع“ ساس سے رجوع کیا۔

”احسن! کیوں چھیڑتے ہو بچی کو۔“ تانی جان اپنی روانی میں مٹر چھیلنے ہوئے بے ساختہ کہہ گئیں۔

”تو اور ”کے“ چھیڑوں۔“ احسن کا معنی خیر قہقہہ اپنے تعاقب میں بہت سے مردانہ قہقہوں کو لے کر آیا تھا۔

غیر کا یہاں ٹھہرنا دو بھر ہو گیا۔

وہ سیر تھکتے ہوئے ہال کمرے سے نکل گئی۔

”کیوں ستاتے ہو میری بیٹی کو اتنا۔“

اپنے آپ میں گم، سادہ دل، مختص اور با آسانی بلیک میل ہو جانے والی تائی جان سب کی ہی پسندیدہ تھیں۔ چار جوان جہان بیٹیوں اور دو بیٹیوں کی ماں تھیں اور اس کوٹھی کے نیچے والے پورشن میں مقیم تھیں۔ اور پر والے پورشن میں چچی جان رہتی تھیں۔ اپنے دو بیٹیوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ جن میں سے ایک عائشہ کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسری غیر کی احسن سے بات طے ہو چکی تھی، اس لیے چچی جان بیٹیوں کے معاملے میں کافی حد تک مطمئن تھیں کہ دونوں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔

چچا جان کی وفات کے بعد تائی جان یعنی اباجی ہی گھر کے ”مردانہ سربراہ“ تھے۔ ”زنانہ سربراہ“ دادی جان تھیں جنہیں لڑکوں کی قوم لاڈ سے اماں جی بھی کہتی تھی۔

”بتا ہے امی! اس کا چہرہ اور اس کے انداز پکار پکار کر کہتے ہیں۔ آؤ مجھے چھیڑو، آؤ مجھے ستاؤ، میرا دل جلاؤ، مجھے غصہ دلاؤ۔“ احسن ہنس رہا تھا۔ اس کے لہجے میں غیر کے لیے جو اپنائیت چھپی تھی، اس سے سب ہی واقف تھے۔

”بھابھی! عائشہ کا فون ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔“ چچی جان سیڑھیوں کے نیچے رکھے ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس کھڑی بلارہی تھیں۔ تائی جان لیک کر اٹھیں۔

”کھانا کب لگے گا لڑکیو۔“ احمد نے بڑی مظلوم آواز بنا کر صدا لگائی۔

”صبر کرو، اباجی تو آلیں اور دادی اماں بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔“ سارا نے ڈپٹ کر کہا۔

”سارا! اوسارا! بھئی سارے کا سارا کھانا خود نہ کھا جانا، کچھ ہمارے لیے بھی رکھنا۔“ وہ احمد ہی کا جواب کی گت نہ بنائے۔

”پکایا کیا ہے؟“

”حسن منزل“ میں ہمیشہ سے رات کھانے پر خاصا اہتمام ہوتا تھا اور خاص طور پر ہفتے کی شام تو گویا بقول سارا کے من و سلوی اتر آتا تھا مینز پر کیونکہ اس دن دستور کے مطابق سب چھڑے ہوئے ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ عائشہ سسرال سے آئی تھی۔ دادی کی دونوں بیٹیاں صبا اور نور ماں سے ملنے آڈ تھیں۔ رات کو بہت رونق میلہ لگتا تھا۔ سارے مہمان رات کو میہیں رکھتے تھے۔ دیر تک جاگا جاتا، گیکر لگتیں، چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس، چپس اور ڈرائی فروٹس کے وقفے وقفے سے سلسلے چلتے رہتے۔ پور اتوار کی صبح اماں جی کے علاوہ سب ہی دیر سے اٹھتے تھے اور صبح کا ناشتا بارہ بجے سے پہلے نہیں بناتا تھا۔ دوپہر کا کھانا چار بجے لگتا۔ کھانا کھا کے شام کو سب حسب معمول اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے تھے۔

آج بھی ہفتے کی شام تھی اور گھر والوں کو اپنے معزز مہمانوں کا انتظار تھا۔

غیر، سارہ اور مدیحہ نے چچی جان کے ہمراہ کچن سنبھالا ہوا تھا جبکہ تائی جان ”رائیٹرل“ فراہ کرنے کی ذمہ دار تھیں۔ سبزیاں دھو کے کاٹ دیں، گوشت صاف کر کے دیا، چاول یا دال چن دی۔

”اصولاً گھر کے کچھ کام ان مسنڈوں کے بھی ذمے ہونے چاہئیں۔“ غیر ہر ویک اینڈ پر ان یوں کی ٹانگ پہنتی تھی۔ ”اور نہ سہی تو کم از کم ہفتہ اتوار تو انہیں کام میں ضرور ہاتھ بٹانا چاہیے۔“

”کیوں نہیں بٹاتے ہم۔“ احمد جو ابھی ابھی سودا سلف لے کر آیا تھا، ہاتھ نچا کر چمک کر گویا ہوا۔

”سارا سودا میں ڈھو کے لایا، بھری منڈی میں اچھا خاصا جھگڑا کر کے آلو، پیاز اور دوسری سبزیوں کے ریٹ کم کرائے پھر گوشت والی دکان پر لمبی قطار کوٹوڑ کے قصائی صاحب سے گوشت کٹوایا اور پھر بھاری کے پاس پہنچ کر تمہارے لکھے ہوئے مسالے نکلوائے پھر فروٹ منڈی میں جا کے اچھا مال بانٹ کے نکلوایا پھر۔۔۔“

احمد صاحب ایک بار شروع ہوئے تو پھر ان کو اسٹاپ کرنا مشکل ہو گیا۔

”بس بس رہنے دو لڑکے! اپنے کام کاج کے قصیدے۔ توبہ۔۔۔ نماز پوری کرنا دو بھر کر دیا تم نے۔ جاؤ دیکھو، صبا ابھی ہے یا نہیں۔“ کہو، اماں جی بلارہی ہیں۔“

اماں جی نماز ادا کر کے ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔

”توبہ توبہ۔۔۔ صبا پھپھو کو جگانا یعنی ان کی نیند میں خلل ڈالنا۔ اس کی مجال نہیں ہے مجھے۔ مجھے تو ن کی کلف لگی نہایت پر تکلف اور خطرناک حد تک سنجیدہ شخصیت سے دیے ہی بہت خوف آتا ہے۔“

احمد نے کانپنے کی ایکٹنگ کی پھر ایک دم کونے میں بیٹھی اتنی دیر سے خاموشی ان کی باتیں سنتی روحا لود کچھ کر جمل سا ہو کر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

”ہوں ہوں۔“ چچی جان نے روحا کو متوجہ دیکھ کر گھور کر احمد کو دیکھا۔

روحانے احمد کی بات سنی تھی اور چچی جان نے اپنی چھوٹی ممانی کی تنبیہی نظروں کا بھی بخوبی شاہدہ کیا تھا۔ اس نے نمی کے بارے میں احمد کے یہ منکس سن کر قطعاً برا نہیں مانا۔ اس کی می ایسی ہی تھیں۔ بہت اکیٹو، ہر دم مصروف، ہر وقت جلدی میں رہتیں۔ مقابل کو خود سے زیادہ فری ہونے کا موقع پس دیتی تھیں۔ ان کے چہرے پر چھائی سرد مہری، جمود اور ایک پر خوف سا سکوت خود روحا کو بوکھلا دیتا تھا۔ سب ان سے بات کرتے ہوئے نہایت محتاط ہو جاتے تھے۔

”میں دیکھ آئی ہوں، وہ ریٹ کر رہی ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ ڈرنٹاں تک نیچے آئیں گی۔“ کچھ دیر بعد سارا نے آکر تازہ ترین اطلاع بہم پہنچائی۔

”یوں اکیٹو کونے میں لگ کر کیوں بیٹھی ہو بیٹا! اپنے بہن بھائیوں میں ہنسو کھیلو۔“ اماں جی نے اپنی اس گوری گلابی سیاہ جینز اور وائنٹ جرسی میں ملبوس ریزرو بلکہ بوری بیٹھی نواسی کو دیکھ کر نرمی سے تجھایا۔ ادھر ادھر سے کھی کھی شروع ہو گئی۔

”ہاں بھئی، امریکن کرن! آؤ ہم سے ہنسو کھیلو۔“ شرارتی احمد تو فوراً ہی بول پڑا۔

روحا بری طرح بزل ہو گئی مگر اپنی عادت کے مطابق کچھ کہہ نہیں سکی۔ یوں بھی اس کی اردو صاف تو تھی مگر اتنی با محاورہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ کلمہ توڑ جواب دے سکتی۔ پچھلے سال ہی تو وہ لوگ امریکہ سے مستقل پاکستان شفٹ ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بہن شہلا کی امریکہ میں ہی شادی ہوئی تھی۔

بڑے بھائی سمیر نے کئی سال پہلے امریکہ سے واپس آکر آرمی جوائن کر لی تھی۔ وہ اب میجر تھے۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اتنے سارے جانوروں کی موجودگی میں مزید لانے کی کیا ضرورت ہے۔“ عیبر نے جل کر حساب چکاتا کیا۔
 ”بھئی، سمجھا کر دنا۔“ مدیحہ کھلکھلائی تھی۔ ”یہ زبان والے ہیں، وہ ”بے زبان“ ہوں گے۔ آخر اپنی تو ہونی چاہے ناگھر میں۔“

”یہ علی اور ولی ابھی تک نہیں آئے انسٹی ٹیوٹ سے۔“ چچی جان کو اپنے دونوں سپوتوں کی فکر دہی تھی۔ دونوں نے بی بی ایس کے بعد کسی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔
 ”چھٹی کا ٹائم تو ہو چکا۔“ احسن نے گھڑی دیکھی۔ ”آتی ہوگی ان کی پھٹ پھٹی۔ اگر راستے میں لمبی خراب نہ ہو، تو مزید پانچ منٹ بعد پہنچ جائے گی۔“

اور یہی ہوا، پانچ سات منٹ بعد بغیر سائنسر کے ان کی موٹر بائیک گیٹ پر بارن دے رہی تھی۔
 احمر نے جا کر دروازہ کھولا۔

”آگئے مہمان گرامی۔“ علی نے پورچ میں کھڑی صابھچھوکی گاڑی دیکھ کر خود ہی اندازہ کر لیا۔
 ”ہاں بھئی، امریکن تو پہنچ گئے، البتہ اپنے بلوچی مہمان نہیں پہنچے۔“

احمر کا اشارہ نور پھچھوکی طرف تھا جن کے میاں کا تعلق بلوچ قبیلے سے تھا۔
 ”وہ پہنچنے والی ہیں۔“

”اور عائشہ آئی؟“ ولی نے اپنی بڑی بہن کے بارے میں استفسار کیا۔
 ”ان کا ابھی فون آیا تھا۔ چنگی کی طبیعت خراب ہے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہیں۔ انہوں نے اس بار آنے سے معذرت کر لی ہے۔“

”اوہو، ویسے آپ اور ان کے میاں سے چھیڑ چھاڑ کا اپنا ہی ایک مزا ہوتا ہے۔“ ولی ان کے ساتھ ماتھ چلتا ہال کمرے میں آ گیا۔

”السلام علیکم ذیہ کزن!“ علی اور ولی نے باری باری روحا سے سلام دعا کی۔
 ”جی، وعلیکم السلام۔“ وہ مختصر اکہہ کر چپ ہو گئی بلکہ اسے چپ لگ گئی۔

”آگئے خیر سے کمپیوٹر کی دنیا میں حشر برپا کر کے۔“ مدیحہ نے استقبالیہ مسکراہٹ سے نوازا۔
 ”یہ ولی کا بچہ تو انٹرنیٹ کھول کے بیٹھ جاتا ہے اور اللہ معافی دے، جانے کیسے کیسے خانے کھولتا ہے۔ استغفار میری تو نظریں ہی نہیں اٹھتیں۔ یہی اپنے گناہوں کی گھڑی کو بھاری کرتا رہتا ہے۔“

”ہاں ہاں، تم تو بڑے بیبیہ، بڑے سادہ اور نیک نفس لڑکے ہو۔ تب ہی تو ایسے ویسے خانوں کے اسے میں پوری پوری معلومات رکھتے ہو۔“ احسن نے اس کے کان بھینچے۔

”نور پھچھو آئیں۔“ سارا کے کان باہر رکنے والی فون کی آواز پر لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی خدیق بھی ہو گئی۔ ”آئیے آئیے، ڈڈو کا روالے پھو پھا جی۔“

نور پھچھو اور نور پھو پھا بہت ہی سادہ مخلص اور ہنسوز قسم کے میاں بیوی تھے اور بچوں کے فیورٹ بھی تھے، سو کر ما گرم استقبال ہوا۔ وہ سب طرف سے ہاتھوں ہاتھ لیے جا رہے تھے۔

روحا خاموشی سے مشاہدہ کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس کی ممی اور ابو کو کبھی اس طرح خوش دلی

اور کچھ سال پہلے ان کی شادی ایک کرنل کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ وہ چکالہ اسکیم تھری میں رہائش پذیر تھے اور مزاج میں وہ ممی سے بھی دو ہاتھ آگے ہی تھے۔ سخت انداز، لہجہ نصیحتی اور انداز خشک۔ دوسرے نمبر کے بھائی عمیر امریکہ میں ایم بی ایس کر رہے تھے۔ ابو کا بزنس امریکہ میں تھا اور اب پاکستان آنے کے بعد یہاں بھی ایک برانچ کھول لی تھی۔ سو وہ بھی امریکہ ہوتے تھے اور بھی پاکستان۔
 روحا کا پاکستان میں بالکل بھی دل نہیں لگتا تھا۔

ایک سال سے وہ بھٹی ہوئی روح کی طرح اسلام آباد کی بڑی سی کٹھنی میں تنہائی کے بے زار اور یاسیت بھرے شب دروازہ زارہ تھی۔

یہاں ”حسن منزل“ نانی کے ہاں آتی تو اس کا ڈپریشن اور بڑھ جاتا تھا۔ ہنستے کھیلتے، بے فکر اور محبت بھر ماحول میں پرورش پانے والے بے پروا سے کزنز اور ان کے چٹکے۔ ان کی گرما گرم غفلیں، لڑکیوں کی آپس کی رازداریاں اور خوش گلیاں۔ وہ چاہنے کے باوجود خود کو ان میں مدغم نہیں کر پاتی تھی۔ ممی کے حکم کی مجبوری پاؤں نہ باندھتی تو وہ بھی دیکھ اینڈ پریہاں نہ آتی۔

بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ روگردانی کرنا اسے سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ بے شک امریکہ میں پڑ بڑھی تھی مگر ماں کی تربیت، باپ کی شروع سے بیٹیوں کو خود سے در در رکھنے کی ادا اور بھائیوں کی حاکما: فطرت نے اس کے اندر سرکشی و بغاوت کو ابھرنے نہیں دیا۔ وہ خود کو واضح نہیں کر سکتی تھی، نہ اعتماد اور فخر چٹنگی اس کے نصیب میں جگہ کر سکتی تھی۔

شاید اسی لیے ظاہری جھلملائی خوب صورتی کے باوجود اس کی شخصیت بے کشش تھی اور اس کی صحبت بوریت اور بے زاری کا باعث تھی۔ وہ کسی جگہ پر اپنی کسی خوبی کی بنا پر امتیازی حیثیت نہیں حاصل کر پاتی تھی۔ نہ اس کی آواز اور انداز میں شگفتگی تھی، نہ لہجے میں برجستگی تھی۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ خود سے بڑھ کر کوئی کام کر سکے۔

لڑکے کمروں کی خرید کے لیے اماں جی سے بحث کر رہے تھے۔
 ”ارے بھئی! باری باری بولو، میں ایک وقت میں ایک بندے کی آواز سن سکتی ہوں۔“

سب کی اپنی اپنی بولیاں تھیں۔
 ”دادی جان ایک بات آپ ہم لڑکیوں کی طرف سے بھی سن لیں پلیز۔“ عمیر اپنی مخصوص خفا خفا سی آواز میں مخاطب ہوئی۔

”جی ہاں، انہوں نے بھی کوئی ”مشترکہ اعلامیہ“ جاری کیا ہے۔ ان کے ٹولے کی رائے بھی پوچھ لیجیے ذرا۔“ مقابل عمیر ہو تو احسن اپنی شرارت سے کیونکر باز رہ سکتا تھا۔

”بکرے عید سے ایک دن پہلے آئیں گے۔ پچھلی مرتبہ کی طرح ایک ہفتہ پہلے ہرگز نہیں آئیں گے۔ یہ لڑکے محلے میں شو مارنے کے لیے تو خوش خوشی انہیں چکا لٹکا کے رسیاں پکڑ کر باہر لے جاتے ہیں لیکن ان کے چارے، پانی اور گندگی صاف کرنے کے لیے ہم لڑکیاں ہی رہ جاتی ہیں۔“ عمیر نے کہا۔

”یہ تو تم لوگوں کا کام ہے۔ گھر کی صفائی اور ہمارے ”چائے پانی“ کا خیال بھی تو تم ہی رکھتی ہو۔“ احمد کی زبان میں ہلچلی ہوئی۔

اور بے تکلفی سے دیکھ نہیں کیا گیا بلکہ ان کے سامنے سب ریزر واد فارقل سے رہتے ہیں۔
 ”نور خالہ کو کیسے دل و جان سے سب سر آنکھوں پہ بٹھا رہے ہیں۔“ اس نے دل میں محرومی کا احساس ابھرتا محسوس کیا۔

”مئی بھی تو سب سے فاصلے پر رہتی ہیں۔ نہ کسی سے بے تکلف ہوتی ہیں، نہ کسی کے مذاق پر مسکراتی ہیں بلکہ مذاق کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ناراض ہو جاتی ہیں، اسی لیے کوئی ان سے مذاق کی جرات نہیں کرتا۔ خود بھی خاندان میں مقبولیت حاصل نہ کر سکیں اور مجھے بھی اس اعزاز سے محروم ہی رکھا مگر کیا کیا جائے۔ مئی کے ناپ تول کے پیمانے بہت مختلف ہیں۔ وہ ”خاندانی“ پسندیدگی کو کسی کھاتے میں ہی نہیں رکھتیں۔ وہ ان لوگوں کو اپنے پائے کا ہی نہیں سمجھتیں کہ بے تکلف ہوں۔ وہ تو خود کو کسی اور ہی پیمانے سے ناپتی ہیں۔ اپنا کیریئر، اپنی کامیابیاں، اپنی فٹنس، اپنے دونوں پارلرز کی روز بروز بڑھتی مقبولیت اور آمدنی اور ابو کے بزنس کی بیرون ملک بننے والی مضبوطی ساکھ۔

وہ حسرت بھری نظروں سے نور خالہ اور ان کی فیملی کے لیے خیر مقدمی کلمات و انداز ملاحظہ کرتی رہی۔ ان کے بچے رابعہ اور قیسر اپنے کزنز کے ساتھ کھل مل گئے تھے، اس سے بھی سرسری سی سلام دعا کی پھر وہ آپس میں ہنسی مذاق میں لگ گئے۔
 ”تو اصل بات یہ ہے کہ مجھ میں ایسی صلاحیتیں ہی نہیں ہیں کہ میں دوسروں میں کھل مل سکوں، ان کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی برت سکوں۔“ وہ اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اٹھ کر اوپر بیٹرس پر چلی گئی۔

حاضرین میں سے کئی ایک نے مڑ کر اس کو خاموشی سے باہر نکلتا دیکھا تھا۔
 ”ارے یہ ہماری امریکن نک چڑھی کزن کو کیا ہو گیا۔“ احمد نے حیرانی سے سب کی طرف دیکھا۔
 ”غور رہے، مئی سرتاپا غرور رہے اور غرور برحق بھی ہے۔“ احسن گھٹنوں کے نیچے کھنکھار کر ایزی ہوا۔
 ”اتنا بے تحاشا حسن اور پھر اس پر امریکہ میں پلنے بڑھنے کا فخر یہ احساس اور سونے پہ سہاگہ اتنے رئیس ماں باپ کی اولاد ہے۔ صبا پھوپھو کے دونوں پارلرز اسلام آباد کے سب سے پوش سیکٹر میں ہیں۔ جہاں سے ان کی روزانہ آمدنی فی پارلر کم از کم چھ سات ہزار سے نیچے نہیں آتی۔ حیات پھو بھاکا بزنس تو ویسے ہی کب کا کروڑوں کے ہندسے کو چھو چکا ہے اتنا پریش بیک گراؤنڈ بھی، اگر اس پر بھی وہ غرور نہ کریں تو یہ ان کی زیادتی ہوگی۔“ احسن نے بڑے دلچسپ انداز میں اظہار خیال کیا۔
 ”ہم نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے محترمہ کو اپنے ساتھ کس کرنے کی مگر وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔“ غیر نے شانے اچکائے۔

”میرا خیال ہے، وہ کم گو ہے۔“ سارا نے سادگی سے کہا۔
 ”اور یہ کم گوئی اس کے احساس برتری کا نتیجہ ہے۔“ احسن نے برجستہ کہا۔
 ”اور یہ برتری والدین کی طرف سے ورثہ میں بھی مل سکتی ہے۔“ مدیحہ بولی۔
 ”بالکل، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”مجھے تو صبا پھوپھو کو سلام کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔“ سارا نے جھرجھری بی بی۔
 ”یہ لوگ تو لگتا ہی نہیں ہے کہ ہمارے خاندان سے ہیں۔ نہ ان کی اپنی حیثیت سے ہم متوجہ کھاتے ہیں نہ ان کی پر تکلف انداز سے ہمارے مزاج ملتے ہیں۔“

”اچھا بھئی، اب کچھ کھانا دانا ہوا جائے۔ میرا خیال ہے تمام نشستیں پوری ہو چکی ہیں۔ یعنی ”کورم“ براہو چکا ہے۔“ احمد بھوک کا بہت کچا تھا۔
 ”اوندھ، اسامہ بھائی کے بغیر یہ ”کورم“ کیسے پورا ہو سکتا ہے۔“ سارا نے بہت پیار سے اپنے بڑے بھائی کو یاد کیا۔

”ارے، آج تو ان کا ڈرامہ بھی آنا تھا۔ وہی جو سلسلے وار آرہا ہے کراچی مرکز سے۔“ ڈراموں کی یقین مدیحہ نے ایک دم ہلڑ مچا دیا۔
 ”ہاں بھئی، آج ہفتہ ہے۔ یاد ہی نہیں رہا۔ چلوٹی وی آن کرو۔“ سب ٹی وی کی طرف متوجہ دگئے تھے۔
 ”دیکھنا تو سہی، بھائی کی کس اور نقوش ادا کار نعمان اعجاز سے کتنے ملتے ہیں۔“ مدیحہ نے بڑے شوق سے نظریں اسکرین پر مرکوز کیں۔

”اسامہ بھائی نے مارون گولڈ والوں کی طرف سے منعقد کی گئی کارریلی میں بھی تو حصہ لیا تھا۔“ فیصل نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھئی اور ہر سال کی طرح اب بھی انہوں نے ہی یہ ریس جیتی ہے۔ ان کا تو ارمان ہے کہ کس طرح ”پیرس ڈاکارریلی“ میں حصہ لیں اور اپنی ڈرائیونگ کے بہترین جوہر دکھائیں۔“
 ”ان کی لیکچر رشب کیسی چل رہی ہے۔ ایچ ایٹ کالج میں پڑھا رہے ہیں نا۔“ رابعہ نے تصدیق پائی۔
 ”ہاں، بوٹی کے لیکچر ہیں۔“ سارا نے فخریہ کہا۔

”اور ہمارے بھائی شو بڑے وابستہ ہونے کے باوجود بہت شریف، نمازی اور دین دار انسان ہیں۔“ احسن کے چہرے پر چمک تھی۔

”ویسے یقین نہیں آتا کہ ایک انسان میں اتنی ساری خوبیاں اور صلاحیتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ ایم ایس سی بوٹی، لیکچرر، کارریلی کے باقاعدہ والینٹر، شو بڑے کے مقبول ہیرو اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی احکامات کی بھی مقدور بھر پابندی کرتے ہیں۔“

رابعہ کے لہجے میں بے یقینی سی تھی۔ اسامہ کے ذکر پر رابعہ کا چہرہ جھلجھلا اٹھا تھا۔
 ”بس دیکھ لو۔“ سارا تاز سے بولی۔ ”اسامہ بھائی بہت غیر معمولی انسان ہیں۔“
 ”میں نے سوچا تھا، بھائی اچھی اچھی ہیر وینس پھنسا میں گے تو ہماری بھی بات بن جائے گی مگر وہ تو سیٹ سے اترتے ہی اپنی ساکھی ادا کاراؤں سے یوں اچھی بن جاتے ہیں، جیسے بھی جان پہچان ہی نہ ہوئی، بھائی جان کو ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت نہیں ہے۔“ سارا نے گھور کر بھائی کو دیکھا۔

”ہاں بھئی، وہ تو اتنی گوری چٹی، کم عمر امریکن کزن کو بھی لفٹ نہیں کراتے۔“ احسن نے سرگوشی کی اور سب کے قہقہوں نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

☆☆☆

”اسامہ بیٹے! اسلام آباد سائیڈ پہ جارہے ہو تو ایف سیون تھری بھی ہوتے جانا۔ تمہاری صبا پھوپھو کے لیے کچھ چیزیں رکھی ہیں، اسے پہنچا دینا۔ اس ویک اینڈ پر مصروفیت کی بنا پر انہیں سکی تھی۔“

”آئی ایم سوری اماں جی! میں بی ٹی وی ہیڈ کوارٹر جاؤں گا۔ ایف سیون کی طرف نکلنا نہیں بنتا۔ آپ احمد یاعلیٰ سے کہہ دیجیے گا۔“ وہ شائستگی سے گویا ہوا۔

”لو، وہ تو کب کے بیچ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔“ اماں جی نے بتایا۔
”کرکٹ بیچ ہے کسی دوسرے شہر کی ٹیم سے۔ وہ صبح صبح بچے گراؤنڈ میں پہنچ گئے تھے۔ پریکٹس بھی تو کرنی ہے۔“ چچی جان نے وضاحت کی۔

”اچھا۔“ وہ مجبور ہو گیا۔ ”لایئے، دے دیجیے پھر۔“ وہ کالا شاپرے لے کر گھر سے نکل گیا۔
اپنی گرین خیر اشارت کی اور بی ٹی وی ہیڈ کوارٹر چلا آیا۔ شناخت کی تو اسے ضرورت نہیں تھی کہ اس کا چہرہ از خود اس کی پہچان تھا۔ وہ سیدھا پروگرام منیجر کے پاس پہنچا جو سرکاری طور پر پروڈیوسر کے عہدے سے بیجنگ کی طرف آیا تھا۔ وہ اسے ایک تاریخی ڈرامے میں رول دینا چاہتا تھا۔ ایک زمانے میں جب وہ پروڈیوسر تھا تو اس کے بنائے گئے دو کامیاب ڈراموں کا مین ہیرو اسامہ ہی تھا۔

”اپنا بخاری صاحب یہ ڈرامہ کر رہے ہیں اور انہوں نے آپ کا انتخاب کیا ہے میرے کہنے پر۔ ہمیں سپہ سالار کے رول میں جو تانتا، جرأت اور عزم و استقلال چاہیے وہ تمہارے چہرے پر واضح طور پر نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے، اس کردار کے لیے تم سے زیادہ اور کوئی موزوں نہیں رہے گا۔“
”اوکے۔“ وہ زیادہ حیل و حجت کرنے کا عادی نہیں تھا، نہ ہی کسی رول کے لیے کسی پروڈیوسر، ڈائریکٹر کی خوشامد اور چالپوسی کرنے کا قائل تھا۔

اتفاقاً ہی اس فیلڈ میں آ گیا تھا۔ اس کے اسٹوڈنٹ کا باپ پروڈیوسر تھا۔ وہ سالانہ امتحانات کے موقع پر اپنے بچے کا رزلٹ ڈسکس کرنے کا کالج آیا تو اسامہ سے ملاقات ہوئی۔ اسے بی ٹی وی میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ بعد ازاں خود فون کر کے ایک رول آفر کیا۔ اسامہ نے قبول کر لیا۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا اور یوں اداکاری کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اچھا رول از خود مل جاتا تھا تو وہ کر لیتا تھا، نہیں تو اپنی ساری توجہ پیچھے رہنے اور کارریئر کے لیے پریکٹس کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔
”کل بخاری صاحب سے کسی وقت مل کر ٹائمنگ طے کر لینا۔ میرا خیال ہے تمہارا ایک اور کامیاب ڈرامہ بھی آن ایئر جا رہا ہے کراچی کے مرکز سے۔“

”جی۔“ اس نے ایک بار پھر مختصر جواب دیا۔
”اس ڈرامے کی ہر قسط ایک ہفتے پہلے تیار کی جاتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ مسلسل انگیج رہنا پڑتا ہے۔ آپ بخاری صاحب سے کہہ دیجیے گا کہ میرے اس شیڈول کو مد نظر رکھیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں کہہ دوں گا۔ چائے یا کولڈ ڈرنک منگواؤں۔“

”نوسر، جھینک یو۔“ وہ اللہ حافظ کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا اور لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے پارکنگ ایریا کی راہ لی۔

”ارے اسامہ جی! آپ یہاں کہاں؟“
ابھی وہ کوریڈور سے آگے اٹھنے میں آیا ہی تھا کہ اسے معروف اداکارہ نشاء مل گئی۔ سرخ کڑھائی کے سیاہ جاکٹ کے ٹیس سوٹ میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ اپنی خوب صورتی اور دلکش اداؤں کے

ظہن کا دل موہ لیتی تھی۔ اچھے متمول طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا رکھ رکھاؤ بڑے گھروں کی بڑی مگر زیادہ سنجھی اور پراعتماد لڑکیوں کی طرح تھا جو اپنی نزاکت، ذہانت اور اعتماد کی بنا پر اپنی بی بی ہیں۔

”جھے پروگرام منیجر صاحب نے بلایا تھا، کسی نئے تاریخی ڈرامے کا رول ڈسکس کرنے۔“ اسامہ نے مخصوص اور محتاط طبیعت کے مطابق مختصر اور جامع جواب دیا۔
”بہت خوب، جھے بھی اسی مقصد کے لیے کال کیا گیا ہے۔“ نشاء مسکرائی۔ ”اس کا مطلب ہے، بے میں بھی میں اور آپ ساتھ کام کریں گے۔“

”جی۔“ اسامہ بولا۔ جو ڈرامہ آج کل آن ایئر جا رہا تھا، اس کے ٹائٹل رول وہی دونوں کر رہے۔

”اجازت دیجیے گا، میں ذرا جلدی میں ہوں۔“
”جی ضرور۔“ اس کی سنجیدہ فطرت اور شائستہ و متین انداز کی بدولت نشاء اس کی بہت عزت کرتی

اسامہ وہاں سے ایف سیون تھری آیا، جہاں صبا پھپھو کی کوٹھی واقع تھی، وہاں سڑک کے ایک نوٹو اسار گراؤنڈ اور اس کے پیچھے بڑے بڑے بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھے۔ مارگلہ ہلز کا قریب سے رننے کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ دوسری طرف پورا ایف سیون تھری کا سیکٹر تھا۔ اصل میں ہوکا گھر سیکٹر کے بالکل اختتام پر بنائی جانے والی قدرے سنسان روڈ پر واقع تھا۔ اس جگہ پر اتنی اور سکون طاری رہتا تھا کہ اگر کوٹھیوں کے گیٹ کے باہر سبکدوش بنا کر بیٹھ سیکورٹی گارڈ نظر نہ آتا تو بالکل نظر میں بھی لگتا تھا کہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور انسانی وجود سے مبرا ہے۔ ہاں، کبھی کبھار گزرنے والی گاڑیوں کے بارن اس سکوت میں خلل ڈالتے تھے۔

پارلر کی وجہ سے گیٹ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ باہر سرسبز قطعہ باڑ، لگا کر کور کیا گیا تھا۔ باڑھ کے پاس گاڑی اپنی رائفل ہاتھ میں لیے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”جی صاحب! آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”صبا پھپھو سے۔ ان سے کہیے، اسامہ آئے ہیں حسن منزل سے۔“ اس نے گاگلز اتار کر جیب الٹے ہوئے کہا۔

”مالکن تو گھر پہ نہیں ہیں۔“
”کہاں گئی ہیں؟“

”وہ دوسرے پارلر گئی ہیں۔ تین سے چھ تک وہ ایف سکس والے پارلر میں بیٹھتی ہیں۔ یہاں پارلر ان کی اسٹینٹ لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ جب مالکن آ جاتی ہیں تو ان لڑکیوں کی چٹھی کر دی جاتی۔“ گاڑی نے تفصیلی جواب دیا۔

”گھر میں اور کون ہے؟“ کچھ سوچ کر اسامہ نے سوال کیا۔
”بس بے بی ہوتی ہیں اور تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ صاحب اکثر باہر ہی رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، انہیں بلا دیں۔“
”سوری صاحب! بے بی کو مالکن کی غیر موجودگی میں گیٹ سے باہر آنے کی اجازت نہیں۔
گارڈ نے معذرت کی۔“

”اچھا بھئی، مجھے تو اندر جانے کی اجازت ہے ناکہ وہ بھی نہیں ہے۔“ وہ جھلکا۔
”جی جی صاحب! آپ ان کے کزن ہیں، آپ ضرور اندر جائے۔ آپ پہلی بار آئے ہیں
لیے بتا دوں کہ ڈرائنگ روم اوپر ہے۔ نیچے ڈرائنگ روم کی جگہ پارلر بنایا گیا ہے۔ آپ سائیڈ والا
کھول کر اندر داخل ہوں گے تو سامنے میز ہیاں ہیں، سیدھا اوپر چلے جائے گا۔ ویسے تو اندر گھر کی
بھال اور کام کرنے والی دولڑکیاں موجود ہیں، وہ خود ہی آپ کو گائیڈ کر دیں گی۔“

گارڈ ایک سانس میں بتاتا گیا۔
اسامہ نے خاموشی سے ہونٹ بھیجنے، قدم آگے بڑھا دیے۔ اسے زیادہ بولنے والے لوگوں۔
کر بہت کوفت ہوتی تھی۔

فرنٹ ڈور کے اوپر پارلر کی تختی لگی تھی۔ سائیڈ ڈور گیراج میں کھلتا تھا۔ اس نے دروازے کا
کھینچا تو وہ از خود کھل گیا۔

وہ بہت جلدی میں تھا، اس لیے ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھا سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ سیڑھوں
اختتام پر بڑا سلاؤنچ ٹائپ ہال تھا، جہاں دو صوفہ سیٹ مع ڈیکوریشن ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔
سائیڈ پر چونسٹاچ کانی وی رکھا ہوا تھا، اس کے نچلے خانے میں سی ڈی پلیئر نظر آرہا تھا۔

بائیں دیوار پر دو دروازے تھے۔ ایک کھلتا تھا اور اندر سے ایک بیڈ روم کا پورا پورا سین نمایاں
بالکل سامنے ڈبل بیڈ تھا جس پر خوب صورت بیڈ کور بچھا ہوا تھا۔ سامنے والی دیوار پوری کا
سے بھری ہوئی تھی۔ جو ٹیپ سے چپکائے گئے تھے۔ بیڈ کی پائنتی کے مقابل بڑی سی رائٹنگ ٹیبل تھی
پر کتابوں کے بجائے سی ڈی ریک۔۔۔ بیڈ روم کے امپورٹنڈ ڈیک، آڈیو کیسٹس اور کچھ سجاولی اشیاء رکھی
تھیں۔ میز کے دائیں جانب خالی جگہ پر کٹن رکھ کر اس پر بے شمار اسٹف ٹوائز سجائے گئے تھے۔
ٹیڈی بیز بیڈ کے درمیان میں استراحت فرما رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر بھی ایک جدید کیسٹ پلیئر رکھا ہوا
جس کے دو بڑے بڑے اسپیکر دونوں بیڈ سائیڈز پر چھوٹی میزوں پر رکھے تھے اور اس وقت
آواز میں انگلش میوزک کمرے میں گونج رہا تھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اور واش روم سے پانی گرنے کی آواز میوزک کی ہلکی بیٹ پر بچاؤ
سنائی دے جاتی تھی۔

صوفے پر بیٹھے بیٹھے اسامہ نے پورے بیڈ روم کا جائزہ لے لیا تھا۔ (اور کچھ تھا بھی تو نہیں کر
کو) دروازے کے اوپر ”ڈونٹ ڈسٹرب“ کا غزبہ لکھ کے چپکایا گیا تھا۔ سامنے والی دیوار پر ہاتھ
سنے کا ٹونز اور دیگر بچکانہ جملے بھی کاغذ پر لکھ دکھائی دے رہے تھے۔ مثلاً اپنے نام کا شارٹ ”رو“
امریکن دوست کا نام ”جینی“ کچھ تصویریں بھی فریم کروا کے بیڈ کی پشت پہ بنے چوڑے خانے میں
لگی تھیں۔

اسامہ اپنے مشاہدے میں مگن تھا کہ پچھلی طرف سے ٹیرس کا دروازہ کھلا، اس نے گردن موڑ کر
اٹھارہ بیس سال کی دہلی پتلی کالی بھنگ لڑکی عینک لگائے ہاتھ میں دھلے ہوئے کپڑے اٹھائے
اسے دیکھ رہی تھی۔

”آ۔۔۔ آپ۔۔۔!“ یقیناً وہ ملازمہ تھی۔
”میں صبا پھوپھو کا بھتیجا ہوں۔ ان کے بڑے بھائی کا بڑا بیٹا۔۔۔“ اس نے اپنے مزاج کے
وضاحت سے جواب دیا۔
”میڈم تو گھر پر نہیں ہیں۔۔۔“

”ان کی بیٹی تو ہیں۔ انہیں بلا دیں۔ اماں جی نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں ان کے لیے۔“
”جی۔۔۔ روحا بس ابھی واش روم سے فارغ ہو کر آئی ہے۔ روحا، روحا۔۔۔“ وہ بیڈ روم میں جا
ش روم کا دروازہ بجانے لگی۔

”آ رہی ہوں۔۔۔“ روحا کی غصیلی آواز بروہ جھک کر پیچھے ہو گئی۔
”بے بی آ رہی ہیں۔۔۔“ وہ اسامہ سے کہہ کر نیچے چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد ہاتھ روم کا دروازہ کھلا۔
”کیا آفت آگئی ہے۔۔۔ سرین۔۔۔“

وہ نیوی بلو ٹراؤزر، نیوی بلو ہڈ والا زیپر پہنے ہوئے تھی جس میں اس کے بھرپور متناسب جسم کا ہر
بنایاں ہو رہا تھا۔

چہرے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ دھلے ہوئے گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا لے
کو چھوٹے بال عجیب بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، جیسے انہیں سلجھانے کا موقع نہ ملا ہو۔ کچھ
اچہرے پر چپکی ہوئی تھیں، باقی شانوں اور کمر پر پریشان تھیں۔
اسامہ کو اس کا حلیہ دیکھ کر اپنا غصہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

وہ یوں بھی ایسی ”ماہی منڈا اماں“ مغرور سرکش اور بد دماغ لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے
ماںزل میں کئی بار ملاقات کے باوجود اس نے اس لڑکی کو کبھی لفٹ نہیں کروائی تھی۔
”آپ کے لیے اماں جی نے یہ چیزیں بھیجی ہیں۔“ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر شارپ صوفے پر
ریزی سے کھڑا ہو گیا۔

”ارے۔۔۔ آ۔۔۔ آپ۔۔۔ اسامہ بھائی، پلیز بیٹھے نا۔۔۔“ وہ اچانک اسے سامنے پا کر
تو بولکھلا ہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر شانوں پہ بکھرے بالوں کو سیننے لگی۔
اس کی اس بے تکلف ادانے اسامہ کے ماتھے پر بڑی ناگواری کی شکلوں کو مزید بڑھا دیا تھا۔
”صبا پھوپھو کو بتا دیجئے گا۔“ وہ قدم بڑھا چکا تھا۔
”آپ چائے، کانی، کولڈ ڈرنک، کچھ تو پیجئے نا۔“ وہ پریشانی سے اس کے پیچھے بیڑھوں تک آئی۔

”نوٹھنک ہو۔۔۔“ وہ خشک انداز میں کہتا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔
روحانیت بنی کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

اسے حسن منزل سے آئے ہوئے ایک معزز مہمان کے یوں آنا فانا بغیر خاطر مدارت کے جانے پر افسوس تھا۔

”پتا نہیں اسامہ بھائی مجھ سے اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ ایسے دیکھتے ہیں جیسے کسی بجز گھور رہے ہوں۔ اول تو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔“ وہ پشمرہ سوچوں میں گھری بیڈروم میں واہ آگئی۔

”آخر سب لوگ مجھ سے اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ کوئی خلوص دل سے میرا دوست نہ بنتا۔“

وہ افسردگی سے سوچتی رہی۔

کالج میں بھی اس کا یہی حال تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ جان توڑ کوشش کر رہی تھی، اپنے گروہ کی سرگرم اور ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی سوشل ممبر بننے کی۔ اسے لگتا تھا وہ اس معاملے میں نہایت ٹھس اور بے تاثر ہے۔ وہ ایک دن کالج نہ آئی تو کسی کو اس کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نہ ہی کوئی بڑا کام اس سے نہ آنے کی وجہ پوچھتا تھا۔ وہ لائبریری چلی جاتی تو کوئی دوست دوسرے پیریڈ میں ملنے کے لیے اس سے وقتی غیر حاضری کا سبب نہیں پوچھتی تھی۔ نہ اس سے بے تابی کا اظہار کر کے ناراض ہوتی تھی جب کہ گروپ کے باقی ممبرز آپس میں اسی طرح مضبوط پابند بنے ہوئے تھے۔ وہ خود ان کی دیکھا دیکھ دوسروں کے لیے ایسی ہی بے تابی اور خیالی و توجہ دکھاتی تھی۔ گروپ کی کسی لڑکی کی سالگرہ ہوتی تو پرجوش مبارک باد دیتی۔ ڈھیروں تحفے دیتی، مگر پھر بھی وہ لڑکی اس کے ساتھ اس لیول پر دوستی نہیں کرتی تھی۔

وہ مایوس اور بد دل ہونے لگتی۔

”مجھ میں ایسا کیا ہے کہ میں کسی کو اپنے خلوص اور اپنی سچی محبت کا احساس نہیں دلا پاتی۔ بے شک میں نے امریکن ماحول میں پرورش پائی ہے، لیکن میری تربیت تو خالص پاکستانی اسٹائل پہ گئی ہے۔ لڑکیاں مجھے خود سے الگ کیوں سمجھتی ہیں۔ مجھ سے کوئی بات شیئر کیوں نہیں کرتیں۔ میرے بھی وہی طوطے ہیں جو ان کے ہیں۔ مجھے بھی ان کی طرح گھر سے آسانی سے پریشانی نہیں ملتی دوستوں کے گھر جانے کی۔ میرے والدین بھی وہی سختی روا رکھتے ہیں جو دوسروں کے۔ مجھ سے بھی ایک ایک منٹ حساب لیا جاتا ہے۔ جیسے دوسری لڑکیوں سے کالج سے دیر سے آنے یا لیا جاتا ہے۔ میں بھی ان میں سے ہی ہوں۔ مگر یہ یقین ہی نہیں کرتیں۔ مجھے کوئی بہت الزام آؤ سوسائٹی کی نمائندہ سمجھتی ہیں۔ حالانکہ ایک بات ہرگز نہیں ہے۔ میں نے بے شک مجھے بہت آسائش دی ہیں۔ مگر آزادی بالکل بھی نہیں دی نہ ہی اتنی آزاد خیال ہیں۔

اسے لگتا تھا اس کی سہیلیاں اسے عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ بارہا انہوں نے بے تکلفی سے اس کے بوائے فرینڈز اور ڈریک کرنے کے بارے میں پوچھا تھا۔

”ارے بھئی، بتا دو، ہم سے کیا چھپانا۔ وہاں کارہن بہن، وہاں کا ماحول، وہاں کا لباس، ہر چیز کی پتوے تمہاری شخصیت پر۔۔۔“ روشا نے اس کی سب سے پسندیدہ سٹیلی کیسے دل دکھانے والے تے کیا کرتی تھی۔
وہ بہت دیر تک اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہی۔

☆☆☆

”روحانا! تم یونین فارم چھینج کر کے میرے کمرے میں آؤ۔“
وہ سائیڈ والے ڈور سے اندر داخل ہوئی تو میز پر پارے سے نکلے ہوئے تختی سے اسے حکم دیا۔
ان کو غصے میں دیکھ کر وہ بری طرح سہم گئی۔

اوپر گئی تو اس کے سر صوفے پر براجمان دکھائی دیے۔ وہ ان سے تینوں اختیاری مضامین کی ٹیوشن لے رہی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔ سر! آپ آج کچھ جلدی آگئے۔“

”جی مجھے آپ کے ہاں سے فارغ ہو کر ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ اس لیے آدھا گھنٹہ پہلے ہوں۔ آپ اطمینان سے چھینج کر لیجیے اور اگر کھانا دانا کھانا ہے تو بھی۔۔۔“

”نوسر! میں نے کینٹین میں کھالیا تھا۔ میں بس چھینج کر کے می کی بات سن کر پانچ منٹ میں آرہی تھی۔“

تھوڑی دیر بعد وہ می کے روبرو تھی۔

”جی می۔۔۔“

”می کی بچی۔ یہ تم کالج میں کیا گل کھلا رہی ہو؟“ وہ برس پڑیں۔

”میں کچھ نہیں۔“ وہ خوف زدہ نظر آئی۔

”تمہارے ٹیوٹر نے کہا ہے کہ آپ کی بچی کالج میں کیا کرنے جاتی ہے۔ نہ کوئی کلاس اینڈ کرتی، نہ اپنے سلیبس کی کچھ خبر ہے۔“ وہ بری طرح غصے میں دکھائی دیے رہی تھیں۔

آج کل اس کے ایگزٹام قریب تھے اور می نے سر سے درخواست کی تھی کہ ان تین سبجیکٹس کے دوسرے جنرل مضامین بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ اگر ردھا کو اس میں سے کچھ پوچھنا ہو تو سمجھا دیجیے۔

کل اس کا پاکستان اسٹڈیز کا پیپر تھا۔ سرنے پرسوں سے اس کی تیاری شروع کرائی تو پتا چلا کہ موز کو چپٹرز کے نام تک نہیں آتے۔ ٹاپک کی ڈسکشن تو ایک طرف رہی۔

ٹیوٹر نے صاف کہہ دیا تھا۔

”میڈم! دنیا کا کوئی بھی ٹیوٹر ایک دن میں کتاب کو گھول کر نہیں پلا سکتا۔ میرا تو خیال تھا، انہوں نے عمومی اسٹڈی کر رکھی ہے۔ صرف کچھ ٹاپکس میں پرائیم ہو رہی ہے۔ لیکن انہیں تو پاکستان اسٹڈیز کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ اب میں ایک دو دن میں انہیں کیسے اس سبجیکٹ کی تیاری کرا سکتا ہوں۔ جس کے بارے میں غالباً انہوں نے کوئی کلاس اینڈ کرنے اور کتاب کھولنے کی زحمت بھی نہیں

کی ہے۔ مجھے شک نہیں سو فیصد یقین ہے کہ انہوں نے ایک کلاس بھی اینڈ نہیں کی ہوگی۔“
اور صبا سر تھام کر رہ گئی تھیں وہ بڑی بے چینی سے اس کے کالج سے واپس آنے کا انتظار کرتی تھیں۔

وہ اتنی غصے میں تھیں کہ دو تین تھپڑ بلا درلغ اس کے منہ پر دے مارے۔
وہ مار کھانے کی بچپن سے عادی تھی۔ اس کے لیے یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ مگر ہر بار اپویشن پر وہ خوف اور ہشت کے مارے بری طرح لرزے لگتی تھی۔
”نالائق۔۔۔ کئی لڑکی! میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تم یاد رکھو گی۔ آوارہ، کیا کرتی رہتی ہو سارا کالج میں۔ کلاسز اینڈ نہیں کرتیں تو پھر کہاں ہونی ہو؟“

وہ اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی تھیں۔ گو کہ جس کلاس سے روح کا تعلق تھا، وہاں عموماً نہیں ہوا کرتا۔ مگر یہ ایک انوکھا اور اسٹیشنل کیس تھا۔ صبا بچپن سے ذرا سی بات پر اپنے بچوں کو دھک رکھ دیتی تھیں۔

خود میر بھائی اس کی کسی غلطی پر بنا دوسری بات کے سیدھا کرار اٹھڑ رسید کرتے تھے۔ اور ابو کہنا ہی کیا۔

بظاہر اتنے نفیس اور اعلا سماجی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ سب اپنے سے چھوٹا جالوں کی طرح مارتا نارمل خیال کرتے تھے۔ یہ فیملی دوہری شخصیات رکھنے والے افراد کا مجموعہ تھی۔ کے ظاہری مہذب اور کچھ ڈاسٹل کے پس پردہ درشت کھر درے اور وحشت زدہ رویے چھپے ہوئے تھے۔

وہ چپ چاپ تھپڑ کھاتی رہی۔
کیا بتاتی کہ اپنی دوستوں کے گروپ کو جوائن کرنے کے لیے وہ اپنی کئی کلاسز چھوڑ دیتی تھیں کیونکہ اتفاق سے وہ پیریڈ ان کے فری ہوتے تھے جب کہ روحا کا کبھی میٹن مختلف تھا۔ اس کی اینڈ بہت شارٹ تھی۔ بلکہ اسے تو ڈر تھا، اس بار اس کا سینڈ ایئر کا فاسٹل کا داخلہ روک لیا جائے گا۔ وہ کیا کر اس کا پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔

کتاب کھولتی تو ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
”تین تین سبجیکٹس کی ٹیوشن لگا کے دی ہیں، پھر بھی صاحبزادی دھڑا دھڑا کر رہی ہیں۔ ٹیوٹر بے چارہ کیا کرے۔ وہ سمجھا ہی سکتا ہے، نہ دماغ میں زبردستی گھسا سکتا ہے۔ نہ تمہاری جگہ جا پیپر زدے سکتا ہے۔“

”مئی! سبجیکٹس بہت مشکل ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتے۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔
”جب تم دلچسپی نہیں لو گی تو خاک سمجھ میں آئے گا۔“ وہ غرائیں۔

”تم جانتی ہو، تم پر ہر ماہ کتنا خرچ ہوتا ہے؟ تمہاری ٹیوشنر، تمہارے ڈریسر، تمہاری دل شاپنگ، تمہارے ڈھیروں ڈھیر مہنگے تحائف کی خریداری، جنہیں بے دردی سے اپنی سہیلیوں پر لہا ہوا۔ اتنا پیسہ لگا رہے ہیں تم پر۔ اور جواب میں صرف ایک توقع، ایک چیز ڈیمانڈ کرتے ہیں تم سے کم! لہذا اور مذاق کرے جیسے کہ اپنی دوسری گزنز غیر راجہ، وغیرہ سے کرتا تھا۔ مگر اس سے کسی کو کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔

وہ آزر دگی سے اماں جی کے پاس آگئی۔

”میں تھوڑی دیر آرام کروں گی اماں جی۔۔۔!“ صبا کچھ دیر تک گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر عادت اور پرچلی گئیں، جہاں ان کے لیے ایک کمر مخصوص کر دیا گیا تھا۔

”حسن منزل“ میں وہی رونقیں تھیں۔ وہی ہنگامے، وہی چھیڑ چھاڑ، وہی گہما گہمی۔۔۔ جہاں ہمیشہ خود کو مس فٹ محسوس کرتی تھی۔

”مزید دو بکرے آگئے۔۔۔“ علی اور احمد نعرہ مستانہ لگاتے ہوئے خوشی خوشی اندر آگئے تھے۔

”اچھا۔۔۔ کس رنگ کے ہیں؟“ مدیحہ اور سارا نور ان کے دیدار کے لیے باہر لپکیں۔

”خوب ٹکڑے اور اونچے لمبے جن کے لائے ہیں۔ ارے بھی صبا پھپھو کے بکرے ہیں آخر

ان ہی کی طرح معزز اور بیش قیمت اور۔۔۔“

دلی اپنی جھونک میں بولتا ہوا آیا تھا کہ سامنے روکا کو دیکھ کر زبان دانتوں تلے دبالی۔

”بولنے سے پہلے کچھ دیکھ تو لیا کرو۔“ سارا نے سرگوشی میں کہتے ہوئے دلی کو کہنی ماری۔ جو

نے صاف دیکھ لی تھی۔

”کب ذبح ہوں گے یہ بکرے؟“ علی نے کھڑکی سے لگ کر حسرت سے باہر چھوٹے سے

میں بندھے بکروں کی قطار کو دیکھا۔

”ہا۔۔۔ کب کھائیں گے ہم، ان کا لذیذ گوشت۔۔۔“ احمد نے آگے سے ٹکڑا جوڑا۔

”کب نہیں گے ان کے سب کباب، تنکے بوٹی، مٹن کڑا ہی۔“ دلی نے حاشیہ چڑھایا۔

”نی الحال تو اباجی تمہاری تنکے بوٹی بنانے آرہے ہیں۔ صبح سے بے زبان بے چارے بھو

بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے چارہ کون خرید کے لائے گا۔“ مدیحہ نے باہر سے آکر اطلاع دی۔

”گیا تو ہے احسن۔۔۔“ دلی نے کسل مندی سے پاؤں صوفے پر سارے۔

”احسن۔۔۔! وہ آج کا گیا کل لوٹے گا۔“ عمیر نے سر جھٹک کر پیش گوئی کی۔

”چلو۔۔۔ وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا۔ آئے گا تو سہی نا۔“ مدیحہ نے شوشی سے

کندھا مارا تھا۔

”لوٹا۔۔۔ ارے بھی کہاں ہے لوٹا۔ میں لان کے پودوں کو پانی ہی دے لوں۔“ چچی جان۔

اپنی دھن میں پکار لگاتی تھی۔

ہال کمرے میں ادھر ادھر بے ساختہ تہقبہ ابھرنے لگے۔

”اس قطعے کو لان کہہ کر آپ لان کی تو بین کر رہی ہیں چچی جان!“ احمد نے دہائی دی۔

”ہے تو سہی نا۔ چھوٹا سا ہے تو کیا ہوا۔ شکر ادا کر، اتنا بھی ہے۔“ اماں جی نے اپنے مخصوص اند

میں ڈپٹا۔

”ہاں بھئی۔۔۔“ احمد نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ”شکر الحمد للہ۔“

”یہ بکرے بے چارے کب سے بھوکے بندھے بیٹھے تمہارے جانوں کو رو رہے ہیں۔ بر خور

ان بے زبانوں کا بھی کچھ خیال کرو۔ محض دو تین دن کے مہمان ہیں۔“

اباجی شور کرتے ہوئے اندر آئے، تو ساری جوان پودا یک دم سے نشستیں بدل کر مودب اور مستعد

ہو گئی۔

”اباجی! ابھی صبح تو ان ”صاحبان“ کو پورے گھنٹے کی سیر کرائی ہے گراؤنڈ کے سبزے کی۔“

احمد نے جھٹ صفائی پیش کی۔

”ارے بیٹے! جانور کو گاہے گاہے بھوک لگ جاتی ہے۔ ان کے آگے کچھ بھی نہیں پڑا ہوا۔ لڑکیو!

اور نہیں تو چنے کی دال اور کچھ روٹی کے ٹکڑے ہی ڈال دو۔“

”جی اباجی! میں ابھی کڑا ہی میں ڈالتی ہوں۔“ سارا پھرتی سے کچن میں گئی اور لوہے کی کڑا ہی

میں چنے کی دال ڈال کے باہر لے گئی۔

”کسی کھلے برتن میں پانی بھی رکھ دینا۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

”اور بیٹے! تم سناؤ۔ فیکٹری کے کیا حالات ہیں۔“ اماں جی اپنے بڑے بیٹے سے مخوف گفتگو ہو گئیں۔

”بھلا اتنی ٹھنڈ میں بکرے پانی کیسے پیئیں گے۔“ احمد نے کان کھجائے تھے۔

”یہ تم بکروں سے جا کر پوچھ لینا۔“ عمیر نے جل کر کہا تھا۔

روحہ آرام کی غرض سے ساتھ والے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

”ارے یہ سگریٹ کس کے ہیں۔۔۔؟“ اس نے رائٹنگ ٹیبل پر پڑے سگریٹ کے پیکٹ کو اٹھا

کراٹ پلٹ کر دیکھا۔

”کون پیتا ہوگا اس گھر میں۔۔۔؟“ وہ ایک سگریٹ نکال کر سوچنے لگی۔

”شاید احمد بھائی یا احسن بھائی۔۔۔ یا پھر اسامہ بھائی۔“

یہ نام ذہن میں آتے ہی اس نے بے ساختہ جھر جھری سی لی تھی۔

یونہی اس نے سگریٹ نکال کر اپنے لبوں سے لگالیا۔

”بھلا کیا مزا ہوگا اس فضول سی چیز میں، جس کو مردانا پسند کرتے ہیں۔“ اس نے لبوں سے نکال

کر اپنی خوب صورت سی ناک سکیڑتے ہوئے سگریٹ کو گھور کر دیکھا۔

پھر بے ساختہ ہنس دی اور اس طرح کھیل کھیل میں سگریٹ دوبارہ منہ میں دبالی۔

وہ میز پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ معاً ساتھ میں ماچس بھی نظر آگئی۔ اس نے ترنگ میں تیلی

جلائی۔

”بھلا کیسے سلگاتے ہوں گے اسے۔۔۔ یوں۔۔۔“ وہ دل ہی دل میں شرارت کے سے انداز

میں ہنس رہی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ سگریٹ کو سلگا کر ہاتھ میں پکڑ کر اس کے جلنے کا نظارہ کرے گی۔ مگر اسی

لمحے دروازہ کھول کر اسامہ اندر داخل ہوا۔

آتے ہی جو سین لگا ہوں نے دیکھا، اس نے اسے سر پیر تک جھنجھٹا کر رکھ دیا۔ اس کے خاندان کی

لڑکی اور سگریٹ پی رہی تھی۔

وہ جو سارا، مدیحہ اور عمیر کے سر سے سر کا دوپٹہ دیکھ کر خفا ہو جاتا تھا۔ اسے سگریٹ نوشی کرتے دیکھ

”کراس کا جو رد عمل ہو سکتا تھا اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

مگر ظاہری طور پر وہ بہت پرسکون اور تحمل نظر آیا۔

”آ۔۔۔ آئیے اسامہ بھائی۔۔۔!“ اسے دیکھ کر روحا کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا تھا۔

”شکریہ۔۔۔ نکل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں۔ آپ اپنا شغل جاری رکھیے۔“ وہ واپس مڑ گیا۔

روحا کا چہرہ، خفت، خوف اور خجالت سے سرخ ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا، اپنی حماقت اپنی شرارت کا اعتراف کرنا چاہا مگر اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

وہ ہاتھ بڑھا کر اسے روک کر کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وہ رکا ہی نہیں۔ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گیا تھا۔

”اللہ! یہ کیا ہو گیا۔ اور اب اگر انہوں نے می کو بتا دیا تو۔۔۔ تو وہ مجھے جان سے ہی مار ڈالیں گی۔“ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

وہ وحشت زدہ سی باہر آگئی۔ اور ادھر ادھر گھوم کر اسامہ کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ بکروں کے پاس کھڑا نظر آیا۔

”وہ۔۔۔ اسامہ بھائی۔۔۔ می۔۔۔!“ وہ نظریں نہیں اٹھا پارہی تھی۔

”بے فکر ہیں۔۔۔ میں آپ کی می کو نہیں بتاؤں گا۔“ وہ خشک انداز میں کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

اس پر جیسے کھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

اس کا جی چاہا، ابھی اسی وقت زمین شق ہو اور وہ اس میں سما جائے۔

☆☆☆

آج عید کا دن تھا۔

”آؤ میرے بکرو۔۔۔ میرے راج دلارو! دولہا صاحبان! باری باری سب آ جاؤ۔“ احسن بہت چکار کر بکروں کو ہاتھ سے تھکیاں دے رہا تھا۔ ”سب لائن میں لگ کے اپنی باری پہنچ ہوں گے۔ سن لیا نا۔“

”ارے یوں تو نہ کہو۔۔۔ ان بے چاروں کو پہلے ہی چھریاں نظر آرہی ہوں گی۔ کہتے ہیں عید سے

تین دن پہلے نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔“

مدیحہ نے بکروں کے ساتھ از حد ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

”مدیحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ولی نے بھی گھڑے جیسے سا سر ہلا دیا۔

”اوہو۔۔۔ بڑے بھائی چارے“ کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔“ عمیر نے ولی کو چھیڑا۔

”آج تو آپ قتل کر رہی ہیں، مہارانی عمیر جی۔“

احسن نے بڑے اسٹائل سے اسے تاڑتے ہوئے سیٹی ماری۔

نیلے ستاروں بھرے آئینے کو سلیقے سے شانوی پہ پھیلائے نیلے سلک کے شلوار قمیص میں نازک

نیلی پٹیوں والی چپل میں وہ بڑی دل فریب لگ رہی تھی۔

”یوں غنڈوں کی طرح مت دیکھو مجھے۔“ عمیر نے اس کی نظروں سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ کو چپاتے ہوئے اسے ڈانٹا۔

”ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو مگر جاؤں گا۔ اور جان جاناں مر جاؤں گا۔“ احمد نگلتا ہوتے بکروں کے گلے میں ہار ڈالنے لگا۔

”یار تو کیوں خواستہ رنگ میں بھگ ڈالنے بیچ میں گھسا آتا ہے۔“ احسن نے اس کی خبر لی۔

”اچھا خاصا رومانٹک ماحول بن رہا تھا۔“

”بہت خوب۔۔۔ تو آپ رومانس فرما رہے تھے۔ وہ بھی ان بکروں کے ساتھ یار مانا کہ عمیر

ماہی بد زبان اور تلوار مار کہ لڑکی ہے مگر اب اتنی بری بھی نہیں ہے کہ اس پر ان چوپایوں کو ترجیح دینے لگو۔“

احمر نے اپنی طرف سے عمیر سے ہمدردی کی تھی۔

”تمہاری اس معصومیت پر ایک عدد تھپڑ دینے کو جی چاہتا ہے۔“ عمیر نے دانت کچکپائے تھے۔

”دیکھو تو، مہندی لگا کر بکرے کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔“ اسامہ خواستہ شور مچا رہا تھا۔

اماں جی بھی باہر آگئی تھیں اور بڑے پیار سے بکروں پر دست شفقت پھیر رہی تھیں۔ وہ آسمانی رنگ کے

سوٹ میں لمبوس تھیں۔ سر پر سفید جار جٹ کا دوپٹہ تھا۔ یہ اہتمام عید کی مناسبت سے تھا۔

”ہم نے دھلائی جمع کر گرائی تھی تو خوب کی ہے اماں جی! تب ہی تو مہندی جھڑی ہے۔“ احسن

نے اپنی مشقت کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔

”دیکھو، پہلے صبا کے بکرے کٹوا کے گوشت ادھر بھجوا دو۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

احمر علی اور احمد قصائی کو پکڑ کر لے آئے تھے۔

”لیکن صبا پیچھو تو یہاں آئی ہوئی ہیں۔ گوشت کون سنہیالے گا؟“ احمر نے سوال کیا تھا۔

”گھر میں ملازم ہیں، وہ صاف کر کے فریز کر دیں گے۔“ اماں جی کہہ کر پلٹ گئیں۔

”صبا بیٹی! آج تو عید کا دن ہے۔ سیر اور اس کی بیوی کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں یہاں۔“ اماں

جی نے حسرت سے کہا۔ ”عمیر اور شہلا تو چلو پردیس میں بیٹھے ہیں۔“

”وہ اپنی جگہ مصروف ہیں اماں جی! رمیضہ (سمیر کی بیگم) کے گھر میں فنکشن ہے۔ وہ رات کو

میری طرف آئے گا۔“

”اس سے کہنا، حسن منزل کا چکر بھی ضرور لگائے۔“ اماں جی نے تاکید کی۔

”جی بھائی صاحب! میں کہہ دوں گی، آگے اس کی مرضی۔“

”بیٹا! میں ہمیشہ آپ کو کونے میں الگ تھلک بیٹھے دیکھتی ہوں۔ کتنی بار کہا ہے کہ اپنے بہن

بھائیوں کے ساتھ اٹھو بیٹھو۔ ان کے ساتھ مل کر ہنسو، بولو۔“ اماں جی نے پیار سے روحا کو بازوؤں میں

مکھاتا تھا۔

”اس کی شروع سے یہی عادت ہے۔“ صبا نے غور سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے بے تاثر انداز میں ماں

سے کہا تھا۔

”مگر اب اس عادت کو بدلو بیٹی! اور نہ تمہارا دل کیسے لگے گا یہاں۔ رہنا تو تمہیں اب پاکستان ہی ہے۔“

روح خاموشی سے ہونٹ چبانے لگی۔

”اس کو کچھ اور طرح سے کپڑے سلوا کے دینے تھے صبا!“ وہ کسی کام سے ادھر ادھر ہوئی تو اماں نے دھیرے سے بیٹی سے گلے کیا۔

”وہ ایسے ہی کپڑے پہنتی ہے شروع سے اور یوں بھی یہ کیا برے ہیں۔“ صبا کے انداز: لا پرواہی تھی۔

مشرقی اسٹائل میں پرورش کے باوجود صبا نے کبھی بیٹی کی مغربی ڈریسنگ کو تبدیل کرنے کی طرہ توجہ نہیں دی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اس کو وہی بچپن کی چھوٹی سی لڑکی تصور کرتی تھیں، اس لیے امریکن اسٹائل کے لباس اس کے لیے خریدتی تھیں۔ یوں بھی روحا نے شاید ہی پاکستان سے خریدنا ڈر لیں پہنا ہو۔ مگر امریکہ کا چکر لگاتیں تو اکٹھے خرید لیتی تھیں اور ابوتویوں بھی وہیں رہتے تھے۔ وہ مٹی تاکید پر اس کے ناپ کے کپڑے بھجوا دیتے تھے۔

روحا اس وقت بزم چمکتی ہوئی شارٹ سلک کی شرٹ اور پنک باٹم ٹائپ ٹراؤزر میں ملبوس تھی گلے میں پنک اسکراف جھول رہا تھا۔ اپنے مغربی لک دیتے چلیے سے قطع نظر اس کے انداز میں سادہ اور معصومیت تھی مگر یہ سادگی کسی ”آکھ وائے“ کو ہی دکھائی دے سکتی تھی۔ بادی النظر میں تو اس خاموشی، مخروہ اور بد ماغ ہونے کا پتا دیتی تھی۔

کچن میں سخت مصروفیت تھی۔

تائی اور چچی دونوں بذات خود موجود تھیں۔ عائشہ آپی بھی آئی ہوئی تھیں۔ لڑکیوں کا ٹولہ گوشہ دھونے میں مصروف تھا اور لڑکے پر اتمیں بھر بھر کے گوشت اندر لارہے تھے۔

اباجی محلے اور عزیز واقارب میں گوشت بانٹنے پر مامور تھے اور تو اور آسانی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس پیشاوری چنپل پہنے اسامہ بھی اس کام میں برابر کا شریک تھا۔

”ہائے، بے چارے بکرے۔“ ولی نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اب ہمارے پیٹ میں ذکر اتے پھریں گے۔“ علی ہنسا۔

”تائی جان! کیجی، ہم آپ کے ہاتھ کی ہی کھائیں گے۔ کہیں آپ لڑکیوں کی ڈیوٹی لگادیں۔“ دا نے کچن میں آکر لاڈ سے فرمائش داغی تھی۔

”ہاں ہاں، جیسے پہلے تو کسی اور کے ہاتھ کا کھاتے رہے ہو۔ روز ہم ہی کھانا پکاتے ہیں۔“ عجم چک کر بولی۔

”روز کا چارہ تو مارے باندھے حلق سے اتارنا ہی پڑتا ہے مگر آج تو عید ہے۔ کم از کم آج تو“ جیل والا کھانا نہیں کھائیں گے۔“ احمر نے متانت سے کہا۔

”سیخ کباب عائشہ آپی بنائیں گی۔“ احسن نے فوراً اپنی اکلوتی سیالی (ہونے والی) کو گھیر لیا۔

”اچھا پھر بچی کو تم سنبھالو گے۔“ عائشہ کب ادھر اکر کھنے کی قائل تھی۔

”لایئے، مجھے دیجیے۔ آؤ بیٹے! میں تمہیں محلے کے بچے کچھ زندہ بکروں کا دیدار کراتا ہوں۔“ وہ خفراک میں ملبوس گڑیا سی بچی کو اٹھا کے باہر لے گیا۔

”مطلب کے وقت تو یہ لوگ گدھے کو بھی باپ بنانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔“ عجم نے بھٹا کر ناچاری کیا تھا۔

”تم لوگوں نے روحا کے ساتھ دوستی نہیں کی؟“ عائشہ آپی لڑکیوں سے پوچھ رہی تھیں۔

”وہ خود ایسا نہیں چاہتی۔“

”پھر بھی، اسے اپنے ساتھ گھلنے ملنے کا موقع تو دو۔ آہستہ آہستہ وہ خود ہی ایڈجسٹ ہونے لگے۔“

”دوستی مشترکہ طور پر استوار کی جاتی ہے۔ وہ آگے بڑھے گی، تب ہی ہم اس سے بے تکلف بنتے ہیں۔“

”کچھ لوگ قدرتی طور پر بند ہوتے ہیں، انہیں اور ان کے مزاج کو کھولنا پڑتا ہے، از خود نکھارنا پڑتا ہے۔ وہ خود نہیں کھلتے۔ کسی کے انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ آکر ان کے دروازے پر دستک دے، خلوص کا

بڑھائے، انہیں ان کی ذات کے بند کونوں سے نکالے، روشنی، رنگینی اور تازگی کا احساس دلائے۔“

عائشہ آپی فطرتاً حساس اور نرم رو تھیں۔ انہیں روحا کے یوں الگ تھلک پھرنے کا بڑا قلق ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیچ میں نام نکال کے وہ اس کو کہتی دینے کی خاطر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

”ہاں بھئی ڈیر کزن! کیا ہو رہا ہے۔ تم اتنا پوز بنائے کیوں بیٹھی ہو۔“ انہوں نے دانستہ اسے بے غمی سے مخاطب کیا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ وہ اپنے خیالات سے چونکی تو انہیں مقابل پا کر قدرے زرد نظر آئی۔

”یہ کیا۔ نہ مہندی لگائی ہے، نہ جیولری استعمال کی ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”مجھے مہندی اچھی نہیں لگتی۔“

”بھلے نہ لگے مگر تہوار پر تو ضرور لگانی چاہیے۔ کم از کم دوسروں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“ وہ اپنائیت سے بولی۔

”سیخ کرلو پھر میں خود تمہارے مہندی لگاؤں گی۔“

”نہیں پلیز، یوں بھی مجھے اور می کو چار بجے تک واپس گھر جانا ہے۔“

”چار بجے تو جی ٹائم شروع ہو گیا یہاں۔“ وہ لا پرواہی سے بولیں۔

”اتنے خوب صورت ہاتھ ہیں، ان میں مہندی کی لالی خوب کھلے گی۔ مگر ارا! کپڑے تو ڈھنک رہے ہیں۔“ وہ اس سے دس بارہ سال بڑی تھیں مگر ایسے مخاطب ہو رہی تھیں جیسے چند ایک سال کا لڑکا ہو۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ جن کے چہرے پر اس کے لیے تازہ خلوص اور اپنائیت نمایاں تھی۔

”اگر شلواری قص پہنی ہوتی تو بہت دلکش نظر آتیں۔“ انہوں نے اس کے بھرپور مناسب سراپے کا جائزہ لیا۔

”کیا ان کپڑوں میں اچھی دکھائی نہیں دے رہی؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگی۔
 ”بلاشبہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔ اچھی چیز تو جہاں بھی ہو جیسی بھی ہو، اچھی ہی لگتی ہے مگر یہ بات ہے کہ یہ کپڑے تمہارے جیسی اچھی لڑکی پر اچھے نہیں لگ رہے۔ تمہاری خوب صورتی کو گہنا رہے ہیں۔“
 انہوں نے بڑے سلیقے سے اسے سمجھایا تھا۔

”دیکھو چند! ہمارا بلکہ ہر جگہ کا معاشرہ کافی حد تک ظاہری حلیے اور اسٹائل سے کسی کی شخصیت کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ رائے سو فیصد درست ثابت ہو مگر اس فتنے سے بچنے کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ ہم جہاں اور جس ماحول میں رہتے ہوں، ویسے ہی نظر آئیں۔ پاکستان اسلامی ملک ہے اور مسلم خواتین ہونے کے تاتے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ خود کو ڈھک کے مہذب، سلیجے ہوئے اور معزز انداز میں پیش کریں تاکہ لوگ ہمارے حلیے دیکھ کر ہی ہماری شرافت، پاکیزگی اور تہذیب کا اندازہ لگالیں۔ یہاں اچھے شریف گھرانے کی لڑکیاں عموماً شلواری قص اور درپے میں ہوتی ہیں اور بے حد سراہی بھی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ تم اندر سے بہت نیک، سادہ اور پیاری بچی ہو۔ بس کوشش کرو، اپنے اندر کی اچھائی ظاہری طرز عمل اور رکھ رکھاؤ سے بھی دوسروں سے منواسکو۔“
 اتنے سلیس اور جامع انداز میں کسی نے بھی آج تک اسے نہیں سمجھایا تھا۔ عائشہ آپلی کا انداز اتنا پیارا، امن موہنا اور بھرپور تھا کہ سیدھا دل میں اتر گیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں، میرے اسی ظاہری رنگ ڈھنگ کی وجہ سے یہ لوگ مجھ سے دور رہتے ہیں اور مجھ سے اجنبیت برتتے ہیں؟“ اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”یقیناً یہی وجہ ہوگی۔ ہمارا لباس، ہمارا انداز نشست و برخاست اور ہماری بول چال اس کچر کی نمائندگی کرتی ہے، جس میں ہم پروان چڑھے ہوتے ہیں، انہیں تم پکی پکی امریکن کچر کی نمائندہ نظر آتی ہوگی، اسی لیے تم سے بے گانگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔“

”حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ می نے تو مجھے اتنا باندھ کے رکھا ہوا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”عائشہ نس دیں۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر اٹھ گئیں۔

”بھئی لڑکیو! کھانا کب لگے گا۔ اب تو اسامہ جیسے صابر بچے کو بھی بھوک لگ گئی ہے۔ وہ کھانا

لگوانے کا کہہ رہا ہے۔“

اماں جی نے ”بچن والوں“ سے تازہ ترین صورت حال معلوم کرنے کے لیے از خود جوع فرمایا۔

”صرف ٹیبل لگانی رہ گئی ہے اماں جی!“ چچی جان نے مصروف انداز میں اطلاع دی۔

”اوپر سے کچھ اور کریاں منگوا لو اور ایک چھوٹی ٹیبل بھی ساتھ رکھو، زیادہ لوگ ہیں اور میز تو

صرف بارہ کرسیوں والی ہے۔“

”بے فکر ہیں بھابھی! اس کا بندوبست پہلے ہی کر چکی ہیں۔“

”عائشہ آپلی! میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گی۔“ روحانے بچوں کی طرح فرمائش کی۔ سب لوگ میز

آچکے تھے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، میں تو خود تم سے یہی کہنے والی تھی۔“ انہوں نے اس کا مان بڑھایا۔

کھانے کے دوران وہ مسلسل اسے چیزیں پیش کرتی رہیں اور باتیں بھی کرتی رہیں۔ وہ ان کی

نزدت میں خود کو بہت محفوظ اور قدرے پر اعتماد محسوس کر رہی تھی بلکہ عائشہ آپلی کے کہنی مار کر انوالو

کرنے پر اس نے دو چار بار مدد بھی، سارا، غیر اور البعد وغیرہ سے بات بھی کی تھی۔

البتہ اسے رائل بلو پینٹ اور آف وائٹ شرٹ میں ملبوس کم کم مسکراتے اور کبھی کبھی بات کرتے

سویر سے اسامہ کی خود پر جمی درشت آنکھوں سے بہت خوف آ رہا تھا۔

اب تو اسے حسن منزل آتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

کب اسامہ بھائی جوش میں آ کر مٹی کو بتادیں اور پھر می، ابو اور بھائی کو اور۔۔۔ اور۔۔۔

ظاہر ہے اسے تو زندہ درگور کر دیتے وہ لوگ۔ سگریٹ پینا، یہ جرم اتنا بڑا تھا کہ وہ اس کو جان سے

ہی مار ڈالتے۔

”یہ کیا نمونہ اٹھالاتی ہیں صبا پھپھو۔“ وہ کھانے کے بعد موقع پا کر دبے لفظوں میں تائی امی سے

مخاطب ہوا تھا۔

”ارے بیٹے! اتنی بھلی مانس تو ہے بے چاری۔ چپ سادھ کے بیٹھی رہتی ہے۔“ تائی جان نے

اپنی فطرت کے مطابق سادگی سے کہا۔

”آپ کو تو ساری دنیا ہی بھلی مانس نظر آتی ہے امی! اس ”بھلی مانس“ کا حلیہ اور غرور و برتری کا

انداز ملاحظہ کیا ہے آپ نے۔“

”جہ۔۔۔ ارے درمیان رہے گی تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تو احمد کی بات چلانے کی

کوشش کر رہی ہوں اور تم ہو کہ۔۔۔“ انہوں نے خفگی سے اپنے سب سے بڑے صاحبزادے کو دیکھا۔

”کیا احمد۔۔۔؟“ اسامہ کے دیوتا کو ج کر گئے۔

”خدا کا خوف کریں امی! کہاں پھنسا رہی ہیں ان سیدھے سادے لڑکے کو۔ آپ پر ان شہزادی

صاحب کے جو ہر کھل جان میں ناتو کانوں کو ہاتھ لگانی پھریں گی۔“ اسامہ کچھ کچھ کہتے کہتے رک گیا کہ

رازداری نبھانے کا قول دے چکا تھا۔

”آپ سوچیے گا بھی مت۔ احمد کے لیے بہتری، شریف اور سلیجی ہوئی لڑکیاں مل جائیں گی۔“

اسامہ انداز قطعی تھا۔

”خیر، میں مرضی تو ضرور پوچھوں گی اس کی۔ اگر اس نے اعتراض کیا تو ٹھیک ہے۔ اگر راضی

ہو گیا تو صبا سے بات کروں گی۔“ تائی امی کا ارادہ پختہ تھا۔

”اب تم نے تم سے چھوٹے حسن کے لیے غیر کارشتہ پکا کیا تھا۔ اب احسن کے بعد احمد کی بھی

بات طے کر دوں گی۔ وہ بھی برس برس روزگار ہو گیا ہے۔ دونوں کی سال ڈیڑھ سال کے بعد انکھی شادیاں

کر دوں گی۔ پھر سب سے چھوٹا احمرہ جائے گا۔ اس کے لیے بہت ٹائم پڑا ہے۔“

”اور سارا اور مدیحہ۔۔۔؟“ اس نے بہنوں کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا۔

”سارا کے لیے تمہاری نور پھپھو نے قیصر کا رشتہ دیا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ اسامہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

رہی مدیحہ۔۔۔ تو اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ فی الحال اسے ان چکروں سے دور رکھا جائے۔ وہ

ایف ایس سی کے بعد ایم بی بی ایس میں ایڈمیشن لینے کا ٹھان چکی ہے۔“

”یہ بھی بہت اچھی خبر ہے۔“

”تم اچھی خبر کب سناؤ گے؟“ تائی امی جل کر بولیں۔ اسامہ ہنس دیا۔

”کبھی تو سناؤں گا نا۔ فی الحال انتظار فرمائے اور ہاں، شام کو میرا عید اپنشل ڈرامہ آئے گا، وہ

دیکھنا نہ بھولے گا۔“ وہ ماں سے شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

مئی کی شہ پر نیوٹر اس کے ساتھ تختی سے پیش آنے لگا تھا۔

سینڈ ایئر کے ایگزام شروع ہو گئے تھے۔ تین دن بعد اس کا پہلا پیپر تھا۔ نیوٹر اپنی طرف سے اسے

تیاری کروا چکا تھا۔ آخری دنوں میں اسے ٹاپک دیتا تھا کہ یاد کر کے سناؤ۔

”میں کیا کروں سر! مجھے یاد کرنا نہیں آتا۔ میں نے کبھی یاد نہیں کیا۔“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”امریکہ میں تو ایسے رٹائیں لگانا پڑتا تھا۔ وہ اورل ٹیسٹ لیتے تھے یا اچیومنٹ ٹیسٹ ہوتا تھا

اور۔۔۔“

”یہ امریکہ نہیں ہے مس روہا۔“ نیوٹر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”آپ مجھے سمجھا دیں۔ میری تیاری کروا دیں۔“

”اور کیسے تیاری کراتے ہیں۔ میں نے آپ کے سارے ٹاپک کو کر دیا ہے ہیں۔ سمجھا دیا ہے

اچھی طرح۔ اگر آپ کو پھر بھی کوئی سوال سمجھ میں نہیں آ رہا تو میں وہ سوال سمجھا دیتا ہوں۔ رہی بات ساری

بک آپ کو یاد کروانے کی تو ایک بات یاد رکھیں۔ نیوٹر رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسٹوڈنٹ ہاتھ پہ

ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ نیوٹر خود ہی اسے جادوئی عمل کر کے ساری کتاب اس کے دماغ میں ڈال دے گا۔

یاد تو آپ ہی کو کرنا ہے اور پیپر بھی غالباً آپ کو ہی دینا ہے یا پھر نیوٹر وہاں جا کر لکھے گا۔“

وہ پانی پانی ہو گئی۔

وہ ڈائننگ روم (بلکہ ہال کہنا مناسب ہوگا) میں بیٹھی تھی، اسے پتا بھی نہیں چلا، بک کوئی بے آواز

کارپنڈنٹ میٹر ہیاں چڑھتا اور آگیا تھا اور نیوٹر کے ارشادات حرف بہ حرف سن چکا تھا۔

”صبا پھپھو کہاں ہیں؟“ اسامہ نے اپنے مخصوص ناگوار تاثرات سمیت اسے مخاطب کیا تو اس کا

جی چاہا، زندہ زمین میں دفن ہو جائے۔

”اف اللہ! وہ نیوٹر کی زبانی میری تعلیمی کارکردگی“ سن چکے ہوں گے۔

بے عزتی کے احساس سے اسے چکر آنے لگے۔

یہ دوسری بار ہوا تھا۔ اگر جو اسامہ بھائی یہ ”عزت افزائی“ مئی کو بتا دیں تو۔۔۔

”بے فکر رہیے۔“ وہ جیسے اس کی سوچ پڑھ کے نیچے جانے کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔

وہ سر جھکا کر ہاتھ مسلتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جیسے تیسے اس نے فائل پیپر دے دیے، آخر میں پریکٹیکل رہ گیا تھا، جس دن آخری پیپر تھا

انے نے سب دوستوں کو اگلے دن اپنے گھر پر مدعو کیا۔

”روح کو تو رہنے ہی دو۔ اسے اس کی مٹی نہیں آنے دیں گی۔“ ہالہ نے خاموشی سے ناخن چباتی

کو دیکھ کر طنز سے کہا تھا۔

”شٹ اپ ہالہ!“ روشا نے ایک نظر روحا کو دیکھ کر ہالہ کو گھورا۔

”ارے بھئی! روحا پانی مٹی سے کالج کا کہہ کر آجائے گی۔ ہم شام کے بجائے صبح کا پروگرام رکھ

ہیں۔ نوبے سے ایک بجے تک۔ کیا خیال ہے روحا!“

روحا کے چہرے پر شکش کے تاثرات نمایاں تھے۔

روشا نے کوہ سب سے زیادہ پسند کرتی تھی اور اس کے گھر میں اس کے ساتھ بے تکلفی سے وقت

ارنا روحا کی اولین خواہش رہی تھی۔ اس پر عمر کا جو دور گزر رہا تھا اس میں دوست تفریحات اور دلچسپی

رکڑ ہوا کرتے ہیں۔ وہ اپنے وجود کے لیے اتنے ضروری لگتے ہیں کہ ان کے بغیر وقت گزارنے کا

ہر بھی ہول آتا ہے۔

”مٹی کو پتا ہے کہ سینڈ ایئر کے پیپر زخم ہو چکے ہیں۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے روشا نے کی طرف

”افوہ، پریکٹیکل تو رہتا ہے نا۔ اور انہیں پریکٹیکل کی ڈیٹ تو نہیں معلوم نا۔ بہانہ کر دو کہ کل

بگل ہے۔“ ہالہ نے بے پروائی سے مشورہ دیا۔

”تو پھر پریکٹیکل والے دن کیسے آؤں گی؟“

”اوکے، تم یہ کہہ دو کہ پیچرنے پریکٹیکل کی تیاری کے لیے بلایا ہے۔ ایک دو پریکٹیکل رہ گئے تھے،

نے ہیں۔“ روشا نے کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔

حسب معمول جی نے بحث و تحیص اور پوچھ گچھ کے بعد صبح نوبے اسے کالج ڈراپ کر دیا تھا۔ باقی

زکے پیپر زہور سے تھے، اس لیے کالج میں چہل پہل تھی۔

وہ آٹو گئی تھی مگر مسلسل ذہنی دباؤ اور خوف کا شکار تھی۔

”اگر مٹی کو پتا چل گیا تو۔۔۔؟“ کالج سے باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اس کی ٹانگیں کانپ رہی

تھیں۔ پھر روشا نے گھر جا کر وہ سب کچھ بھول گئی۔

انٹرنیٹ پہ چیننگ کرتے، پیپی اور بڑا اڑاتے اور شور وغل کرتے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

بنا طرف سے انتہائی پُر جوش اور خوش دکھائی دینے کی کوشش میں لگی تھی۔ زبردستی دوستوں کی باتوں

نہ لیتی اور انہیں یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی کہ مجھے بھی اس معاملے سے اتنی ہی دلچسپی ہے۔

”اوہ گاڈ، ایک بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں روحا! بھاگو کالج، تمہاری مٹی پک کرنے آتی ہی

ہے۔“

”اوہ نو“۔ روحا کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔

ہوائیاں اڑتا ہونے چہرہ لیے وہ جیسے تیسے ٹیکسی میں بیٹھ کے کالج آئی تھی۔

عین اس وقت جب وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر رہی تھی، اس کی نظر سائڈ پر اپنی گرینڈ
میں ڈرائیونگ سیٹ کا شیشہ بچے کے پوری طرح اپنی طرف متوجہ اسامہ پر پڑی۔

زمین و آسمان اس کی نظر میں گھوم کر رہ گئے۔

ایک لمحے کو وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسامہ کی آنکھیں۔ وہ آنکھیں کیا کہانیاں سنارہی تھیں، ان سے برستی چنگاریاں اس سے کیا

رہی تھیں۔

ان میں رچی تنہا و تحقیر اور ملامت کی لالی اسے کیا پیغام دے رہی تھی۔

وہ حرف بہ حرف سمجھ گئی۔

”ناٹا اٹکین“۔ وہ کراہی تھی۔

ٹیکسی سے تو بہر حال اترتا تھا اور پھر اسامہ کی گاڑی میں بھی بیٹھتا تھا جو غالباً می کی طرف کسی کام

سے گیا تھا اور می نے کسی کلائنٹ کے ساتھ بڑی ہونے کی وجہ سے اسامہ کو اسے پک کرنے کے لیے بلایا

دیا تھا۔ ”پلیز اسامہ بھائی! میں آپ کے پیر پڑتی ہوں، ہاتھ جوڑتی ہوں، خدا کے لیے آپ می یا ابوبکر

بتائیے گا۔ وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے، گولی مار دیں گے، پلیز۔“

بے تحاشا روٹی ہوئی اس بے اوسان لڑکی نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے پاؤں چھوئے تھے۔

خوف سے لرز رہی تھی۔ خوف زدہ پھیلی پھیلی آنکھوں اور اڑی اڑی زرد رنگت والی اس لڑکی سے اسامہ

نے اس لمحے شدید نفرت محسوس کی تھی جو والدین کی عزت کی نیلا می کر کے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گرا

چھڑے اڑا کر آ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ کافی عرصہ بعد ”حسن منزل“ آئی تھی۔

”اسامہ بھائی نو ماہ کے کورس کے لیے لندن جا رہے ہیں۔“ غیر نے بتایا۔ اب گھر کی لڑکیاں اس

سے تھوڑی بہت بات چیت کر لیا کرتی تھیں خود اس نے بھی اپنے ظاہری انداز اور چہرے کے تاثرات

کافی حد تک تبدیل کیا تھا۔ می سے فرمائش کر کے بہت سے شلووار قمیص بنوائے تھے۔ وہ خود بھی اس آرا

وہ لباس میں بہت اچھا محسوس کرتی تھی۔ اب وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتی تھی کہ دوسرا اسے مخاطب

کرے، بلکہ آگے بڑھ کر سلام دعا کرتی تھی اور ٹھیک پاکستانی اسٹائل میں حال چال پوچھتی تھی۔

خیریت دریافت کرتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ ایسا انداز گفتگو رکھے جس سے مقابل خوش ہو اور دلچسپی

سے بات کرے۔

بالجہ بھی نو پچھو کے ساتھ یہاں آئی ہوئی تھی اور اسامہ کے جانے کا سن کر پریشان سی ہو گئی تھی۔

اس دن اسامہ کی فلائٹ تھی۔ اتفاق سے ہفتے کا دن تھا، سب ہی جمع تھے۔ روحا عجب پریشانی

بتلاتی تھی۔ بالآخر ایک فیصلہ کر کے اسامہ کے کمرے میں آ گئی۔

اسامہ بھائی! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پردہ رکھنے پر اس کا شکریہ ادا کرنے

رے میں قائم کی گئی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسامہ اپنے سوٹ کیس پر جھکا ہوا

ٹمر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“ اچانک اسامہ نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

سوائے اس کے کہ اگر کبھی میں نے شادی جیسی حماقت کی تو دعا کروں گا کہ میرے ہاں کبھی بیٹی

ہو نہ۔ اگر وہ آپ جیسی نکلی تو میں خود کو بھی گولی ماروں گا اور اسے بھی۔“

بے حد جیسے، متوازن اور پرسکون انداز میں کہے گئے ان الفاظ کا ڈنک اس قدر زہر پلاتا تھا کہ وہ

☆☆☆

لگتی۔

نت رکتا تو نہیں ہے۔

رکب رکا ہے کسی کی خاطر۔

ماہ نو ماہ کے لیے گیا تھا مگر پھر اسی انٹی ٹیوٹ نے از خود ایک سال کے مزید کورس کے لیے

دی تو وہ رک گیا۔

سب توقع روحا ایف اے سیکنڈ ایئر میں دو مضامین میں فیل ہو گئی تھی، پھر تین ماہ بعد پہلے نمٹری

بے اور حیرت انگیز طور پر پاس ہو گئی۔

گلے سال اس نے تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن لے لیا اور بغیر ٹیوٹر کی مدد کے خود پڑھ کر پیمبر دیے۔ وہ

اس نے باعزت طور پر پاس کر لیا تھا۔

درجہ دن دو روزہ ایئر کا نیا بیچ یونیفارم پر لگا کر کالج کے لیے نکل رہی تھی، می نے بے اختیار اسے

پر پار کر لیا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ اتنی ذمہ دار، سو براور پڑھنے لکھنے کی شوقین بچی میری ہے۔“

”کاش وہ بتا سکتی کہ کن احساسات نے اس کے اندر کی خود دار، ذمہ دار اور محنتی لڑکی کو جگایا تھا۔“

نور تھ ایئر بھی اس کے لیے کامیابیاں سیٹھنے کا سال تھا۔ اس نے ایک اصول بنالیا تھا کہ کبھی بہلنے،

درخوش رہنے کے لیے کسی کا کندھا تلاش نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اب دوستی برابری کے

پر استوار کی تھی۔

رد شانے وغیرہ کا گروپ چھوڑ کر اس نے ایسی لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا، جو ہر سبکیٹ میں اس کی

یونیٹیں اور جو صرف خلوص اور باہمی احترام پر یقین رکھتی تھیں۔

اب وہ ”حسن منزل“ جاتی تو دوسروں کو آپس میں خوش گئیاں کرتے دیکھ کر احساس محرومی یا کمتری

انہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس وہ پورے اعتماد اور خوش مزاجی سے گفتگو میں شامل ہو جاتی تھی۔

یہ سیکھ لیا تھا کہ ضروری نہیں ہے موضوع گفتگو صرف اپنی ذات رہے۔ دوسروں کے ساتھ ہنسنے

کے لیے ان کی دلچسپی کے موضوعات چھیڑ دو، ان کے بارے میں مطلع اور با علم رہو۔ ان کے دکھ

رکرو۔ ایسا کرنے سے ہم خود بخود دوسروں کی توجہ، خلوص اور دلچسپی کا مرکز بن جائیں گے۔ جواب

میں ہمارے بارے میں اتنا ہی با علم اور حساس ہو جاتے ہیں اور بالآخر دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا

دوسروں کی خوشی میں خوش رہ کر ہی ہم انہیں اپنی خوشیوں میں شریک رکھ سکتے ہیں۔

نہیں تین شادیاں۔ ارے بیگم! خدا کا خوف کرو، کیوں میرا دیوالیہ نکالنے پر تلی ہوئی ہو۔“
جی بوکھلا اٹھے تھے۔

کیا فرق پڑتا ہے بیٹے۔ اچھا ہے، خیر خیریت سے اس فرض کو چننا دیں۔“
نہیں کیوں، چار لکھے۔ غیر تو اسی گھر سے رخصت ہو کے احسن کی دلہن بنے گی۔“
نشا آپ نے ہنس کر حاشیہ لگایا۔

آئی جان احمد، احسن اور سارا کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں۔
اور پھر دور کیوں جائے، سارا کی قیصر سے اور احمد کی رابعہ سے ہوگی۔ یعنی نور کے گھر بھی دو
ایک ساتھ ہوں گی۔ ہماری چار اور ان کی دو ملا کر خاندان میں کل چھ شادیاں اکٹھی ہو جائیں
نا جان نے مسکراتے ہوئے اپنے جیٹھ کا چہرہ دیکھا تھا۔

مارے گئے۔“ اباجی نے سر ہٹا لیا۔
”بھکرے قربانی کے لیے تیار ہیں۔“ احمد وہاں موجود تھا تو چپ کیونکر رہتا۔ ”ہم بقر عید پر بھی تو
بقران کرتے ہیں، اس بار بکرے نہ سہی، بچے سہی۔ ارے اباجی! کیوں ان آزاد بچھو کو
بے برزخ میں پھینکنا چاہتے ہیں۔ کیوں انہیں بے فکری کی جنت سے نکال کر پریشانیوں کی دوزخ
ناچاہتے ہیں۔“

”ارے چپ، نا، بھجرا، بے وقوف، بدتمیز۔“ تائی جان نے اپنے سب سے چھوٹے سپوت کی
خنجر لے ڈالی۔

”میں اکیلا اتنی ذمہ داریاں نہیں پھینا سکتا بیگم! ایسا کرو، اسامہ کو فون کر کے بلواؤ۔ اس سے پوچھو تو
بندہ خدا اور کتنے کورسز کرنے ہیں۔ آجاؤ اب۔“

”آپ راضی تو ہوں۔ اسامہ کو میں کل ہی اطلاع کر دیتی ہوں۔ وہ یوں بھی اس بقر عید سے پہلے
پردگرا م طے کر چکا ہے۔“

ٹھیک ہے پھر۔“ اباجی ٹھنڈی سانس لے کر بولے تھے۔

☆☆☆

اباجی! یہ کیا آپ نے شادیوں کا اتوار بازار لگا رکھا ہے۔ میں تو پریشان ہی ہو گیا، اتنی ساری
کاسن کر۔“

ستابازا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور تم بھی اپنی دلہن چن لو۔ اباجی بھی سستے میں چھوٹ
لے۔ ہم تمہیں بھی ان کے ساتھ ہی بھگتا دیں گے۔“ عائشہ آپ نے چھیڑا۔

”آپ لندن میں رہ کر اور ہینڈسم ہو گئے ہیں۔ بھائی!“ احسن نے رشک سے اسے دیکھا۔
”تحریف کا شکر یہ۔“ وہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ہم آپ کے ڈرامے دیکھتے ہیں۔ وہ جو آپ برائیوٹ چینلو کے لیے لندن میں رہ کر کرتے
ہے۔“ مدیحہ نے شوق سے بتایا۔ وہ ایم بی بی ایس کے سیکنڈ ایئر میں آچکی تھی۔

”شکر یہ۔“ وہ پھر مسکرایا تھا۔

اس دن وہ ”حسن منزل“ آئی تو رابعہ اور عائشہ آپ کی کو کسی گھرے مسئلے میں الجھا ہوا پایا۔
وہیں موجود تھی۔ اس کے چہرے پر بھی فکّر اور پریشانی کے سائے تھے۔

رابعہ بڑے مشکل انداز میں بیٹھی تھی۔
”بڑی ممانی کی آمد کا تو میں پچھلے دو سال سے ایک ایک لمحہ انتظار کرتی رہی ہوں مگر اس
کے لیے، احمد کے لیے نہیں۔“ رابعہ رو ہانسی ہو گئی۔

”خیریت؟“ سلام ودعا کے بعد روحا نے بڑی اپنائیت کے ساتھ سوال کیا۔
”جس کو اس نے راجھا مانا، وہ اسے اپنی ہیر نہیں مانتا۔“ غیر کا جواب نہایت مختصر تھا۔
روحا کے سر سے گزر گیا۔

”اسامہ بھائی کا دور دور تک شادی کا کوئی پلان نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے تائی جان یوں
سادھ کے بیٹھ گئی ہیں۔ ارے اسامہ نے قسم دی ہے انہیں کہ وہ کبھی بھی اسی سے شادی کے لیے
نہیں کریں گی۔ اس پتھر کی دیوار سے ٹکرا کر بالا آخر تائی جان نے بار مانی تھی اور احسن کا رشتہ
تھا۔ احمد بہت اچھا لڑکا ہے۔ بینک میں اچھی پوسٹ ہے۔ مزاجاً بھی کھلے دل و دماغ کا اور ہنس
عائشہ آپ نے ترجیحی نظروں سے روحا کو دیکھتے ہوئے بڑے سبھاؤ سے رابعہ کو سمجھایا۔
روحا اپنی دھن میں کسی ذہنی جوڑ توڑ میں لگی ہوئی تھی۔

”میں نے احمد کو کبھی ان نظروں سے نہیں دیکھا میں تو شروع سے اسامہ بھائی۔۔۔“ را
روتے ہوئے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

روحا نے محسوس کیا جیسے اسے رابعہ کے منہ سے اسامہ کے لیے اظہار پسندیدگی اچھا نہیں لگا
عجیب طریقے سے ڈوبا تھا۔

ایسا کیوں ہوا؟ وہ سمجھ نہیں سکی۔ ہاں یہ وہ ضرور جانتی تھی کہ رابعہ اور احمد کے رشتے کی بات
اس کے اعصاب پر سکون ہو گئے تھے۔

”کچھ دنوں کی بات ہے، جب اس کے ساتھ وابستہ ہوگی تو اسی کے رنگ میں رنگ جاؤ
اسامہ سے امید لگانا فضول ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔“ عائشہ آپ نے صاف لفظوں میں،
آئینہ دکھا یا تھا اور پھر رابعہ اور احمد کی منتہی کے موقع پر سب نے دیکھا کہ روحا بے حد پر جوش، سرگرم
خوش نظر آئی تھی۔

سرخ اور فان کلر کے امتزاج سے بنے جھلملاتے ہوئے غرارہ سوٹ میں وہ مغلیہ شہزادی
دے رہی تھی۔

”دیکھو، ان دو تین سالوں میں کیسے رچ بس گئی ہے ہم میں۔ یہی ہوتا ہے، پیدائش کہیں کی؟
خون تو خالص اپنا ہی تھا نا۔“ اماں جی نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔

”اے صبا! بھئی، بیٹی کی شادی کب کر رہی ہو؟“ نور خالہ نے تذکرہ چھیڑا۔
”بی اے کا امتحان تو دے لے پھر سوچوں گی۔“ صبا کے انداز میں لا پرواہی تھی۔

”دوماہ ہی تو رہ گئے ہیں پھر تو فارغ ہی ہوگی۔“

☆☆☆

”کیا بات ہے، آپ بڑے خوش مزاج ہو گئے ہیں لندن میں رہ کر۔“ احمد بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”کسی انگریز میم سے دل تو نہیں لگا لیا۔“

”اوں، ہمارے بھائی نے امریکن کو گھاس نہیں ڈالی تو انگریز کیا بیچتے ہیں۔“ غیر اپنی جھوٹ

کہہ گئی تھی۔

”اب وہ امریکن نہیں، پاکستانی گرل بن گئی ہے۔“ سارا نے تصحیح کی۔

اسامہ جانتا تھا، کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے، اپنے سوٹ کیس سے کپڑے نکال کر

میں لگانے لگا۔

”ہاں بھئی، اب سوچ لو اس کے بارے میں۔“ جانے عائنہ آپ کی کس جھونک میں کہہ گئیں۔

خود بھی کہنے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کہہ گئی ہیں۔

جواب میں اسامہ نے اس قدر ناراض نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا کہ وہ خفیف سی ہو کر

تھیں۔

☆☆☆

”روحاً بیٹے کیا بات ہے، مسلسل دو ہفتوں سے تم ”حسن منزل“ جانے سے انکار کر رہی ہو۔

جی کتنا پوچھ رہی تھیں۔ فارغ بھی ہو تو پھر چلتی کیوں نہیں۔“

صبا اب اس پر پہلے کی طرح اپنے فیصلے نہیں ٹھوس تھیں۔ اس نے اپنے روپے اور اعما

ذریعے ان پر واضح کر دیا تھا کہ اب وہ از خود محتاط ہو چکی ہے۔ پہلے کی طرح اسے مارتی بھی نہیں

بلکہ اب تو وہ خاصے دوستانہ انداز میں پیش آتی تھیں۔

”کیوں نہیں جاتی۔“ روحانے اپنے دل سے پوچھا۔

وہ کیسے جاسکتی تھی۔

ان آنکھوں میں نفرت کے لپکے کیسے برداشت کر سکتی تھی، جن کو اس نے گزشتہ دو سالوں سے

سوچا تھا۔

وہ خود بھی سمجھ نہیں پارہی تھی، وہ کیسے اور کس طرح اسامہ کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔ بھلا

شخص کے سامنے ہر بار نہایت تذلیل آمیز انداز میں شرمندہ ہوتی آئی تھی، اسے دل کیسے دے سکتی

جب تک وہ یہاں تھا، اس نے ایک لمحہ بھی اس کے لیے نہیں سوچا تھا مگر جب وہ چلا گیا تو رہ جیا۔

منازل طے کرتے ہوئے بار بار یاد آیا۔

شاید یہ اس کی نفرت ہی تھی جس نے مجھے خود سے ملایا، اپنی شخصیت کو سنوارنے اور اپنا

حیات پہچاننے کا موقع دیا۔

”قبض اوقات کسی کی نفرت بھی کسی کو نکھار دیا کرتی ہے، اس کی زندگی بنا دیتی ہے۔“ اس

سوچا۔ وہ درپردہ اس کی شکر گزار تھی کہ اس نے اس بری طرح اسے دھتکارا کہ۔

اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے

جہاںے مقولے پہ عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ خود ہی اس قابل ہو گئی کہ اپنے آپ کو جوڑ سکے۔

”اس دفعہ کی بقرعید ہم اپنے گھر پر کیوں نہ منائیں می! اب تو ابوبھی مستقل پاکستان سیٹل ہو چکے

اس نے تجویز دی تھی۔

”ایسا کریں گے۔ پہلا دن اماں کے ہاں گزاریں گے اور اگلے دن اپنے گھر پر قربانی کر لیں

می نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

”روحاً! تیار ہو جاؤ، ہم حسن منزل جا رہے ہیں۔ اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ رات کے کھانے کے لیے ٹیبل پر آئی، ہی تھی کرمی گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے میڈروم سے

نہیں۔

”چلیے می!“ وہ ابو کے ساتھ ہی ٹیبل سے اٹھ گئی۔ وہ لوگ وہاں روانہ ہوئے تو پہلے سے میلہ لگا ہوا

”ارے بھئی، کچھ نہیں ہوا مجھے۔“ خواخوہ احمد نے سب جگہ اطلاع پہنچادی۔ بلڈ پریشر کی تو پرانی

نہ ہوں۔ وہی بڑھ گیا تھا، تھوڑا سا۔“ اماں جی نقابہت کے باوجود ابو کی وجہ سے اٹھ کے بیٹھ گئی تھیں۔

”تھوڑا سا؟ اسے تھوڑا سا کہتے ہیں۔“ مدیحہ نے بی بی اپریش اٹھاتے ہوئے خفگی سے انہیں

ا ”تمہاری ڈاکٹری اچھے وقت میں کام آئی۔“ چچی جان نے پیار سے اپنی جیبی کو دیکھا تھا۔

”ڈاکٹر آگیا ہے۔“ اسی لمحے نیوی بوشلوار قمیص میں چہرے پہ فکری مندی کے تاثرات لیے

ڈاکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

”ارے بیٹے! یہ کیا کھپ ڈال دی تم نے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

اماں جی کے احتجاج کے باوجود ان کا باقاعدہ چیک اپ کیا گیا تھا۔ اسامہ ڈاکٹر کو چھوڑنے باہر

آتا تھا۔

روحاً اپنی کزنز کے ساتھ کچن کے ساتھ منسلک ڈائننگ روم میں آگئی۔

وہ ان کے ساتھ ان ہی کے سے انداز میں باتیں کرتی ہوئی اُسی ماحول کا ہی ایک حصہ محسوس ہوتی

اماں جی کے اصرار پر صبارت کے لیے اماں جی کے پاس ہی رک گئی تھیں۔

”صبا! ایک بات کہوں؟“ اماں جی کے دل میں کتنے دنوں سے کھد بد ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ دل کی

زبان پر آئے امیں۔

”جی اماں جی! کیسے نا۔“

”اگر بڑی بہو اسامہ کے لیے تم سے بات کریں تو برا تو نہیں مانو گی؟“

صبا سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کے چہرے کا تذذب دیکھ کر اماں جی کا لہجہ ملتی ہو گیا۔

”بیٹے! اپنے اپنوں کے ساتھ منسلک ہو کے مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔ روحاً ماشاء اللہ اچھی، سمجھ

گئی ہے اور اسامہ تو ہے ہی بہرا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کتنا قابل، کتنا مشہور اور کس درجہ تمیز، لحاظ والا

ہے۔ اس نے ماں کو تو قسم دے کے شادی کی بات کرنے سے روکا ہوا ہے مگر اپنی دادی کی بات نہیں

الکھ۔ میں سمجھاؤں گی اس کو۔ بڑی بہو ویسے بھی روحاً کو بہت پسند کرتی ہیں۔“

”اماں جی! جب بات ہوگی، تب دیکھا جائے گا۔“

صبا نے اگر ہاں نہیں کی تھی تو نا بھی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

”کم از کم یہاں سے آپ تب تک نہیں جاسکتے، جب تک کہ آپ کے دماغ اور آپ کی آنکھوں پہ بھی ایک ایک پٹی نہ اتر جائے۔ آپ نے مجھے مغربی رنگ ڈھنگ میں دیکھا مگر طریقے سے مشرقی اس پہننے پر راغب کرنے کے بجائے مجھے بکڑی ہوئی سرکش اور لادین لڑکی تصور کر لیا۔

آپ نے مجھے اپنے کمرے میں محض شوق اور جس کے پچکانہ جذبے سے مجبور ہو کر سگریٹ سے ھلنے دیکھا مگر ڈانٹنے ڈپٹنے اور سچائی جاننے کے بجائے نہایت زہریلے انداز میں طنز کر کے سائیڈ پہ ولے۔ کیا میں آپ کی کچھ نہیں لگتی تھی؟

آپ نے میری نالائقی کے بارے میں میرے ٹیوٹر کے خیالات سے مگر ایک رشتہ دار ہونے کے اتنے طریقے سے سمجھانے اور پوچھ گچھ کرنے کے بجائے مجھ پہ طنزیہ نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ جب آپ غیر، راجعہ اور دوسری کزنز کی بڑھائی کے لیے انہیں لڑا سکتے ہیں تو مجھے ان سے الگ کیوں سمجھا؟ یہ نیا ہی سلوک آپ نے مجھ سے لائق کی بنا پر کیا تھا؟

پھر آپ نے مجھے کالج سے نکلنے کے بجائے ایک ٹیکسی سے برآمد ہوتے دیکھا۔ آپ نے اسی وقت مجھے ایک جہان پر لگا کر اصل حقیقت کیوں نہ اگلوائی۔ میں آپ کو بتاتی کہ میں تو محض اپنی احمقانہ سی دستیاں نبھانے کے چکر میں خوار ہوئی تھی مگر آپ نے مجھ سے اصل بات اگلوانے کی رتی برابر کوشش نہیں کی۔ خود سے بدکرداری اور بدچلتی کا ٹھہرے لگا کے تسلی سے بیٹھ رہے اگر آپ نے مجھے کسی رشتے سے اپنا سمجھا ہوتا تو آپ بھی ایسا نہ کرتے۔ آپ نے شروع سے ہی مجھے اس خاندان کا حصہ نہیں سمجھا۔ سب لوگوں نے مجھے علاقہ غیر سے آئی ہوئی کوئی عجیب و غریب مخلوق سمجھ کے پرہیز کرنا شروع کر دیا تھا۔

اگر میرے ماں باپ امریکہ سیٹل ہو گئے تھے تو یہ میرا قصور ہے؟
میں وہاں پیدا ہوئی، اسی ماحول میں پلی بڑھی، کیا یہ میرا قصور ہے؟
مجھے میری ماں نے اوڑھنا پہننا نہیں سکھایا، کیا یہ میرا قصور تھا؟
میں نے اللہ سے فرمائش نہیں کی تھی کہ مجھے امریکہ میں پیدا کر دو۔ مجھے تو میرے ماں باپ نے جو ماحول دیا، میں اسی میں رچ بس گئی۔ اس میں میرا کیا قصور نکلتا ہے؟ خود سے اپنی شخصیت بنانے کا موقع ہی کب ملا تھا مجھے۔“ اسامہ بت بنا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

اچانک روحانے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ آہستگی سے دونوں گال پونچھے اور پیچھے ہٹ گئی۔
”آپ کس بھول میں ہیں۔ میں آپ سے کبھی شادی نہیں کر دوں گی۔ آپ۔۔۔ آپ اس قابل ہی نہیں ہیں۔“

معا اس نے دور سے آتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ ہلایا اور اس سے پہلے کہ اسامہ کچھ سمجھتا یا اسے جا کر پڑتا، وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”ممی! آپ میری کہیں بھی شادی کر دیجیے، میں راضی ہوں۔“ وہ رات کو ماں کے کمرے میں آئی تھی۔
”جہانے انتہائی تعجب سے اس کی سستی ہوئی صورت دیکھی۔
”یہ اس وقت شادی کا بھوت کیسے چڑھ گیا تم کو۔“ وہ اس سے اس درجہ بے باکی کی توقع نہیں کر

کچھ دن بعد اماں جی نے تائی اماں سے مشورہ کر کے عائشہ کو بلوالیا مگر جب اسامہ سے بات کی گئی تو اس نے تو زمین آسمان ایک کر دیے۔ اس قدر طیش اور اشتعال میں تو وہ کبھی بھی نہیں آیا تھا۔
”کیا میرے لیے وہی آوارہ مزاج اور بدکردار لڑکی رہ گئی ہے جس پر میں ایک نظر ڈالنا بھی حرام سمجھتا ہوں۔ اسے عمر بھر کے لیے اپنی آنکھوں کے سامنے جالوں۔ امپائل۔ میں ایسا کرنے سے پہلے خود کو گولی مار لوں گا۔“

عائشہ آپی جو اماں جی کی ایما پر اس کا عندیہ لینے اس کے کمرے میں آئی تھیں، لرز رہ گئیں۔
اسامہ غصے سے کھولتے ہوئے دھماکے سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گیا تھا۔ اپنی چھوٹک میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ دروازے کے باہر کھڑی تھی اور پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

بہت عرصے کے بعد ایک بار پھر اس نے ممی سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن آج وہ پہلے کی طرح گھبرائی ہوئی نہیں تھی بلکہ بہت پرسکون نظر آرہی تھی۔

”ممی! میں افشائ کے ہاں جانا چاہتی ہوں، جلدی آ جاؤں گی۔“
اس کے انداز میں اتنی سچائی جھلک رہی تھی کہ ممی نے بنا کسی رد و کد کے اجازت دے دی تھی۔
وہ سیدھا بیچ ایٹ کالج پہنچ گئی۔

اسسٹنٹ پروفیسر اسامہ حسن کو ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ ایک بج رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اپنی کلاسز سے فارغ ہو کر اسٹاف روم میں آیا تھا، جہاں جاوید کیانی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔
”ایکسکیوز می سر! کیا آپ مجھے دس منٹ دے سکیں گے۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“
اسامہ نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر ایک لمحے کو حق دق رہ گیا۔ ظاہر ہے، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہاں آ سکتی ہے۔ اسامہ نے ایک نظر جاوید کیانی کی طرف دیکھا پھر طوعاً کرہاً اٹھ کھڑا ہوا۔
”آئیے، باہر آجائیے۔“ وہ خشک انداز میں کہہ کر آگے بڑھا۔ روحا اس کے پیچھے تھی۔

اسامہ سیدھا پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آیا تھا۔ روحا چپ چاپ فرنٹ سیٹ کا لاک کھلنے پر ساتھ بیٹھ گئی۔

”گاڑی کسی ایسی جگہ روکے گا جہاں آس پاس لوگ نہ ہوں۔“ روحا کا لہجہ بہت حتمی اور قطعی تھا۔
اس کے تیور سمجھ میں نہ آنے والے تھے۔

اسامہ نے علامہ اقبال یونیورسٹی کی طرف جانے والے ایک قدرے سنسان راستے پر گاڑی روک دی، صرف پانچ منٹ بعد۔

آس پاس درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔
”ذرا باہر آئیں گے، پلیز۔“ وہ جھنجھتے ہوئے لہجے میں کہہ کر نیچے اتر آئی۔

مجبوراً اسامہ باہر آ گیا۔
”یہ کیا ڈرامہ ہے؟“ وہ سختی سے مخاطب ہوا۔
”ہاں، یہ ڈرامہ ہی ہے۔ غور سے دیکھیے۔“ اس کے لفظوں اور چہرے سے آگ نکل رہی تھی۔
پھر اچانک اس نے اسامہ کا گریبان پکڑ لیا۔

رہی تھیں۔

”بس یونہی۔ آپ فکر مند تو ہوں گی کہ خاندان کے کتنے ہی لڑکے لڑکیاں بٹ چلے ہیں۔ بس آپ بھی اس نیک کام میں دیر نہ کیجیے گا۔ لڑکا جو بھی ہو، جیسا بھی ہو، منظور ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ ہمارے خاندان کا نہ ہو۔“ اس کا لہجہ نے حدیثا تھا۔
صبا کچھ دیر تک ساکت بیٹھی اس کی صورت دیکھتی رہیں۔
تھیں۔ ”ابھی ہوئی لگ رہی ہو۔ انشاں کے گھر ٹائم تو اچھا گزرا تا۔“ وہ کچھ کھوجنے کے چکر میں ”نہی!“ وہ جس طرح اچانک آئی تھی، اسی طرح پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

”آؤ ابھی بکرو، پہلے تمہاری باری ہے کیونکہ بزرگوں نے یہی طے کیا ہے کہ پہلے چار بیروں والے بکرے ذبح ہوں گے، ان کے بعد ٹھیک پندرہ دن بعد دو بیروں والے بکروں اور بکریوں کو قربان کرنے کی دل خوش کن تقریب چاکی جائے گی۔“
احمد بکروں کی خاطر سیوا کرتے ہوئے انہماک سے جو گفتگو تھا۔
”ابھی بھی سوچ لو برادران! بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ اس دردناک عذاب سے جس کا پہلا مظاہرہ پندرہ دن بعد سردوں اور باجے گائے کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔“
وہ اسنہ اور احمد کو خردا کر رہا تھا۔

”ارے اٹھاؤ اس ”کیدو“ کو یہاں سے۔ یہ ادھر کہاں آگیا۔“ احمد نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔

”بھئی، جب اوکھلی میں سردیا تو موصول سے کیا ڈرنا۔“ احسن ترنگ میں بولا۔
”تمہاری والی ریڈیو پاکستان تو اس قدر بولتی ہے کہ شادی کے بعد تم ہمیشہ کے لیے سماعت سے محروم ہو جاؤ گے۔“ احمد نے پیش گوئی کی تھی۔
”وہ تو جلتی بھی ہے، حد سے زیادہ۔“ احسن ہنسا۔ ”اس کا کیا کریں۔“
خود ہی جل جل کر کوئلہ ہو جائے گی، ٹھنڈا کوئلہ۔“ احمد نے بکروں کے لیے پنے کی دال کا برتن لاتی غیر کوکن اکھیوں سے دیکھ کر کہا۔
”شٹ اپ۔“ غیر نے برتن رکھ کر اسے گھر کا۔

”یہ اسامہ بھائی کیا کر رہے ہیں کمرے میں بند ہو کے۔ آج کل عجیب گم صم ہیں۔“ علی کو تجسس تھا۔ اسامہ آج کل خود سے سوال و جواب میں مصروف تھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ اس لڑکی کو کتنا غلط سمجھتا رہا تھا۔

اس کے ظاہری پہناوے کو اس کا باطن سمجھ کر اسے بے باک اور ایکسپوزنگ کر کے خوش ہونے والی لڑکی خیال کرتا رہا تھا۔
اس کی انجمن، اس کی معصویت سے لبریز کم گوئی کو اس کا احساس برتری اور غرور دولت و حسن تصور کر کے اس سے متفر رہا تھا۔

اس کی لاعلمی کو اس کی اداسی سمجھ کر اس کی حوصلہ شکنی کرتا رہا تھا۔

اس کا مسئلہ صرف اتنا سا تھا کہ اس کی یاں اس کی تربیت کے لیے تو اس درجہ ہلکان ہو رہی تھی کہ امریکہ میں بھی پاکستانی اسٹائل کی پرورش کی تھی مگر پاکستان آکر اپنی صلاحیتوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرنا اور یہاں کی سوسائٹی میں خود کو ڈھالنا نہیں سکھایا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان آتے ہی گویا اچانک اس کا تھکا چھوڑ دیا گیا تھا اور گائیڈ کرنے کے بجائے ”چیکر“ اور ”کنٹرولر“ کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔
ہر لمحہ اس پر نظر رکھتیں۔ اسے جائز آزادی بھی نہیں دی گئی دوستی کرنے کی اور نبھانے کی۔
ایسے میں پھر وہ کیا کرتی، ایسی ہی بے وقوفیاں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

آج بقرعید کا دن تھا۔
”افو، روحا! آج بھی جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔“ صبا جھلا گئی تھی۔
”ممی! میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے، نمپر پچر بھی ہے۔ میں ریٹ کروں گی، آپ چلی جائیے۔“ وہ میٹرھیوں کے پاس کھڑی نقابہت سے کہہ رہی تھی۔ صبا نے اوپر آکر اس کی کلائی پکڑی۔
”ارے تمہیں تو تیز بخار ہو رہا ہے۔ یہ کیسے ہو گیا۔ کل تک تو بالکل ٹھیک تھیں۔“
اب وہ کیا بتاتی کہ اس سردی میں وہ برف کے کیوبز چبا چبا کے اور تخ پیپسی پی پی کر اپنا حشر نشر کرتی رہی ہے۔

اتنی ”مختنوں“ سے تو یہ بخار چڑھا تھا۔
”حسن منزل“ عید ملنے تو لازمی جانا ہے۔ اب تو تیار بھی ہو چکی۔“ صبا نے اپنی تیاری پر ایک نظر ڈال کر تشویش سے اسے دیکھا۔

”ارے ممی! میں بہت سکون سے رہوں گی یہاں۔ آپ پلیز چلی جائیے۔ جلدی آجائیے گا۔“
اس نے انہیں منا کر کسی طرح بھیج ہی دیا۔

”مجھے اب تمہارے سائے سے بھی بچنا ہے اسامہ حسن! میں تمہارا سامنا اس دن کروں گی جب کسی اور کے نام کی انگٹھی پہنوں گی۔ یہ وعدہ ہے میرا، روحا کا۔“
وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

رات والے پلکے پہلے قدرے خشک زرد لباس میں بکھرے بالوں کو بے دھیانی سے ریز میڈ میں جکڑتی وہ ارادوں کے پل باندھ رہی تھی۔
کیا سمجھا ہے، اپنی ارزاں ہوں کیا میں۔

ایک بار تمہارے نفرت بھرے انداز نے میری زندگی نکھار دی تھی اور میں تمہاری محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

مگر اب کی بار تمہاری نفرت نے مجھے تم سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔“ آوارہ، بدکردار، اف مائی گاڈ!“ ابھی تک وہ الفاظ سامعوں میں گونج رہے تھے۔ اس کے کانوں کی لوٹیں جلنے لگی تھیں۔
وہ سر جھٹک کر باہر لاؤنج میں آگئی اور ٹی وی کھول لیا۔ اچانک کھٹکے پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔

سیڑھیاں ملے کر کے آخری سیڑھی پر کھڑا سامہ ہاتھ میں لے لیے بڑی اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔
”عید مبارک۔“

وہ لب بچنے خاموش کھڑی روحا کے عین سامنے آ گیا۔
”میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ تم بھلے مجھ سے شادی نہ کرو مگر میں تو تم سے اور صرف تم سے ہی شادی کروں گا کیونکہ تم ہی مجھے بھری دنیا میں اس قابل نظر آتی ہو۔“
وہ بے تکلفی سے اس کا دایاں کان کھینچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
”تمہاری اس دن کی طویل اور ”پر مغز“ تقریر نے مجھے یہ احساس دلایا کہ تم واقعی بدل گئی ہو، نکھر گئی ہو مگر آئندہ ایسے سڑک پہ بھاں بھاں روٹا نہ شروع کر دیا کرنا۔ اس کام کے لیے میرا شانہ بھی حاضر ہو گا۔“

وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتی رہی۔

”اچھا کیا جو آج تم نہیں آئیں۔“ وہ بشارت سے بولا۔

”میں نے اباجی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں چھ شادیوں کی تیاری کر رہے ہیں، وہاں ایک اور بھی ”ایڈ“ کر لیں۔ میں ٹھیک پندرہ دن بعد تمہیں اپنے گھر میں دہن بن کر آتے دیکھنا چاہتا ہوں، اس لیے آج تمہارا وہاں جانا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔“

”صرف پندرہ دن؟ اتنی جلدی شادی کی تیاری کیسے ہوگی؟“

وہ بے اختیار چلا اٹھی پھر اچانک ہی اس کی زبان کو بریک بھی لگ گیا تھا۔ یہ خیال آ گیا تھا کہ وہ تو اس سے کبھی شادی نہ کرنے کا عزم کر چکی تھی۔

اسامہ کا بلند دالا قبضہ اسے بری طرح شرمندہ کر گیا تھا۔

”تمہیں تیاری کی کیا ضرورت ہے؟“ اس کی گرم جوش نظروں نے روحا کو رخ موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تم تو قدرتی طور پر نکھری سنوری ہوئی ہو۔“

یہ شخص بھی قبضہ لگا سکتا ہے!!

سراہ سکتا ہے!!

چاہ سکتا ہے!!

ہونے کو دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔

ایک یہ بھی سہی۔

خود اسامہ کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کب اس بے وقوف سی بوکھلائی گھبرائی لڑکی نے اس کے دل پر نقب لگائی اور اس کی خود ساختہ ”قسم“ کو پکچنا چور کر دیا۔

شاید محبت کا ادراک اچانک ہی ہوتا ہے اور ادراک ہوتے ہی وہ شخص رگ جاں سے بھی قریب لگنے لگتا ہے۔

☆☆☆

زندگی سوز و محبت کے سوا

تانیہ تو جب سے ”خاورولا“ آئی تھی مسلسل تجربے اور تجزیے کی زد میں تھی۔ بقول سلیم کوثر کے یہاں منظر سے پس منظر تک حیرانی ہی حیرانی دیکھنے کو مل رہی تھی اسے، نہ یہاں کا ماحول سمجھ میں آتا تھا اور نہ یہاں کے مکینوں کے مزاج پلے پڑتا تھا۔ عجیب پر اسرار سی فضا تھی اور عجب کترائے، اکھڑے اجنبی رکی روٹوں والے لکیں۔

”یا خدا! کہاں پھنس گئی ہوں میں۔“ ایف ایس سی پری میڈیکل کر کے آگے میڈیکل میں اپلائی کر دیا اور خوش قسمتی سے اس کالا ہور میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا۔ مسئلہ رہائش کا تھا لاہور میں اس کے ڈیڈی کے دور کی جان پہچان کی ایک عزیزہ ساجدہ بیگم رہتی تھیں۔ پھر سوئے اتفاق کہ ساجدہ بیگم کی بہو شہرین کے میکے والوں کی تانیہ کی امی سے بڑی اچھی سلام دعا بھی لہذا انہوں نے خوش دلی سے اپنے ہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا۔ کالج کے ہاسٹل میں فی الحال دو ماہ سے قبل رہائش کے لیے کوئی کمر خالی نہ تھا سو اس وقت تک کے لیے اس کی رہائش گاہ ”خاورولا“ قرار پائی تھی۔ یہاں آکر شروع شروع میں تو خوب گھبرائی، نئی جگہ، نئی درس گاہ، نیا ماحول مگر پھر دو ہفتوں میں سیٹ ہو گئی۔ کالج میں ہم مزاج دوستیں بھی مل گئیں اور اساتذہ سے بھی بھجک اور اجنبیت دور ہوتی گئی۔ البتہ ”خاورولا“ میں وہ جتنا وقت گزارتی وہ قدرے بے سکونی اور بے چینی ہی میں کتنا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ انفرادی طور پر ان کا دور اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا، ہر شخص نے اپنی جگہ خوب آؤ بھگت کی تھی اسے ذاتی طور پر کوئی تکلیف یا پرہیز نہیں تھی۔

جو چیز اس کے اعصاب پر کوڑے کی طرح برستی تھی وہ اہل خانہ کے سردمہر انداز، خشک اور پر تکلف رکی رویے اور ایک دوسرے سے بدگمانی اور کدورت کے جذبات تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک دوسرے سے بدگمان اور شاکی نظر آتا تھا اور اس بدگمانی اور تنفر کا اصل منبع یا دوسرے لفظوں میں وجہ تنازعہ اس گھر

کے سربراہ خاور مغل کا سرد سنگین اور سپاٹ روہ تھا۔ ایک نظر دیکھنے میں بڑے گریس فل اور بردبار لگتے تھے مگر ان کے چہرے سے برستارعب، دبذبہ، سختی اور تندہی ان کی شخصیت کو مقابل کے لیے بڑی ہیبت ناک، پر جلال اور درشت مزاج بنا دیتی تھی۔ ان کی آنکھوں کا سرد دھڑ، روکھا بریلا تاثر جیسے رنگوں میں دوڑتا خون منجمد کرنے کا باعث بن جاتا تھا۔

ان کے اس سخت گیر اور چٹان صفت مزاج کی بدولت اماں جی (ساحدہ بیگم) تک اپنا اصل مدعا و منتہا پیش کرتے وقت گھبرا جایا کرتی تھیں۔ حالانکہ بظاہر وہ کہتے کسی کو بھی کچھ نہیں تھے۔ نہ چیخ چلا کر برہم مزاجی کا اظہار کرنے کی عادت تھی وہ ٹھیک ٹھاک کم گو تھے مقابل کو بے اوسان کرنے کے لیے ان کا دھیمہ مگر دو ٹوک حتیٰ سر دوسپاٹ لہجہ ہی کافی ہوتا تھا۔ جس کے آگے اماں جی کی بھی نہیں چلتی تھی۔

”گورنس کدھر ہے؟ بے پی نیند سے جاگ گئی ہے۔“ چھ ماہ کی زینی کاٹ میں پڑی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی رونے کی تیار یوں میں تھی۔ خاور ڈورینگ ٹیبل کے آگے سوئڈ بوئڈ ہو کر تیار کھڑے اپنا جائزہ لیتے ہوئے برش کر رہے تھے۔ اماں کو کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے پر استفسار اور اطلاع کا کام انجام دیا۔

”ادھر کاشی کا یونیفارم بدلوا رہی تھی۔ آتی ہی ہوگی۔“ اماں جی کاٹ کی طرف بڑھیں۔

”اس کی ماں کہاں چلی گئی، پرانی عورت پر چھوڑے ہوئے ہیں بچے۔ اتنی بھی سی جان کو یوں ہلکتا چھوڑ کر جانے والی ماؤں کے کیلجے جانے پھرنے کے ہوتے ہوں گے۔ ہم سے تو ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔“ وہ زینی کو گود میں لے کر تھپک رہی تھیں، ساتھ ساتھ با آواز بلند بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

”جیسے اولاد نہ ہوئی کھلونا ہو گیا۔ فرصت ملی تو گلے سے لگا کر چوم چاٹ کر دو منٹ کو اپنا دل بہلا لیا ورنہ پنگھوڑے میں پھینک کر ج سنور کر باز ارون، ہوٹلوں کی سیر کو نکل لے۔“ اماں جی صاف انہیں سنا رہی تھیں۔

جواب میں خاور نے ٹھٹک کر مڑتے ہوئے بے حد سگتی نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا۔

”بحیثیت انسان ہر فرد کو اپنی مرضی سے آزادی سے جینے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ آپ کی بہو کوئی دنیا سے انوکھا کام تو نہیں کر رہی۔“

ان کے اکل کھرے انداز پر ماں جی نے بے حد برامان کر ان کی شکل دیکھی۔

”آزادی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بندہ گھبرا کر چولہے میں جھونک دے۔ بھلا بتاؤ سارا سارا دن گھر سے باہر گزار دینا، اولاد کو کسی غیر کے بھروسے پر چھوڑ جانا گھر میں آئے گئے سے ملنے ملانے کے اوقات میں گھر سے غائب رہنا کسی عورت کو زیب دیتا ہے کیا اس طرح گھر چلا کرتے ہیں؟“ وہ بگڑ رہی تھیں۔

”وہ جس ماحول اور جس گھر سے آئی ہیں وہاں ایسے ہی چلتا ہے اس میں ان کا کیا دوش۔“ ان پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

اماں جی بل کھا کر رہ گئیں۔ ”چڑیل نے کیسے میاں کو اپنے حسن کے جال میں پھانسا ہوا ہے کہ دو لفظ نہیں سن سکتا اس کے خلاف۔“

”مگر شادی کے بعد عورت کو سننے ماحول کے مطابق اپنے شوہر کے لیے خود کو بدلنا پڑتا ہے۔“

جواب میں ایک استہزائیہ مسکراہٹ خاور مغل کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

”ہر پیکر میں لچک نہیں ہوا کرتی اماں جی! یوں بھی شادی سے پہلے اسی روپ میں آپ لوگوں نے میں پسند کیا تھا یا انہیں پہلے بتا دیتیں کہ شادی کے بعد تمہیں اس پیکر میں ڈھلنا ہوگا اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

اماں جی زچ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”خیر سے گئیں کہاں ہیں؟“ انہوں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

”ظاہر ہے حسب سابق ویمن کلب کی کسی تقریب میں۔“

”ایک تو ان بیگم صاحبہ کے سوشل درک، اور پارٹیاں ڈنر ہی کبھی ختم ہونے کو نہیں آتے۔“ وہ پھر بڑی بدلنے لگیں۔ ”آ میں گی کب ملکہ عالیہ۔“

وہ خود پر کنٹرول کے باوجود طنز یہ لب و لہجہ ترک نہیں کر سکتی تھیں۔

”ڈنر کے بعد۔“ انہوں نے اطمینان سے تیار ہو کر اپنا الوداعی جائزہ لیا اور پرفیوم اسپرے کرنے لگے۔ ادھر اماں جی کس کر رہ گئیں۔

”ان کی واپسی تو آدھی رات کو ہوگی اور ادھر جو فریال کو دیکھنے کے لیے شام میں کچھ لوگ آرہے ہیں ان سے بات و ات کون کرے گا؟ دیکھ لو اب ذرا بہو صاحبہ کی نافرمانیاں۔“

حالانکہ کل سے بتا رکھا ہے بلقیس نے کہ کل فریال کے سلسلے میں کچھ لوگ آرہے ہیں، ان کے ہاں کی خواتین بھی بہو اور اس کے میسے والوں کی طرح گٹ پٹ گٹ پٹ انگریزیاں بولتی ہیں۔ بلقیس نے کہا بھابھی اور خاور ہوں گے تو ان کو آرام سے سنبھال لیں گی۔ ان پر بھی رعب رہے گا کہ ہم بھی کچھ کم نہیں۔ اب بتاؤ اپنے لٹو پچو کاموں کے لیے تو ان کے پاس فرصت ضرور ہے اور گھر کی اہم ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے کا کوئی خیال نہیں۔“

”مجھے ایک بہت ضروری بزنس ڈیلنگ کرنی ہے۔ میں تو ادھر جا رہا ہوں۔ بشیر میرا بریف کیس گاڑی میں رکھ دو، دیکھو صمد نے گاڑی اچھی طرح صاف کی ہے یا نہیں۔“ اماں جی جل کر کونسلہ ہی تو ہو گئیں۔

”دونوں میاں بیوی کو اپنے کاموں کی پڑی ہے اور ادھر بیوہ معذور بہن کی بیٹی کے مستقبل کی کچھ پروا نہیں، ماں کی تکلیف کا کچھ احساس نہیں، شاباش بچے۔“

مگر ادھر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا ان کے واویلے کا مدت ہوئی ایسی باتوں پر انہوں نے سیریس ہونا چھوڑ دیا تھا۔

”رشتے جوڑنے بنانے کے کام میں آپ سے زیادہ مہارت کس کو ہوگی۔ یہ محاذ آپ لوگ خود ہی بخوبی سنبھال لیجئے مجھے تو دیے بھی ایسے کاموں کا سہنس نہیں۔“

ان کے بے گانہ سے روکھے پتھیلے انداز پر ایک لمحے کو لاؤنچ میں ریوٹ کنٹرول کے بٹن دبائی تازہ شدہ رسی ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اماں جی جلے دل کے پھپھو لے پھوڑنے کے لیے

تانیہ کے پاس آ بیٹھیں۔

”جانے کون سی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہے۔ اپنے حسن سے میرے بیٹے کو اپنے قابو میں کر لیا ہے کہیں اتنا فرماں بردار، اتنا خیال رکھنے والا ہوا کرتا تھا، یہ حیثیت رہ گئی ہے ماں کی، دوسروں کی بھی تو بہو میں ہیں راج کرانی ہیں سسرال کو، اور فالٹو میں رعب بھی بہتی ہیں۔ میں نے تو اتنی نرمی اتنی محبت، اتنے لاڈ پیار سے رکھا ہوا ہے۔ اتنے تو اس کے خمرے ہیں، اپنے میکے کی امارت اور تعلیم کا ہم پر کیا احسان ہے۔ ہوں گے امیر وہ اپنی جگہ ہم کیا کسی سے کم ہیں۔ جب ہماری ہی خوشی غمی میں شریک نہیں تو ہمیں اس کی صورت اور امارت کا چاشنا ہے؟ میرے خاور پر تو جیسے سحر پھونک دیا ہے اس خوب صورت چڑیل نے۔“

شام کو فریال کو دکھنے کے لیے آنے والے مہمانوں کے ساتھ کیا ڈیلنگ ہوئی اس کا تو تانیہ کو پتہ نہ چل سکا کیونکہ وہ کالج چلی گئی تھی البتہ رات کھانے پر شہرین کے ماتھے کی تیوریاں، بلیٹس آپا اور اماں جی کے پھولے پھولے چہرے دیکھ کر خاصی حد تک اندازہ ہو گیا کہ بہر حال کوئی گرما گرمی ضرور ہوئی ہے یا پھر متوقع ہے۔

”یہ مجھ بد نصیب کی تقدیر تھی کہ خاوند حادثے میں چل بسا اور میں ٹانگیں کنوا بیٹھی۔ چھنھی جانوں کی ذمہ داری میرے میکے پر آ پڑی مجھے تو بڑا امان تھا بڑا آسرا تھا کہ بھائی میرے بچوں کو پھولوں کی طرح رکھے گا۔ مجھ کم بخت کو کیا خبر تھی بیوی کے آ جانے کے بعد بھائی کی نظر بدل جائے گی۔ اب اس جوگی بھی نہیں ہوں کہ محنت مزدوری کر کے ہی بچوں کا پیٹ پال سکوں۔ پڑی ہوں بھائی کے در پر لاوارثوں کی طرح، بچوں کا آگ پیچھا کون دیکھے گا۔ ان بد نصیبوں کا کون والی وارث ہوگا۔ سوچا تھا اب یہ فکریں بھائی بانٹ لے گا۔ اللہ نے پیسہ بھی کھلا دے رکھا ہے۔ بادشاہوں کے محل جتنا گھر ہے جگہ مل ہی جائے گی مگر جب دل ہی تنگ پڑ جائیں تو محلوں کو کیا کرنا۔“

بلیٹس آپا بڑی دل سوزی سے بغیر کسی کو مخاطب کیے کہہ رہی تھیں۔ جواب میں خاور مغل کی فراغ پیشانی پر ہل پڑتے تانیہ نے صاف دیکھ لیے تھے۔ شہرین تو ناک بھوں چڑھا کر نہایت بے نیازی کے عالم میں دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی تھی۔

”میرے حساب سے آپ لوگوں کو یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کے نام سے آپ کے ذاتی اکاؤنٹ میں ہر ماہ ایک کثیر رقم جمع کرواتا ہوں اس کے علاوہ آپ کے ہر بچے کا جب خرچ باقاعدگی سے ہر ماہ انہیں مل جاتا ہے، آپ کے بچے شہر کے بہترین انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کے جوتے، کپڑے دیگر ضروریات کے لیے علیحدہ سے رقم مختص کر کے اماں جی کے حوالے کرتا ہوں اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر آپ میرے سیکریٹری مختار اعوان صاحب سے کسی بھی وقت جتنی چاہیں رقم نکلا سکتی ہیں۔ گھر میں آپ سمیت آپ کے ہر بچے کے لیے علیحدہ بیڈروم ہے، آپ کی آسانی کے لیے آپ لوگوں کا پورشن بانی گھر سے الگ بنایا ہوا ہے، آپ کی خدمت کے لیے جوٹیں گھنٹے ملازم موجود رہتے ہیں گھر میں اس کے علاوہ بھی آپ لوگوں کی چھٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو شکوہ ہے تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“

ان کے بدل دوٹوک، حتی انداز پر اماں جی بمعہ بلیٹس آپا جزبزی ہو کر رہ گئیں۔

”بیٹے یہ سچ ہے تم نے ہر طرح سے بیوہ معذور بہن اور بوڑھی ماں کے آرام کا خیال رکھا ہوا ہے مگر بچہ روئے پیسے اور عیش و آرام کے علاوہ بھی بندے کی ہزار ضروریات ہوتی ہیں۔ ہم لوگ ترستے رہتے ہیں کہ تم دو گھڑی کو ہمارے پاس بیٹھو گے ہم اپنے دکھ سکھ کی باتیں کریں۔ ہمیں بولیں۔ بہو نے تو خیر قسم کھائی ہوئی ہے دکھ سکھ میں شریک نہ ہونے کی۔ مگر تم تو ہمارے اپنے ہو، ہمیں تو یوں لگتا ہے تم ارے درمیان رہتے ہوئے بھی ہمارے نہیں ہو۔“

جواب میں خاور مغل نے یکے بعد دیگرے بہن اور اماں پر گہری نظر ڈالی اس چپ چپ سی نگاہ میں بے متحرک، طنز اور آرزو کی تھی۔

”اس دور میں سب سے بڑی ضرورت جسمانی تسکین ہی ہے، پیسہ ہے تو اس سے من پسند کھانے کپڑے جاسکتے ہیں۔ رقم ہاتھ میں ہے تو پورا بازار خرید جاسکتا ہے۔ جب گرم ہے تو بادشاہوں جیسا محل پر کیا جاسکتا ہے۔ سب کچھ مایا می ہوئی ہے۔ آپ کے پاس پیسہ موجود ہے اس سے جو جی چاہے یہیں۔“

”مگر انسان کا نعم البدل پیسہ نہیں ہوا کرتا۔“ اماں جی کو دلی رنج پہنچا تھا بیٹے کے جذبات سے

”اچھا۔۔۔“ ان کی نظریں جیسے ماں کی نظروں میں بیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

”یہ سب پرانے زمانے کے خیالات ہیں اماں جی! انسان چاہے تو پیسے کے بل پر انسان کو بھی یہ دیکھتا ہے۔“

”اس کے جذبات، اس کے دل کو تو نہیں خرید سکتا ہے نا۔“ تانیہ کہنا چاہ رہی تھی مگر صورت حال کو دیکھتے ہوئے دل میں ہی دبا کر رہ گئی اپنا خیال۔ یوں بھی وہ خاور مغل سے براہ راست بھی مخاطب نہیں دلی تھی اور سچی بات تو یہ بھی نہ ہی اس کی اتنی ہمت پڑتی تھی۔

”بہو اگر تم تھوڑا سا وقت نکال کر آ جاتیں، مہمانوں سے مل لیتیں تو کیا حرج تھا۔“

اماں جی اپنی المادر، طرح دار، بے پناہ حسین بہو کو سیدھا سیدھا آڑے ہاتھوں تو نہیں لے سکتی تھیں۔ اسی لیے دے دے انداز میں اپنی تنگی جتا رہی تھیں۔

”میں نے کوشش کی تھی آئی، مگر ٹائم نہیں ملا۔“ وہ بظاہر نہایت رسانییت سے کہہ کر اٹھ گئی تھی۔ پھر ات کو تانیہ کے ساتھ باہر واک کرتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”ہاں میں کروں نا ان کی خاطر داریاں، پاس داریاں، جیسے مجھے تو پھولوں کی سیج پر بٹھایا ہوا ہے۔ باؤ گرنی نے میرے شوہر کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ اسے میرا ہونے ہی نہیں دیا۔ جب چھل کھانے ہی بے نصیب میں نہیں ہیں تو بچوں کی دیکھ بھال کر لینے سے کیا حاصل۔“

”کیا مطلب بھابھی۔“ وہ ہلکی سی شہرین کو دیکھنے لگی۔ ”کیا خاور بھائی آپ کے ساتھ ایچھے نہیں ہاں؟ ساجدہ آئی کا کہنا تو یہ ہے کہ آپ کی کشش نے خاور بھائی کے مزاج بدل دیے ہیں۔“ تانیہ کو خاصا غم تھا۔

”ہونہ، بڑھیا کے دماغ میں تو خناس بھرا ہے۔“ شہرین چیخ گئی تھی۔

”میاں میرا ہے اور نازخہ ماں بہن کے اٹھاتا ہے۔ ارے مجھے تو ایک ایسی ساعت نصیب ہوئی ان پانچ سالوں میں جس میں دل کو یہ یقین ہوا ہو کہ خاور صرف اور صرف میرے ہیں۔ میرے بنے ہی نہیں بھی۔ جانے فطری جذبے کیسے قریب لے آئے جو کاشی اور زینی کی صورت میں میرے آگن میں دو پھول کھل گئے، ورنہ اس پتھر صفت بے حس انسان کے قرب میں شاید ساری عمر لیے پیاسی بیٹھی رہتی۔“

تانیہ جیسے ستائے میں آگئی۔ شہرین کے چہرے پر بولتی نارسائی، تشنگی اور حسرت پکار پکار کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔

”تو بھابھی! آپ خود کو بدل کر دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا موجودہ روپ ان کی پسندیدگی معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ میرے بڑوس میں ایک آئی رہا کرتی ہیں۔ ہیں تو بالکل ٹینک مگر میں انہیں شہر سے آئی ہی کہتی رہی ہوں۔ نموا آئی۔ وہ کہا کرتی ہیں تعلقات استوار کرنے کی پہلی سیرمی caring and caring behavior (دوسروں کا خیال رکھنا) وا کرتا ہے۔ آپ ان کو کھولیں ان کے کی بات انہیں زبان پر لانے کا موقع دیں پھر اس کے مطابق ان کے مطلوبہ روپ میں ڈھل جائیں۔ شہرین نے ملول سے انداز میں اس کے گلابی رخسار جھپکے۔

”ارے تانیہ ڈیز! تم نہیں جانتیں خاور مغل کا دل ایک ایسا بند قلعہ ہے جس میں داخل ہونے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، کوئی دروازہ نہیں ہے جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکے۔ اس کھٹور شخص کا دل ناممکن ہے، میں ان پانچ سالوں میں ہر حربہ اپنا چکی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے وہ کسی سے۔۔۔“ تانیہ نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر شہرین کی طرف دیکھا وہ متشعل سے انداز میں مسکرا دی۔

”ایسا بھی کچھ نہیں ہے، میں الف تائی اس کی ہسٹری پڑھ چکی ہوں، کھنگال چکی ہوں۔ اس ساری زندگی نہ کوئی دوست بنایا نہ راز دار، بڑس اور صرف بڑس اہم ہے اس کے لیے۔ ہر شے سے؛ میں نے اکثر اوقات خفیہ طریقے سے اس کی باہر کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہے۔ اس کی کالز اس آفس کا ماحول ہر شے چیک کر ڈالی مگر کوئی سراہا تھ نہیں آیا بھلا بتاؤ جس شخص نے ساری عمر کسی مرد بھی دوستی نہ کی ہو وہ عورت سے کیا حلق رکھے گا۔ حتیٰ کہ امریکہ جیسے آزاد خیال ملک میں دو سال گزار کے باوجود اس کے سرد پتھر جیسے دل کو جذبات کی آج نہیں پگھلا سکی۔ اب تو میں ہر طرف سے ماہو چکی ہوں تانیہ۔“

تانیہ الجھتی گئی تھی۔ خاور مغل کی شخصیت اسے اول روز سے بڑی پراسرار اور پرت داری لگتی تھی یوں جیسے پرانے طرز کی بنی ہوئی کوئی خوب صورت سی آسیب زدہ جویلی ہو۔ جسے دور سے دیکھ کر جہان میں پھریری سی دوڑ جاتی ہو۔ وہ ان سے اچھا خاصا خائف رہتی تھی اور اب تو مزید ہراساں کی ہو چکی تھی۔

ارے کہاں نکل رہی ہو تم؟“ صائمہ اور راضیہ دونوں جڑواں تھیں اور میٹرک کے سپر ز دے کر غ ہوئی تھیں، خصوصی اہتمام سے تیار ہو کر بشپ کو گاڑی نکالنے کا کہہ رہی تھیں۔ جب ساجدہ بیگم سے کڑک دار آواز میں استفسار کیا۔ ان کی آنکھوں میں ناگوازی اور غصہ تھا۔

یونہی نانی جان، ذرا آؤ تنگ پہ جارہے ہیں۔۔۔“ صائمہ نے بوتیک کا ڈیزائن کردہ نئے نوے لے کے جدید کڑھائی والے سبز سوٹ کے کلف زدہ اکڑے ہوئے دوپٹے کو ایک سائیڈ پر کرتے لے لاپرواہے انداز میں جواب دیا۔

کون سی آؤ تنگ ہوتی ہے اس وقت؟ شام سر پر ہے اور جوان جہان لڑکیاں اکیلی نکل رہی ہیں۔۔۔ چلو بیٹھو گھر آرام ہے۔“

ارے چھوڑیے بھی نانی جان، کیا دقتا نوی باتیں کرتی ہیں۔“ راضیہ نے اپنے بوب کٹ بالوں کو مکھنے کے بعد نانی کے کندھوں کو ہلکا سا چھوا، اور پھر بڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ساجدہ بیگم تلملا کر ادبھتی رہیں۔

دیکھ لو، کس قدر خود سر ہے یہ اولاد تمہاری نہ شرم نہ حیا، دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ ایک وہ لہر سارا سارا دن بائیک اڑاتا رہتا ہے۔ خبر جو ہے ماموں کے پاس تجوریاں بھری ہوئی ہیں۔ ہے سو برباد کر رہے ہیں۔ بڑی فریال ہی کو دیکھ لو۔ نوکری کی تو شور مچا دیا کہ مجھ سے صبح شام کیوں پہ دھکے نہیں کھائے جاتے اور ماموں سے فرمائش کر کے نئی سوزوکی کار لے لی۔ اب صبح اپنی ہے اور شام گئے سارا پیٹرول پھونک کر نو ابوں کی طرح ٹھانٹھ سے گھر واپس آتی ہے نہ کوئی نہ بولنے والا۔“

دک ٹوک اور پوچھ گچھ تو گھر کے مرد ہی تو کیا کرتے ہیں۔ یہاں ماموں کے پاس ناغم نہیں بے مار نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے میں معذور مجھ سے کون ڈرے۔ ماموں نے کھلی پھٹی ہے۔ سو بگڑیں گے نہیں تو اور کیا ہوگا۔“ بلقیس آپا، ماں، کہہ دو ایلے پر سارا دوش بھائی کو دے

اں کے پاس تو ایک ہی جواب ہوتا ہے، روپے پیسے کی، کھانے پینے کی عیش آرام کی تنگی ہے تو ما، بائی باتوں کے لیے میں ذمہ دار نہیں ہوں۔“

بانے وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے، وہ تو بڑے لحاظ والا بڑے احساس والا ہوا کرتا تھا۔“ بلقیس کو دلوں پر سخت ملال تھا۔

پڑا بیٹو کی ڈایا گرام بناتے ہوئے چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی اس کے ذہن میں ہلچل مائجی۔

سے جانو، چندا میری، جلدی سے چپ ہو جاؤ ابھی آیا آرہی ہے۔“ آں آں کرتی ہاتھ پاؤں لودنوں ہاتھوں پر اٹھائے وہ لان میں ٹپل رہی تھی، جب اندر سے خاور مغل نکل کر پورچ کی نہ نظر آئے۔

ہٹس۔“ بے تاثر سے انداز میں کہہ کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا پھر اخلاقاً
نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کارا وہ ایسا نہیں تھا مگر پھر کچھ سوچ کر احتیاط سے بیٹھ ہی گئی۔ وہ مکمل طور پر پیٹی وی کی جانب
شاہد بی بی سی لگا ہوا تھا۔ تانیہ نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان کا جائزہ لینا شروع کر

فی شاندار پر سنائی ہے مگر آنکھوں اور چہرے پر اتنی بے گانگی کیوں ہے، ہونٹوں پر اپنائیت آمیز
کے نشان کیوں نہیں ملتے۔ مجھے ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے مگر میں نے ابھی تک ان کے ہونٹوں
ہی مسکراہٹ کی جھلک بھی نہیں دیکھی نہ ماں بہن کے لیے، نہ بیوی بچوں کے لیے نہ کسی
ننا کے لیے، کتنی بند بند سے لگتے ہیں دیکھنے میں، شہرین پھا بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ ایک
برقعہ ہیں۔ لیکن پھر بھی ہیں تو انسان ہی نا، نمود آئی کہا کرتی ہیں اللہ نے کسی شخص کو پیدا کسی برا
۔ اللہ تعالیٰ کو تو اپنی ساری مخلوق سے برابر کا پیار ہے انسان کے اچھا برا ہونے میں سب سے
باپ کی دی گئی تربیت اس کے بعد ارد گرد کا ماحول اور پھر معاشرے کے افراد ہوا کرتے ہیں،
اتھا ایسا کیا مسئلہ ہے؟ ماں خائف، بہن ہٹا کی، بیوی مظلوم، بچے توجہ کے منتظر اور ایک یہ ہیں ہر
صرف بڑس میں کم رہتے ہیں۔

آپ کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے یہاں؟“

اپنے دھیان میں نہایت انتہاک سے ان کو پڑھ رہی تھی جب دفعتاً اس کی طرف متوجہ ہوتے
ہوں نے دریافت کیا تھا۔

بل لے کر تانیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، چوری پکڑے جانے کے خیال سے چہرے پر خفت
جھا گئی۔ خاور مغل نے ایک لمحہ کو اس سترہ اٹھارہ برس کی دو شیزہ کا معصومیت اور سادگی کے رنگوں
ش کو لپ گلابی چہرہ دیکھا پھر بے تاثر انداز میں نگاہ ہٹائی کہ نظر کے اس تصادم نے تانیہ کی پیشانی
دکڑی تھی۔

”جی نہیں تو۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ مکمل طور پر پیٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے، اصولاً اب اسے اٹھ جانا چاہیے تھا اس کا
کا کام نہیں تھا۔

”خاور بھائی! آپ ماسٹر نہ کریں تو ایک بات پوچھوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر جانے کیوں
اگے بڑھا کر بے ساختہ رک کر پوچھ بیٹھی تھی۔

”جواب میں انہوں نے صرف ہنسی اٹھا کر مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ابھی گھبراہٹ پر قابو پا کر کہنے لگی۔“ خاور بھائی میں نے اکثر محسوس کیا ہے جیسے آپ کو خدا نا خواستہ
میں کا سامنا ہے۔ آپ کے انداز میں بڑی بے گلی اور اضطراب سا پایا جاتا ہے۔ جس سے لگتا ہے
پیشانی ہے۔“

ال کے خاموش ہونے پر خاور مغل نے چونک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اتنی معصوم سی، چھوٹی

تانیہ نے ایک لمحہ کو اپنی توجہ زینی سے ہٹا کر ان کی جانب مبذول کی۔

سلور گرے تھری پیس سوٹ میں وہ تک سب سے تیار بڑی شان بے نیازی سے پڑا
چال چلتے ہوئے سفید کرولا تک آئے تھے۔ براؤنش بلیک گھنے بالوں کا کچھا بڑے اسٹائش
ان کی پیشانی پر پڑا ہوا تھا۔
”نہ جانے کتنے دل تو اسی کچھے میں اٹک گئے ہوں گے۔“ اس نے بے خیالی کے عالم
تھا۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کچھ سوچ کر وہ رک گئے۔

”ہیلو بے بی کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ انہوں نے رسا پوچھ لیا۔

”فائن۔“ وہ ان کی موجودگی میں ہمیشہ کی طرح گھبرا کر بوکھلا سی گئی تھی۔

”اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟“ انہوں نے یونہی پوچھ لیا، باباں ہاتھ گاڑی کالا کھول رہا
”ٹھیک ٹھاک۔“ تانیہ کو جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بڑے اچھے اچھے سے بول
گہری بھوری آنکھوں میں عجیب سی سرخی پھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس بابت پوچھنا چاہ رہی
ہمت کہاں سے لاتی۔

”ابنی پراہلم۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسی نارمل سے انداز میں اچھٹی سی ڈ
ڈال کر سوال کیا اور اس کے سرخی میں ہلا دینے پر زن سے گاڑی نکال کر لے گئے۔

وہ زین کو لوری دیتے ہوئے کتنی ہی دیر ان کے بارے میں سوچتی رہی۔ یونہی بے دھیانی
میں ان کے رویوں کا تجزیہ کرتی رہی۔

رات کو پڑھتے پڑھتے پیاس لگی۔ اپنے فریج میں جھانکا اتفاق سے دونوں بوتلیں خالی
گلاس اٹھائے باہر آئی۔ لاؤنج سے گزرتی رولائٹ جلتی دیکھ کر ادھر آ گئی۔

صوفے میں دھنسنے، منہ میں سگریٹ دبائے بظاہر تو وہ پیٹی وی کی سمت متوجہ تھے مگر ذہن
بھول بھلیوں میں گم تھا۔ جس پر قیمتی سلیسبنگ گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ لاؤنج کی فضا میں سگریٹ کی
ساتھ ساتھ ان کے مخصوص برقیوم کی بھٹی بھٹی خوشبو شامل تھی۔

اس نے مڑ کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ باقی پورا گھر نیند
میں تھا۔

معاً ان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ قدرے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تانیہ نچل سی ہو کر آگے بڑ
اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں تھا۔

”آپ سوئے نہیں ابھی تک خاور بھائی۔“ تھوک نکل کر ہاتھ میں پکڑے گلاس کے کنا
مضبوطی سے انگلیاں جماتے ہوئے اس نے انہیں مخاطب کیا، انداز میں جھجک تھی۔

”نہیں۔۔۔“ اس سے مختصر جواب کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی نظریں پیٹی وی اسکرین
تھیں۔

کچن میں گئی تو پانی پینے کے بعد اپنے لیے کافی بنائی اور ساتھ میں ازراہ ہمدردی ان کے لیے بھی

سی سادہ سی لڑکی محسوسات کے اعتبار سے اتنی پختہ بھی ہو سکتی ہے۔

”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ جا کر آرام کیجیے۔“ ان کے انداز میں اتنی قطعیت سے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دبے قدموں وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”فاطمہ! ایک کپ چائے بنا دینا اسٹرانگ سی۔ سر میں بہت درد ہے۔ میں اپنے کمرہ ہوں۔“ وہ بجلت چکن کے دروازے سے ہانک لگا کر بڑھ گئے تھے۔ یہ دیکھتے بغیر کہ چکن میں تانیہ کھڑ پڑ کر رہی ہے۔

اپنے لیے دو پہر کا کھانا نکالتی تانیہ نے اپنا کام روک کر ان کے لیے چائے بنائی اور مدہم دے کر ان کا جواب ملنے پر اندر چلی آئی۔

”ارے آپ نے کیوں زحمت کی۔“ وہ ٹائی ڈھیلی کیے اپنے اسی فارل ڈریس میں ایزی دراز تھے۔ انداز میں بہت تھکن اور کسٹمنڈی نمایاں تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے کپ انہیں تھما دیا۔

”خاور بھائی! آپ اتنے تنہا اتنے آدم بے زار سے کیوں رہتے ہیں سب سے الگ تھلگ ہی دنیا میں گم۔“ آج وہ ساری راتیں بے دار کر کے بالآخر پوچھ ہی بیٹھی۔

”آپ کا وہم ہے بے بی۔“ اس کی بات پر وہ پہلے ٹھٹھے، پھر سر جھٹک کر سختی سے کہہ کر چا سمت متوجہ ہو گئے تھے گویا مزید کچھ نہ سننے بولنے کا سٹل دے دیا ہو۔ مگر وہ جیسے طے کر کے آئی تھی ”اس طرح کا رویہ تو خود آپ کے لیے بہت براہمنز کمری ایٹ کر دے گا۔ آپ بہن ہو جائیں گے۔ نموائی کہا کرتی ہیں ہم معاشرے میں اکیلے نہیں ہوتے ہاں مگر اس وقت جب ان کو آرڈینیشن میں غلل واقع ہو جائے اور کیونٹیشن گیپ پیدا ہو جائے۔“

اس کے سادہ و فطری رواں لہجے پر اور سب سے بڑھ کر اس کے جملوں کے انتخاب پر وہ بھونچکا ہو کر حقیقی معنوں میں اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

وہاں کے یوں نجمہ سا ہو کر گھورنے پر اندر سے ہر اسال ہی ہو گئی، شاید مجھے اتنی جرأت کا نہیں کرنا چاہیے تھا، وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔

”کیا ہو رہا ہے بے بی۔“ اس شام وہ لان میں سبزے پر بیٹھی پڑھ رہی تھی جب وہ آئے۔

”جی۔۔۔ بس بڑھائی، آپ آئیے نا، بیٹھے پلیز۔“ اور تانیہ کو حیرت اس وقت ہوئی جب لان چیر گھسٹ کر بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔

”میں تو بہت بڑی رہتا ہوں، دھیان نہیں دیا اس پوائنٹ پر۔ آپ کو آؤٹنگ وغیرہ جانا ہو تو ضرور بتائیے گا۔“

”خاور بھائی! اگر میں یہ کہوں کہ آپ اتنا بڑی رہتے نہیں ہیں جتنا کہ خود کو بڑی رکھتے ہیں اس نے ان کی دوسری بات گویا سنی ہی نہیں تھی۔

وہ اس بار بڑے زبردست انداز میں چونکے، تانیہ نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خود کو شاباشی دی۔ گویا اس کا تنگا درست نکلا تھا۔

”آپ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ ان کی پیشانی پر بے شک غصے اور ناگواری کے بل پڑے وئے تھے مگر آنکھوں میں گردش کرتی پریشانی اور تعجب بہر حال تانیہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

اس کا اندھیرے میں چلا یا گیا تیرنشانے پر جا لگا تھا۔

”نموائی کہا کرتی ہیں جب کوئی شخص زمانے سے خائف ہوتا ہے تو بے گانگی اور غصے کا خول پیٹ کر قلعہ بند ہو جاتا ہے۔ اس قلعے کو باہر سے دیکھنے والے اسے بڑا مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں جب کہ جو بہادر اور ہمت کر کے اس کے اندر گھستا ہے وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ جاتا ہے کہ اتنی قلعے کے اندر تو راضل ریشم جیسی نرمی ہے۔“

”آپ اتنی چھوٹی سی ہو کر اتنی بڑی اور مشکل باتیں کیسے کر لیتی ہیں۔“ وہ حقیقتاً متحیر رہ گئے تھے۔

”اس کا کریڈٹ نموائی کو جاتا ہے، ان ہی کا کہنا ہے کہ شیر کر لینے سے دکھ آدھا رہ جاتا ہے، آپ کے ساتھ اگر کوئی براہمنز ہے تو اسے جتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیں۔ شہرین بھابھی سے شیر کر لیں آئی یا آپا سے کہہ دیں وگرنہ آپ پر بیچ سوچوں کے جال میں الجھتے چلے جائیں گے۔“

اس نے بڑے خلوص سے انہیں مشورہ دیا تھا جس پر جانے انہوں نے عملدرآمد کا سوچا یا نہیں البتہ یہ ہوا کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ بڑا اپنائیت آمیز اور کسی حد تک دوستانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کی سرگرمیوں میں، اس کے فرصت کے اوقات میں دلچسپی رکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر چھائی سختی اور بے گانگی کا نقاب اس کی موجودگی میں غیر ارادی طور پر سرک جایا کرتا تھا۔

حیرت تو اسے اس وقت ہوتی تھی جب اس نے انہیں۔

”تو کچھ محبوب مجھے تھا مجھے معلوم ہے یہ“ دھیرے دھیرے گنگنا تے سنا۔ ایک ہی مصرع آنکھیں بند کیے بڑے جذب کے عالم میں وہ اپنی ہی ترتیب دی گئی دھن میں گنگنا رہے تھے اور پھر اسے حیرت اس وقت ہوئی جب ایک دن کشورنا ہید کی ”بے نام مسافت“ سے ایک نظم منتخب کر کے اسے سنانے لگے۔

آگ اور برف کے درمیان گھلے لاوے کی صورت یہ آنکھیں

جودل کی کبی ان کبی ہوتے دیکھیں

برس لیں تو اچھا ہی ہو

نمائش کی تحریر سے، زندگی کی روایت نبھاتے بہت عمر گزری

بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندار نے خامشی کے کفن میں لیٹا

بس اب راستوں میں درختوں کی پرچھائیوں کا سندیو سمجھ لو، وہ دیوار گرتی نظر آ رہی ہے

”خاور بھائی! آپ اور شاعری۔“ وہ استعجابیہ بولی تھی۔

”تم تو یوں حیران ہو رہی ہو گویا شاعری مجھ جیسے بندے کے لیے شجر ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔“

وہ بے اختیار مسکرا دیے تھے اور اسی پل اندر داخل ہوتی شہرین گنگ سی رہ گئی۔ اس نے تو کبھی ان

کے بچنے ہوئے پتھر لے عتابی ہونٹوں کے غنچوں کو شگفتگی سے کھلتے نہیں دیکھا تھا۔

”بھابھی! ملاحظہ کر رہی ہیں آپ اپنی نیرنگی فطرت کے کمالات، آج خاور بھائی اپنی پسند کی شاعری سنارہے ہیں۔“ تانیہ نے خوش دلی سے شہرین کو مخاطب کیا تھا۔

”ہاں دکھ رہی ہوں۔“ شہرین کے انداز میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا، نظریں خاور مغل کے چہرے پر جمی تھیں جہاں مسکراہٹ یوں غائب ہوئی تھی جیسے کبھی آئی ہی نہ ہو۔

”بلکہ میں تو منتظر ہوں جب یہ خود بھی شاعری کرنے لگیں گے۔ بدلتی رتوں کا کیا پتا چلتا ہے۔“

شہرین کے لہجے کی تلخ اور ترش جھکاکو تانیہ تو سمجھ نہ سکی اور خاور مغل نے سمجھ کر بھی توجہ نہ دی۔ اس دن صبح سے مسلسل بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اس نے کالج سے چھٹی کا پروگرام بنالیا، ٹھنڈ بھی ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی۔ شام کے اوقات میں یونہی موسم کی خبر لینے وہ ٹیئرس کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دھک سے رہ گئی۔

ایک کونے میں کرسی ڈالے ہلکی نیلی شرٹ اور گرے پتلون میں وہ بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھے بھیگ رہے تھے۔ آسمان پر گہری بدیلیوں کا رقص جاری تھا۔

”خاور بھائی۔۔۔!“ وہ شمال اچھی طرح پلیٹ کر شیڈ کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اسے ان سے اس دیوانے پن کی توقع نہ تھی۔

”ہاں آؤ بھئی تانیہ! میں اس وقت تمہاری ضرورت ہی محسوس کر رہا تھا۔“ وہ اتنے ایزی ہو کر بیٹھے تھے گویا اپنی خواب گاہ کے پُر سکون ماحول میں ہوں۔

”آپ تو سارے بھیگ گئے ہیں خاور بھائی۔“ تانیہ نے فکر مندی سے انہیں دیکھا۔

”ارے یار! مزے میں ہوں۔“ انہوں نے اتنی ہی بے فکری سے ہاتھ ہلایا اور اس سے جیسے تانیہ پر بہت کچھ منکشف ہو گیا۔

”خاور بھائی! ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو ضرور پوچھو، لیکن اس سے پہلے میری ایک بات سن لو۔“ ان کے انداز میں محسوس کی جانے والی بشاشت بھی جو آن کی آن میں ان کے مزاج پر چھا گئی تھی۔

”جی کیسے۔“ اسے خاور مغل بڑے ”نئے“ سے محسوس ہوئے۔

”تمہارا یہ انداز مخاطب بڑا پیارا اور دلکش لگتا ہے۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑے تھے وہ بھی ذرا سا جھینپ کر ان کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

”بس عادت سی پڑ گئی ہے۔“ پھر وہ اپنی بات پر آگئی، سنہیل کر مخاطب ہوئی۔

”خاور بھائی! آپ کو کوئی دکھ ہے؟“

اس کے غیر متوقع سوال پر استغہامی انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

”نمو آئی کہا کرتی ہیں جب انسان کو بہت کاری زخم لگے کوئی بڑا روگ یا دکھ جان کو چٹ جائے تو وہ اسی طرح گرمی سردی اور زمان و مکان کے حساب سے بے خبر ہو جایا کرتا ہے۔“ بڑا گہرا نکتہ نکالا تھا اس نے۔

خاور مغل نے ایک گہری سانس لی۔ بولے اب بھی کچھ نہیں۔
”بتائیں نا خاور بھائی، کیا ایسی ہی کوئی بات ہے۔“ اس نے اب کے بے دھڑک اصرار کیا تھا
ہاں ان کا خاموش انداز کچھ نہ کچھ معانی ضرور رکھتا تھا۔
”تمہارے اس سوال کے جواب میں مجھے بے ساختہ ایک نظم یاد آرہی ہے۔ کہو تو سنا دوں؟“
زورہ بولے۔

”ہاں ضرور، لیکن پہلے یہ وضاحت کر دیجیے کہ اتنی لمبی مصروف زندگی میں شاعری کا شغف کیسے
اُسے بحسب تھا کہ آیا پہلے سے اس میدان کے شہسوار ہے ہیں یا تازہ تازہ شوق ہوا ہے۔

”جب میں امریکہ میں ہوتا تھا وہاں فارغ اوقات میں اردو ادب سے دل بہلاتا تھا۔ اسی زمانے
کچھ یادیں رہ گئی ہیں مگر نہ اس سے پہلے اور اس کے بعد مصروفیات کے جنگل میں ایسا بھٹکا کہ پھر رستہ
بلا بہر حال نظم سنو۔“

پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت تو نہیں ہے، جو تجھے لکھ کر دے دیں

یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو

زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو

یہ کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز
بھی چہرے، بھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے

جیسے آج کل کو سنبھالے کوئی اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے

اب تجھے کیسے بتائیں ہمیں کیا دکھ ہے
ان کے پرسوز دلکش لب و لہجے کے زیر و بم میں وہ خود ڈوبتا محسوس کر رہی تھی۔ نظم بنا کر وہ چپ

پہانے خلا میں ٹکنے لگے تھے جب کہ وہ ہنوز اس کے بحر میں گم تھی۔
”تو آپ ادھر ہیں۔“ اسی لمحے شہرین ادھر آئی تھی۔ اس کے لہجے اور چہرے پر کچھ تھا جس نے

کو نہ چاہتے ہوئے بھی شرمندہ سا کر دیا۔
”اور ادھر آپ کا موبائل کمرے میں بچ کر تھک گیا۔“ وہ خاور سے ہی مخاطب تھی۔ خاور مغل

ایک لفظ کہے بغیر موبائل ہاتھ میں لے لیا۔
تانیہ نے جانے کی غرض سے قدم آگے بڑھائے۔ اسی لمحے انہوں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر

پکارا۔

”ایک منٹ تانیہ! تم یوں کروڈریس چینیج کر کے نیچے آؤ میں بھی چینیج کر کے آتا ہوں۔ باہر چلتے
لانگ ڈرائیو پر، واپسی پر انکس کریم کھائیں گے ٹھیک۔“ وہ کہہ کر پھر فون کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔

”آپ کو کہاں ملی تھی؟“

”ایسے ہی برستے موسم میں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دل کی کلین بن جائے گی۔“

”کلاس فیلو تھی؟“ وہ بڑے سجاوے زخموں سے نکل کر چننے کا کام سرانجام دے رہی تھی۔
”نہیں۔۔۔!“

”کوئی رشتہ دار۔۔۔؟“

”نہیں اس سے اس قسم کا کوئی ربط استوار نہیں تھا۔ بابا مرحوم کے کسی جاننے والے کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ دونوں ابوظہبی میں تھے۔ وہ ہمارے ہاں آئی تھی تعلیم مکمل کرنے کے لیے، پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات کر رہی تھی۔ ہوٹل میں ہی رہتی تھی۔ ہمارے ہاں ویک اینڈ پر آتی تھی۔ اس کے گارجین تھے ہم لوگ یہاں اور اس کا پورے پاکستان میں کوئی نہیں تھا۔“ وہ حرزہ کیفیت میں اس کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔

”کیا آپ نے پہلی نظر میں اسے پسند کر لیا تھا؟“

”نہیں، مجھے تو بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ اس میں کوئی شے ایسی بھی ہے جسے پسند کیا جاسکتا ہے۔ شروع شروع میں تو میں شدید خائف رہا کرتا تھا اس کے وجود سے، یہ تو جدائی نے بتایا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس کے ساتھ رہ کر تو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ میری ضرورت بھی بن سکتی ہے۔ یوں بھی جب تک پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا رہے، فاقے کی کیفیت سے آشنائی کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک اس کی ذات کا چشمہ میسر رہا میں سیراب ہوتا رہا تب تک احساس کی حدت باس بھی نہ بھٹکی، جب سوتے خشک ہو گئے جب خیمہ اکھڑنے لگا تو احساس ہوا وہ تو چشمہ آب حیات تھا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔“

”کیا چیز آپ کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔“

”میری بزدلی۔“ انہوں نے بڑی فراخ دلی سے تسلیم کر لیا تھا۔

”بزدل اور آپ۔۔۔؟“ تانیہ نے ان کے لمبے چوڑے بارعب، دبنگ وجود کو دیکھتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

”ہاں، مصلحتوں کی آڑ لینے والا بزدل ہی ہوا کرتا ہے۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
”کیا وہ بھی آپ کو پسند کرتی تھی اور کیا آپ نے کبھی اس سے اظہار کیا؟“ اس کو یہ تک پہنچنے کی عجلت سوار تھی۔

وہ مجروح سی ہنسی ہنس دیے۔

”ایسا کچھ ہمارے درمیان آیا ہی نہیں، تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ روایتی عشق و محبت کی داستان ہے۔ ارے بھی اگر ایسا ہوا ہوتا تو غم کا بے کا تھا۔ کیوں اتنے برس ایک ہی روگ پالتا رہا اپنے اندر، بھلا نہ دیا ہوتا سب کچھ۔“

”کیا وہ بہت حسین تھی؟“ اسے بڑا اشتیاق ہو رہا تھا اس نادیدہ ہستی کے متعلق جاننے کا جس نے خاور مغل جیسی مضبوط چٹان کو پانی کر دیا تھا۔

”چلیے بھابی! آپ بھی تیار ہو جائیں۔ اکٹھے چلتے ہیں، مزار ہے گا۔“ اس نے سیڑھیاں اترتی شہرین کو مخاطب کر کے پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں بھئی، دعوت تمہیں ملی ہے لاگ ڈرائیو اور آکس کریم کھانے کی، تم ہی جاؤ میرے ساتھ تو ایسا نادر روزگار واقعہ بھی نہیں ہوا۔“

شہرین کے کڑوے کیلے تلخ انداز میں کیا تھا، بدگمانی، تمسخر، طنز، جلاپا، اس کے لہجے کی کاٹ نے تانیہ کو چند ساعت کے لیے گم قسم کر دیا۔ بہر حال بچی تو نہیں تھی جو شہرین کے حاسدانہ تیور نہ سمجھ سکتی۔ اس کا خاور مغل کے ساتھ یوں اتنے حسین موسم میں تنہا گھومنا پھر نا یقینا بیوی ہونے کے ناتے اسے شاق ہی گزرنا چاہیے تھا۔ یہی سوچ کر تانیہ نے ٹال مٹول بھی کرنا چاہی مگر خاور مغل نے ایک نہ سنی، وہ بڑی ترنگ میں نظر آ رہے تھے ڈرائیو کرتے ہوئے۔

تانیہ ان کے مزاج کے بدلتے موسموں کو سمجھنے میں جب قطعی ناکام رہی تو بالآخر ان سے الجھ بیٹھی۔
”خاور بھائی! یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے آپ کے مزاج میں اتنا تنوع کیوں ہے۔ کبھی کبھی کچھ، نموا آئی کہا کرتی ہیں مزاج میں اس قسم کی بے رنگی اور بے ترتیبی اس صورت میں آیا کرتی ہے جب دل میں سکون نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنا سکون تو کہیں لٹا بیٹھے ہیں؟“
جواب میں اس نے ان کے پتھر چہرے پر دکھ کی عجیب سی دراڑیں محسوس کیں، ان کا چہرہ ایک لمحے کو پھیکا سا پڑ گیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ جذبات کی شدتوں کو چھو آئے ہیں عمر کے کسی حصے میں؟“
وہ بغور انہیں دیکھ رہی تھی ”کیونکہ نموا آئی کہتی ہیں شدتوں کے موسم میں بھگنے کے بعد انسان کے مزاج میں یا تو خزاں کی زرد بے رنگی چھا جاتی ہے یا لمبائیوں کی کڑواہٹ مزاج کو وحشت زدہ کر دیتی ہے۔“ وہ اب کے عجیب متاسف و ملول انداز میں مسکرائے پھر گویا ہوئے۔

تمام عمر جیسے اور کچھ نہ کر پائے

کسی کے ہو کے رہے اور نہ اپنا کر پائے

زمانہ اس کے حوالے سے یاد کرتا ہے

کہ جس سے اپنے ستارے نہ مل پائے

”خاور بھائی۔۔۔“ وہ ایک لمحے سناٹے میں رہ گئی تھی تو اس کا واہمہ درست نکلا۔ جسے شہرین ناممکن میں شمار کرتی تھی۔

تانیہ نے گہرے دکھ کے احساس سے لبریز ہو کر ان کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں کی وحشت، ان کے چہرے پر چھائی یا سیت، نقشہ کا می اور لب و لہجے کی تھکن اس بات کی شاہد تھی کہ مزاج کی یہ بے یونہی بے سبب نہیں تھی۔

”وہ کون تھی خاور بھابی؟“ تانیہ کے دل میں خاور مغل کے لیے بہت سی ہمدردی جمع ہو گئی تھی۔
”اک چراغ منزل۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں گاڑی ایک نسبتاً سنان سڑک کے کنارے روک لی اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر کے مناظر دیکھنے لگے۔

”بہی تو سارا رونا ہے بی بی۔“ ان کے انداز پر وہ خاک بھی نہ بھی۔

”کیا اس نے کبھی آپ سے اپنی چاہت کا اظہار کیا۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیے۔ ”آخر ہوتا ٹین ایجر، چکانہ رومانک آئیڈیاز ہی آئیں گے ذہن میں، بھئی حقیقی زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ اچھا میں تمہاری تسلی کے لیے تمہیں اس کی کچھ تصویریں تاہوں۔ میں جب امریکہ میں ہوتا تھا تو اس دوران اس نے بھیجی تھیں۔ یہ مجھے اتنی عزیز ہیں کہ ہر دم نے ساتھ رکھتا ہوں۔“

انہوں نے پچھلی سیٹ پر بڑا اپنا بریف کیس تھا۔ لاک کھول کر اس کے ایک خفیہ خانے سے چند ذرات نکالے اور اس کی گود میں ڈال دیے۔ تانیہ نے احتیاط سے ایک کاغذ کی تہ کھولی۔ موتیوں کی سی لائی میں سفید براق ورق کے عین وسط میں درج تھا۔

عزیزم خاور!

یہ مانتا ہوں بہت رات ہے، اندھیرا ہے
تھکن بھی ایسی کہ جس کی کوئی مثال نہیں
مگر تم حوصلہ اور ہمتیں جواں رکھو
کہاں کہاں تیرا رب ذو الجلال نہیں

فقط ایک خیر اندیش

اس نے استعجاب کے عالم میں دوسرا ورق کھولا یہ کسی اور تاریخ کا تھا مگر اسٹائل وہی تھا۔ عزیزم خاور!

ہزار سانچے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہو سکے تو بھی ہم سے رابطہ رکھنا

فقط ایک خیر اندیش

اس نے تیسرا خط کھولا

عزیزم خاور!

شاخیں رہیں تو پھول بھی پتے بھی آئیں گے
یہ دن اگر تم سے ہیں تو اچھے بھی آئیں گے

فقط ایک خیر اندیش

پھر اس نے آخری خط بھی کھولا

عزیزم خاور!

قیمت نہ لگا جذبہ ایثار طلب کی
ہر شے کو فقط چشم خریدار سے مت دیکھ
میں اور کہیں صاف دکھائی نہیں دوں گا
ہٹ کر مجھے آئینہ کردار سے مت دیکھ

فقط ایک خیر اندیش
”یہ اس کا آخری خط تھا جو جانے سے پہلے وہ میرے بیڈروم میں ٹیبل پر چھوڑ گئی تھی اور پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئی۔“

”وہ کون بھی خاور بھائی! ایسی انوکھی، ایسی ہمدرد، اتنے اعلا ظرف والی۔“ تانیہ نے بغیر اس سے ملے ہی اس کی تحریر کی خوشبو سے اس کے مزاج کا چٹا لگا لیا تھا۔
”میں بھی آج تک درطہ حیرت میں ہوں کہ۔“

ستارہ شام بن کے آیا برنگ موج سحر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا نہیں تو حیران کر گیا وہ

”اس کی ذات کا مجید پوری داستان سن کر ہی پاسکوگی۔ اسی قصہ عجائب کو سننے کے لیے تمہیں ساتھ لایا ہوں کہ تم نے بڑے غیر محسوس انداز میں مجھے پرت در پرت کھٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس تھکن نے تو میرے اعصاب تک کو سن کر کے رکھ دیا ہے، میں اپنی ذات کی قید میں محصور ہو کر رہ گیا ہوں۔ ان سب لوگوں کو مصنوعی خون لگا کر زخم دکھانے کی عادت ہے اور میں نے اپنے وجود کے اندر پڑے اتنے بڑے گھاؤ کو بے اعتنائی اور رکھائی کے پیر میں چھپا رکھا ہے۔ اپنوں کے لگائے گئے زخموں کا مرہم بازار کی دکانوں پر دستیاب نہیں ہوتا۔ تمہیں پتا ہے تانیہ! یہ ٹھاٹھ بانٹھ، یہ عیش و عشرت، یہ تیش ان سے کچھ برس پہلے تک یہ سب لوگ قطعی نا آشنا تھے۔ انہوں نے خواب میں بھی ایسے آرام نہ دیکھے تھے۔ ہم بہت معمولی سی حیثیت کے مالک ہوا کرتے تھے۔ تم یقین کر دو گی ہمارے پورے گھر کا خرچہ میری کل خواہ پانچ ہزار دوسو روپے سے چلا کرتا تھا۔“

وہ انکشافات پر انکشافات کرتے چلے جا رہے تھے۔

”ایسے نہیں خاور بھائی ترتیب سے بتائے سارے واقعات۔“ اس نے بیچ میں ٹوک دیا تھا۔

☆☆☆

”میرے بابا اور اماں جی کا تعلق سرحد کے ایک پسماندہ گاؤں سے تھا، دونوں کے قبیلے بھی مختلف تھے مگر شمع محبت ایک ساتھ دونوں کے دلوں میں جل اٹھی تھی۔ قبیلے کے سرداروں نے اس بندھن کو ناممکن قرار دیا تو دونوں بھاگ کر پنجاب آگئے اور شادی کر لی۔ پڑھائی لکھائی کا رواج تو ان کے قبیلوں میں نہیں تھا سو دوڑ دھوپ کر کے بابا ایک فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ تنگی ترشی سے ہی سہی زندگی کے دن بیت گئے۔ سب سے بڑی بلیقیں آپا کی شادی بابا نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ مجھے پڑھانے کا انہیں بہت شوق تھا۔

سو پیٹ کاٹ کر بھی انہوں نے اپنا اور میرا بھی تعلیم کا یہ شوق پورا کیا۔ مجھ سے چھوٹی نفیس کی بات بھی اپنے جیسے سفید پوش لوگوں میں طے ہو گئی۔ نفیس سے چھوٹا عمر بھی پڑھ رہا تھا۔ عمر اور بلیقیں آپا کی سب سے بڑی اولاد فی مال دونوں ہم عمر ہی تھے۔

میں نے ابھی ایم بی اے مکمل نہیں کیا تھا جب بابا جان کا انتقال ہو گیا۔ میں پہلے بھی شیوشنر کر کے اپنا خرچہ پورا کرتا تھا اب گھر کا بھی چلانے لگا۔ تقدیر کا چکر کہ کچھ عرصے بعد بلیقیں آپا اور ان کے خاندان کا

رچیں چار ہا ہے، چند دن رہے گی پھر ہاشل چلی جائے گی۔ کہیں اتوار کے اتوار آیا کرے گی۔ ہم نے کیا لینا دینا۔ اچھا اب چلو جاؤ اس کی فلاٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔“

”پہلے یہاں کم مصائب تھے جو یہ بھی۔۔۔“ میں بڑبڑاتا ہوا گھر کی واحد سواری سیکنڈ ہینڈ موٹر لی چابیاں تلاش کرنے لگا۔

”اسے بایک پر لینے جاؤ گے؟“ اماں نے حیرت سے مجھے دیکھا تو میں بھٹنا سا گیا۔ اور کیا اعالیہ کے لیے شاہی بھی کا اہتمام کروں۔“

”ارے کیوں ناراض ہو رہے ہو میں تو یہ کہہ رہی ہوں باہر چھا جوں مینہ برس رہا ہے ایسے میں پر کیسے جاؤ گے۔“

”اف اللہ! گویا جیسی کے کرائے میں بجٹ پھر خراب ہوگا۔“ میں نے دل ہی دل میں کبیدہ خاطر رٹھنڈی سانس لیتے ہوئے چابی رکھ دی۔

ایئر پورٹ پر جب میں نے اسے دیکھا تو ایک لمحے کو بالکل بت سا بن گیا، میرے تصور کے برعکس یہ سادہ اور عام سی شکل و صورت والی تھی، اس کے سراپے میں مجموعی طور پر کشش تھی مگر انداز میں ادبوں جیسی کوئی جھلک بھی نہ تھی۔

تین کمروں پر مشتمل اس چھوٹے سے، افراو سے کچا کچھ بھرے فلیٹ میں وہ اہل خانہ کے ہمراہ آرام سے پاؤں پارے بیٹھی باتیں بنا رہی تھی۔ جیسے ازل سے ہی ان ہی کے بیچ رہتی آئی ہو۔

”اے یہ تو نہایت سیدھی اور اللہ لوک قسم کی بچی ہے۔“ تیسرے دن جب وہ سامان سمیٹ کر شفٹ ہو گئی تو اماں جی نے ذاتی رائے دے کر نئے موضوع کا آغاز کیا۔

”صحیح کہتی ہیں اماں اگر نہ ہم نے تو سوچا تھا اتنی بڑھی لکھی ہے امیر ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی اولاد۔“

نخروں کے تو ٹوکرے ہمراہ لائے گی۔“ بلقیس آپا بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

”اتنی سادگی سے آلتی پالتی مار کر ہمارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھا رہی تھیں جیسے ہمیشہ ایسے ہی ماتی رہی ہوں۔“ نفیس کو اس کی یہ ادا بہت بھائی تھی۔

”بہت کم دل والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں خدا دولت سے نوازتا ہے تو بھی وہ اپنا ظرف بلند اور ماکشادہ رکھتے ہیں۔ دیکھ تو اندازے سے ہی کتنے تحائف لے آئی یہ کہہ کر جھولی میں ڈال دیے کہ آئی

براہیاں اور کون ہے، آپ لوگ ہی تو ہیں میرے اپنے، ماشاء اللہ بڑے کھلے دل کی ہے اللہ اس کے سبب اچھے کرے۔ ورنہ ہم نے تو بڑے بڑوں کو دولت کے زعم میں انسان کو حیوان سے بھی کم تر سمجھ کر جھکارتے دیکھا ہے۔“

”نیماجی کہہ رہی تھیں ویک اینڈ پر آئیں گی تو ہمارے ساتھ گڑیا گڑیا کھیلیں گی۔“ راضیہ اور ماٹما اپنی جگہ محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔

سارا گھر ہی اس کے اخلاق کا، اس کے مزاج کی سادگی ویدکاری کا اور اس کی فیاضی طبع کا گرویدہ ہو چکا تھا مگر مجھے نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی تپ چڑھ جاتی تھی۔ آجانی ہیں محترمہ اپنی امارت کا جادو نہاٹنے۔

ایک سیڈنٹ ہو گیا۔ ان کے شوہر تو موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بلقیس آپا ایک ٹانگ سے معذور ہو گئیں۔ اس وقت ان کی سب سے بڑی اولاد فریال میٹرک میں تھی اور سب سے چھوٹا بیٹا دانش ابھی فقط تین سال کا تھا۔ فریال سے چھوٹا اظہر آنکھوں میں تھا پھر راضیہ اور ضائمہ اور ان سے چھوٹی تانیہ پورے کنبے کا بوجھ مجھ پر آن پڑا، ایم بی اے کر کے کچھ خواری کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری تو مل گئی مگر گھر کا خرچ چلانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا تھا۔ فلیٹ کرائے کا تھا پھر بجلی، پانی، سوئی گیس کا بل، عمر کی پڑھائی کا خرچہ، آپا کے سارے بچوں کی پڑھائی اور کھانے پینے کا انتظام، نفیس کی شادی کے لیے جہیز کا مسئلہ آپا کی بیماری کا خرچہ، ہر طرف سے مسائل کے انبار نے مجھے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا پڑھا دیا۔ مزاج میں خود بخود دھردل اپن اور کم گوئی رچ بس گئی۔ ان ہی دنوں نیا صدیقی کی آمد کا غلغلہ اٹھا جس نے مجھے مزید تپا دیا۔

پتا چلا موصوفہ بابا جان مرحوم کی ٹیکسری کے مالک کی بیٹی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے صدیقی صاحب کاروبار سمیٹ کر فیملی سمیت ابوظہبی چلے گئے تھے وہیں طویل عرصے تک رہائش رہی، کبھی پاکستان آنا ہوا تو بابا جان سے ضرور ملتے۔ بابا جان ان کے بڑے وفادار اور جیاں نثار قسم کے ملازم تھے۔ ان کی بیٹی کو لاہور سے ایم اے کرنا تھا۔ یہاں رہائش ہو مل میں قرار پائی تھی چونکہ ان کا پاکستان میں اور کوئی خاص

جان پہچان اور بھروسے والا بندہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے خط لکھ کر ہمیں نامزد کیا تھا۔

میں نے خبر سن کر جی بھر کے غصے ہوا تھا۔ البتہ ماں اور آپا کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔

”کہاں ہمارا یہ تین کمروں کا تنگ و تاریک فلیٹ، کہاں ان کی نازوں پٹی بیٹی۔ کہاں رکھیں گے اسے۔ اماں خواجواہ کی مصیبت کیوں مول لیں، آپ کو نہیں خبر یہ امیر کبیر شہزادیاں تو ایسی جگہوں پر جس کا

شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آپ لکھ دیجیے معذرت انہیں۔“

”لو بھلا ایسے ہی لکھ دوں۔“ اماں بگڑیں۔

”مہمان تو خدا کی رحمت ہوا کرتے ہیں، بڑے احسانات ہیں سیٹھ صاحب کے تمہارے بابا پر، بڑا بھروسہ کرتے تھے وہ، کبھی اپنے رتبے کا احساس نہیں دلا یا ہمیشہ نرمی اور محبت سے پیش آئے۔“

”ہم ان کے احساناب کا بدلہ چکانے کے اہل نہیں ہیں، آپ مطلع کر دیجیے انہیں۔“ میں چڑسا گیا تھا۔

مگر ادھر کس کو پروا تھی۔ سارے گھر میں خوش گواری پھیل ہوئی تھی۔ آپا، فریال اور نفیس کے سر تھیں جن کے ذمے پورے گھر کی صفائی اور از سر نو آرائش تھی۔ سامان ادھر سے ادھر کرنے میں عمر اور اظہر لوگ پیش پیش تھے۔ اس کی آمد کے دن اماں جی نے خصوصی طور پر اپنے ہاتھ سے مزے مزے کی ڈشز بنائیں۔

”اللہ کا واسطہ ہے اماں! یہ ڈھکوسلے رہنے دیں۔ ہم جب اس سے اپنی حیثیت نہیں چھپا سکتے تو خواجواہ مصنوعی تکلف کی فضا قائم کر کے مقابلہ کرنے سے کیا حاصل۔“

اماں میرے کڑوے کسے لہجے پر شدت سے برا مان گئیں۔

”نزل کے مجھے تو تیری کوئی کل سیدھی ہی نہیں لگتی، ناوہ کون سا تیرے کندھے پر سوار ہونے کو آ رہی

جب دیکھو کبھی راضیہ اور صائمہ کے فراک آرہے ہیں، عمر اور اطہر کے لیے بیٹ بال یا شرٹس لائی جا رہی ہیں۔ فریال کے لیے بوتیک سے کوئی سوٹ پسند کر کے لایا جا رہا ہے اماں اور بلقیس باجی اور بیس کے لیے کوئی ضرورت کی چیز خریدی جا رہی ہے۔ دینے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ اگلے کو ضروری تحفہ لینے ہی بن پڑتی۔

”آئی اکل میں گئی تھی نادھر تو یہ شرٹ کا پیس پسند آ گیا۔ خیال آیا ماشاء اللہ عمر کا رنگ بہت کھتا ہوا ہے اس پر بہت سوٹ کرے گا بہت سارے لوگ لے رہے تھے ٹھیک ٹھاک سسٹل گیا میں نے کہا چلو کیا حرج ہے بھلا اتنا اچھا کپڑا دوبارہ جانے کب ملے میں نے لے لیا کہ آپ کو دکھا دوں گی۔“

بلقیس آیا، اماں جی رسماً کہتیں۔

”ارے نہیں چندا تم کیوں تکلیف کرتی ہو یہ بہت زیادہ ہے۔“

”تکلف کہاں آئی! سمجھئے یہ تو یونی ٹرائل کے طور پر لائی ہوں، آپ میرے ساتھ چلیے گا کسی دن، بے شک اپنی پسند سے اور لے لیجیے گا۔ اسے تو رکھے نا اور ہاں آج پکا کیا ہے، بھی نہیں ذرا اپنے انٹیس و ملائم ہاتھوں سے کھانا تو لگا دو، قسم سے بڑی بھوک لگ رہی ہے اور یہ چھوٹی مخلوق کدھر ہے میں دیکھتی ہوں ان کو۔“ جب بھی آتی گھبرا دھر اُدھر آزادانہ گھومتی پھرتی مزے سے انجوائے کرتی۔ ایک لمحے کو بھی کبھی کسی کو احساس نہیں دلاتی تھی کہ وہ خصوصی مہمان نوازی کی سخت ہے۔

بھی لاڈ سے اماں کی گود میں سر رکھ دیتی۔

”آئی اڈر اپنے اصلی والے مسروں کے تیل سے ماش تو کر دیجیے۔“

ان دنوں میں بہت پریشان سا تھا۔ عمر کو فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن دلانا تھا۔ داخلہ فیس اور کتابوں کا بیوں، یونی فارم وغیرہ کے لیے کم از کم ڈیڑھ دو ہزار کی رقم درکار تھی۔ تنخواہ ملنے میں ابھی ایک آدھ ہفتہ باقی تھا اور اتفاق سے اس کے داخلے کی آخری تاریخ قریب تھی۔ تنخواہ سے تو یک مشت اتنی بڑی رقم کی بچت ناممکن ہی تھی۔

چھوٹے دانش کی طبیعت خراب تھی، اس کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت تھی۔ اسی پریشانی میں داخلے کی تاریخ ذہن سے نکل گئی، تنخواہ ملنے پر سب سے پہلے عمر کو ڈھونڈا۔

”عمر! وہ تمہارے داخلے کا کیا بنا، یار لیٹ ہی ہو گئے تم اب۔۔۔“

”ارے نہیں بھائی! داخلہ تو ہو گیا۔“ میں عمر کے رنجیدہ طول چہرے کی جگہ ہشاش بشاش انداز دیکھ کر ششدر ہی تو رہ گیا۔

”مگر کیسے؟ پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“ میں چونکا تھا۔

”کہیں اماں اور آپا لوگ بات کر رہے تھے، نیا باجی نے سن لیا۔ پھر میرے پاس آکر خفا ہوئیں کہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اپنے داخلے کا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں وہ مجھے لے گئیں اور انہوں نے ہی داخلے وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا۔“

میرے اندر کا غیرت مند مغل بچہ ایک لمحے کو جولا کبھی کا روپ دھار گیا۔

”تم نے کیوں لیا ان کا احسان، تمہارا بھائی مر گیا تھا جو یوں ایرے غیرے کے آگے دکھارو؟“

نے شعلہ برساتی نگاہوں سے اسے گھورا۔ جواب میں وہ مسکسی صورت بنا کر منظر سے ہٹ گیا۔

”کیا ہے؟“ اس نے حیران نظریں میری سمت دوڑائیں۔

”یہ آپ کا احسان ہے محترمہ جو آپ نے عمر پر کیا تھا۔“ میں نے ترشی سے جواب دیا۔

”یک لمحے کو اس کے چہرے پر ناگواری کے عکس لہرائے پھر بڑی صفائی سے اپنے تاثرات چھپاتے س نے قدموں میں بڑی نرم اٹھائی اور ٹیبل پر میرے نزدیک کھسکا کر بولی۔

”یہ احسان نہیں قرض تھا۔ جس کی وصولی عمر سے قرار پائی ہے وہی یہ رقم واپس کرنے کا پابند ہے۔ کے ساتھ تو میرا ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔“ وہ کہہ کر کچن میں گھس گئی تھی غالباً۔

پھر فریال کے رزلٹ پر اس نے ایک ہزار نقد اور ساتھ میں نصاب کی کتابوں کا سیٹ اپنی طرف ٹپ بنا کر اس طرح دیا کہ اسے واپس کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ احسان بھی اس انداز میں کیا تھی جیسے اس کا فرض اور ہمارا حق سمجھ کر کر رہی ہو۔ لینے والے کی انا کا ہرٹ ہونا تو درکنار لانا اسے اس دلاتی تھی کہ تم یہ چیز لے کر مجھ پر بڑا احسان کر رہے ہو۔ میں اس کی ان حرکتوں پر دل ہی دل

ہٹتا ہوتا تھا۔

”ہمیں نہیں چاہیں آپ کی عنایتیں، نوازشیں، براہ کرم انہیں اپنے پاس ہی رکھیں۔“ میں تنقنا تا ہوا

کے سر پر کھڑا کہہ رہا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے جتنے جلال سے باز پرس کا آغاز کیا تھا اس نے اتنے ہی سکون سے

نت کیا تھا۔

میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ آپا کے بیٹے کی طبیعت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا آج شام

نکال کر اسے لے چلوں گا۔ بڑی مشکل سے ایک ماہر ڈاکٹر سے ٹائم بھی لے لیا تھا۔ آنے پر پتا چلا

ماہر بلقیس آپا کو نیا اپنی گاڑی پر لے گئی تھی۔

واپسی میں وہ دو انیوں اور پھل فروٹ سے لدی پھدی گھر لوٹی تو میں کھولتے دل و دماغ کے

نواس پر الٹ پڑا۔

”اے باؤ لے ہوئے ہو خاور۔“ اماں بیچ میں پڑ گئیں۔ ”ایک تو بچی نے نیکی کی اور سے اسے یہ

لے دیا جا رہا ہے، بچہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ خدا نا خواستہ وقت پر ڈاکٹر کو نہ دکھایا بنا تو لینے کے دینے

باتے۔ وہ تو بچی اتنا فائدہ آٹھ آنکلی در نہ کیا کرتے کیسے لے کر جاتے۔“

”ایسی کیا بات ہے آئی! آپ لوگ جو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ دیکھیے نا گھر والوں سے اتنی دور

ہاں ہوں پھر بھی محسوس یہی ہوتا ہے اپنے ہی گھر میں اپنوں کے بیچ ہوں۔ اب بھلا اپنوں میں تکلف

لڑی چلتا ہے۔ آپ سب مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں میں جواب میں تھوڑا سا کام آجاؤں تو آپ کا حق

بنتا ہے اور میرا اولین فرض، آپ تو ایسی باتیں کر کے الٹا مجھے شرمندہ کر ڈالتے ہیں۔“ نہایت معصوبہ سے اماں جی سے لپٹ کر وہ اپنی چاہت کا اظہار کر رہی تھی۔

میں حسب سابق بل کھا کر رہ گیا۔ کہہ کچھ بھی نہ سکا کہ آگے رہ ہی کیا گیا تھا کہنے کو، وہ بوہمی محسوس انداز میں گھر کا خیال رکھتی تھی۔ بھی مجھے خبر ہی نہ ہوتی کس طرح گھر میں چینی، مٹی یا آٹا آج کسی بچے کی اسکول کی فیس دے دی جاتی، مختلف تہواروں کی مناسبت سے تحفے کے بہانے بچوں کی اوڑھنے کی ضروریات پوری ہو جاتیں اور اس قدر پلاننگ کے ساتھ وہ اس مدد کو اپنے فرائض میں شامل کر کے شرمندہ شرمندہ ہی ہو کر پیش کرتی گویا اگلے کے حق میں کچھ کم ہی دیا ہو۔

مجھے اس کے انداز سر اسر چھوڑے اور نامناسب سے لگتے تھے شاید اس لیے کہ یہ میری غیرت خوداری پر تازیانہ بن کر لگتے تھے۔ میں دانستہ طور پر اس کی موجودگی میں سب میں بیٹھنے میں کتراتا ہم دونوں میں محسوس کیا جانے والا کھنچاؤ موجود تھا جو اماں جی کی ہزار تنبیہ کے باوجود دور نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس سے کم سے کم مخاطب ہونے یا مخاطب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

☆☆☆

”خاور! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم دونوں کے بیچ جائیداد وغیرہ کا کوئی تنازعہ ہو۔“ نفیس کے سسرالی رشتہ دار آئے ہوئے تھے اسی سلسلے میں اماں نے اسے بھی بلوا بھیجا تھا، میں بڑے سے مرد حضرات کے لیے چائے کے لوازمات لینے کو اندر آیا تو وہ برتنوں کو ترتیب سے رکھتے ہو۔ نہایت سنجیدگی سے دریافت کرنے لگی۔ انداز میں حد درجہ سادگی تھی۔

میں نے اپنے اندر ابل پڑنے والے غیض پر بمشکل قابو پایا تھا۔ ”یہ آپ کا کوئی مربع میں نے اپنے نام کر لیا ہو۔“ ادھر ہنوز معصومانہ استفسار تھا۔ ”خواجوا میرے منہ مت لگو۔“ میں جھلا کر رڑے اٹھانے لگا۔ ”نہیں پھر بھی خاور! سوچنے کی بات ہے، ہے نا۔“ وہ اپنی بات پر بضد تھی۔

”اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خونخوار حریفانہ انداز میں پیش کیا آتے؟ ضرور ہم دونوں میں ماضی میں کوئی اعلا درجے کی دشمنی رہی ہے۔“ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ تب ہی اتنے وثوق سے کہہ رہی تھی۔ ”فضول بات نہیں کرو اور پلیز ذرا جلدی بنناؤ اپنا کام، اتنی ست رفتاری سے تو چیونٹی بھی نہی کرتی ہوگی۔“ میں خواجوا چڑسا گیا تھا۔

”اچھا تو پھر جاؤ چیونٹی سے کرا لو۔“ نہایت اطمینان سے اس نے اتنی بے ساختگی کے عالم میں جواب دیا تھا کہ اندر آئی نفیس کسی صورت اپنی ہی ضبط نہ کر سکی تھی۔ میں کھسیا کر بچنے سے باہر آ گیا۔ اس دن کے بعد سے یہ ہوا کہ ہماری آپس کی چپقلش اور کشیدگی میں قدرے کمی واقع ہو گئی۔ بالواسطہ کے بجائے دوبدو براہ راست محاذ آرائی ہونے لگی۔ شاید پہلی کارروائی چپ کا حصار توڑ ہی ہوا کرتی ہے۔ پہلے اپنے طنز و مسخر اور خفگی کا اظہار اماں، آپا یا دوسرے بچوں کے توسط سے اس تک پہنچاتا تھا اب یہ کام بغیر کسی واسطے کے انجام پا جاتا تھا۔

وں میں باہر جانے کے چکروں میں تھا ایک دوست سے بات کرنا تھی۔ اماں کو کہہ گیا تھا ۷ لوٹوں گا۔ رات گئے گھر آیا تو خلاف توقع نیا کور دوازے پر موجود دیکھ کر ٹھنک گیا۔ پھر چپ گیا۔ چیخ کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ یہیں ایک کونے پر میرا پلنگ بچھا تھا۔ ایک اور کپڑوں کی لماری بھی سائیٹ پر سیٹ تھی۔ ڈرائنگ روم والا کرا باقیوں کے مقابلے میں ما۔ رات کو یہ میرے استعمال میں ہی ہوتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اماں، آپا، نفیس اور بانی اس سوتی تھیں، جب کہ تیسرے چھوٹے سے اسٹور روم میں عمر اور اطہر کے پلنگ بچھے

ج کر کے آیا تو وہ سینئر ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس رکھ رہی تھی۔ کیا پکا ہے آج؟“ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اس وقت۔ ٹنڈے آلو۔“ سن کر ہی میرے چہرے پر کوفت زدہ اثرات نمودار ہو گئے۔ بڑی مجھے زہرتی تھی۔

تمہیں شاید پسند نہیں۔“ وہ مسکرا دی میرے تاثرات سے سمجھ گئی تھی۔ ساری بھوک ہی اڑادی اس کے نام نے۔“ میں نے برا سامنہ بنایا۔ اچھا ٹھہرو، تمہارے لیے کچھ اور سوچی ہوں۔“

بدرہ منٹ بعد وہ رڑے لگا کر لائی تو گرم گرم روٹی کے ہمراہ فنگر چپس، ٹماٹو کچپ، ایک کٹوری میں پیاز کا راستہ اور پودینے کی چٹنی دیکھ کر میری روح تک خوش ہو گئی۔ بے تکلفی سے ڈٹ کر کھانے

کھانے کے بعد وہ چائے کے دو کپ لے آئی اور وہیں بوسیدہ سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ چند لمحوں ہمارے درمیان سناٹا بولتا رہا۔ ”خاور تم ان دنوں بڑے اچھے اچھے سے لگ رہے ہو۔ کن چکروں میں ہو۔“ ”چکر کیا ہونے ہیں، غم روزگار کے دھکے ہیں اور کیا۔۔۔“ مجھ پر ٹھکن اور اعصابی دباؤ کے ساتھ بے زاری بھی حملہ آور ہو چکی تھی۔

”ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں جتنے بھی کمائیں جہاں سے بھی کمائیں کم ہے، پھر ماشاء اللہ افراد زیادہ ہوں وہاں ضرورتیں بھی خود بخود چار چھوڑ کر پاؤں پھیلانے لگتی ہیں۔ بہت سا بے گزاران دنوں۔“

مجھے خاصا تعجب ہوا۔ بھلا نازوں ملی لاکھوں میں کھیتی امیر زادی کو ان جھیلوں کی کیا خبر، وہ یوں ناکر ہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس کے ہاں بھی ہوتا رہا ہو۔

”اب دیکھو نا، تمہیں کتنی محنت کرنا پڑتی ہے سارا سارا دن باہر کھپتے ہو، ٹیوشنز بھی کرتے ہو پھر بھی میں پڑتا۔ آخر تم بھی انسان ہو، کوئی دشمن تو نہیں ہو۔ کہاں سے بندہ پورا کرے ذمہ داریاں بھی تو ہیں۔ میں تو کہتی ہوں، بڑی ہمت ہے تمہاری، بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہو جو اتنی تندہی اتنی جاں فشانی سے اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنا آرام و سکون بچ کیے

ہوئے ہو۔“

میں اس کی ہمدردانہ باتوں پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اتنی فراخ دلی سے تو کسی نے میرے ایثار، میری قربانی اور میری فرض شناسی کا اقرار نہیں کیا تھا۔ اس کا انداز اتنا اپنائیت آمیز تھا اور اس طرح ہماری سطح پر آکر اسی حساب سے بات کر رہی تھی کہ میں بھی اپنی غیر فطری انا، غیرت اور نام پر وہ پوشی کو پس پشت ڈال کر اس کے ساتھ اپنے خیالات شیئر کرنے لگا۔

”اس قدر مہنگائی کے دور میں اتنے سارے افراد کے ہمراہ چند ہزار سے کیا بنتا ہے۔ میں ہوں آگے کیا بنے گا۔ ابھی عمر بہت چھوٹا ہے، فرسٹ ایئر میں ہی تو ہے، ادھر نفیس کے سرال دار جلدی جلدی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ بلقیس آپا کی فریال بھی کل کو نفیس کے برابر آرہے گی۔ دوسرے بچوں کی تعلیم اور خوراک کے مسائل، بلقیس آپا کی دوا کا انتظام، گھر کے خرچے، بلوں کی ادائیگی یہ سب کچھ پورا ہوگا۔ خرچ ہیں کہ دن بدن کسی دیوہیکل جن کی طرح بڑھتے ہی چلے آ رہے ہیں سوچوں تو اگر آج نفیس کے سرال والے جلدی مچا دیں تو اس وقت میرے پاس اس کو جینز کے ہاتھ دینے کے لیے شاید ایک جوڑے کے پیسے بھی نہ ہوں۔“

حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نہایت کبیدہ خاطر اور دل گرفتہ ساتالین پر صوفے سے ہٹ نکائے بیٹھا تھا۔ سوچیں آکٹوپس کی طرح ذہن کو جکڑے ہوئے تھیں۔

”ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو، ضرور ایسا ہی ہوگا تنخواہ کی رقم سے بچت کا سوال تو چیل کے گھونسلے مانس ڈھونڈنے والی بات کے مترادف ہوگا۔“

اس نے بڑے سجاوے سے میری بات کی تائید کی تھی۔۔۔ پھر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ ”خاور۔۔۔“ کافی دیر بعد اس نے پکارا اس کے لہجے اور نظروں میں کوئی خیال خیر تھا۔ میں سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نیم دلی سے محض اس کی سمت دیکھنے پر اکتفا کیا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی طرح ماہر چلے جاؤ جیسے لندن، امریکہ وغیرہ۔“ میں کافی دیر تک اس کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر سکرایا۔

”تمہارے ذہن میں آنے والا یہ آئیڈیا کچھ عرصہ پہلے ہی میرے دماغ میں آچکا ہے، میں اسی سوچ میں ہوں بلکہ ان دنوں ان ہی کوششوں میں لگا ہوا ہوں، اگر دو چار سال بھی باہر لگا آؤں تو بے چھوٹے بڑے مسائل ٹپٹ جائیں گے۔“

”آئی سے بات ہوئی اس سلسلے میں؟“ ”نہیں، براہ راست تو نہیں البتہ ایک بار یونہی دے دے انداز میں تذکرہ کیا تھا مگر اماں خائف ہیں۔ وہ باہر بھجوانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔“ ”ظاہر سی بات ہے ماں کا دل ہے نا اولاد کو اتنی دور آنکھوں سے پرے کرنے کا حوصلہ کیسے کر گی۔“

اس کے لہجے میں اماں کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا۔

”اماں کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ واویلا مچا دیں گی اور میں انہیں دکھی کر کے باہر جانے کا سوچ

سلسلے میں تم فکر نہیں کرو، میں آئی کو سمجھا دوں گی کہ اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے والدین کو

ی پڑتی ہے۔“

اقبال کر سکو گی انہیں؟“ میں بے یقین سا تھا۔

”تم دیکھتے جاؤ۔“ اس نے چٹکی بجاتی۔

پھر واقعی اس نے اپنی سلسل کو ششوں سے بالآخر اماں کو رام کر ہی لیا ورنہ شاید وہ کبھی بھی مجھے رانہ ہونے دیتیں۔ بابا جان کی ناگہانی وفات اور بلقیس آپا کے شوہر کے حادثے نے انہیں بنادیا تھا۔ میرے لیے وہ بہت حساس ہو گئی تھیں۔ کسی دن اتفاقاً دیر سویر ہو جاتی تو ان کا بلڈ

نے لگتا تھا۔

مانے جانے کہاں کہاں سے تاویلیں گھڑی تھیں۔ دلائل پیش کئے تھے۔ سنہری خوابوں کی

مانی تھی کہ اماں خود ہی مجھے باہر کے لیے اپلائی کرنے کی ترغیب دینے لگیں۔ وہ اس کی مانگی بھی تو

یا شاید اس میں کچھ ایسی بات تھی کہ دوسرے سے انکار ہو ہی نہیں پاتا تھا۔

سپورٹ اور ویزے کا کام تو کسی نے کسی طرح اپنی فرم سے کچھ ایڈوانس نکلا کر کہہ سن کر ہو گیا مگر

بروانے کے لیے وہاں جا کر رہائش اور کھانے پینے کے انتظام کے لیے کم از کم پچاس ساٹھ ہزار

رقم درکار تھی، میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں اسی فکر میں، ویزے کی مدت بھی خاصی مختصر

ر مقررہ مدت گزر جاتی تو پھر ساری محنت اکارت چلی جاتی۔ اماں نے نفیس کے لیے رکھا ہوا زیور

کرنے کے لیے دینا چاہا مگر میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔

”اور بن جائیں گے خاور بھائی۔“ نفیس نے بھی اصرار کیا مگر میری ہمت نہیں پڑی۔ حالات کا

ہوتا ہے کیا خبر وہاں جا کر کیسے حالات ہوں۔ خود اپنی جان کے لالے پڑ جائیں تو ایسے میں کیا یہ

احساس بھی ہمراہ لیے پھروں گا کہ بہن کے حق میں ڈاکہ ڈالا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جاؤں تو

جاؤں۔ میرے مزاج کے سرد سپاٹ موسموں کے باعث میرا حلقہ احباب نہ ہونے کے برابر تھا۔

ایسا جان پہچان کا بندہ نہیں تھا جس سے قرض لیتا۔

”خاور۔۔۔! نام نہت ہو گیا ہے، یہ نیا کوڈرا چھوڑ آؤ ہاٹل تک کہیں بند ہی نہ ہو جائے۔“

اماں کو موسمی بخار نے آگھیرا تھا۔ سو وہ بھی اطلاع ملنے پر یونیورسٹی سے کلاسز لے کر شام کو ادھر ہی

کے پاس نہیں ہے، وہ تو دوڑ ہی رہا ہے جس کے پاس ہے وہ ”بل من مزید“ کا ورد کرتا ہوا ”محمّد“ بھی آگے دوڑ رہا ہے۔ آفس میں کچھ لوگوں سے سلام دعا ہے، کچھ بابا کے جاننے والے ہیں بل ملا کر بیس بائیس ہزار ہاتھ لگ جاتے مگر اس سے بھی کیا بنے گا۔ یہ تو نصف بھی نہیں ہے مطلوب رقم کے۔ میرے اعصاب پر بہت زیادہ بوجھ پڑا ہوا تھا۔

”ہوں۔۔۔ یہ تو ہے۔“ وہ سوچ میں گم تھی۔
 ”حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تو لگتا ہے شاید جانے کا پروگرام چوٹ ہی ہو جائے۔“
 ”ارے نہیں بھئی۔“ میرے شکستہ مضحل لہجے پر وہ دھک سے رہ گئی۔
 ”اتنی تنگ دود سے تو امریکہ کا ویزا لگا ہے ورنہ تو لوگوں کی عمریں گزر جاتی ہیں ایبھی کے چکر کر، خوش قسمتی سے تمہاری جوتی جلدی تمہارا کام ہو گیا ہمت کیوں ہار رہے ہو خادریہ۔“
 ”تو پھر کیا کروں۔“ میں نے نیند کے لیے ترستی ہوئی آنکھوں کو مسلتے ہوئے نئی سے دریافت کیا۔
 ”ہمت و حوصلہ خادریہ! کوئی تدبیر سوچو ایسے تو نہیں کرتے نا۔“ وہ میری ٹوٹی بھری پڑمردہ حارہ سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے دائیں شانے پر رکھ دیا اور سلی کے سے انداز میں دبا کر میرا حوصلہ بڑھانے لگی۔ انداز بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماں کسی بگڑے روٹھے بچے کو پیار سے سمجھا کر منارہی ہو۔

”حوصلے اور ہمت کی باتیں وہاں کی جاتی ہیں جہاں امید کی کوئی کرن جھلملا رہی ہوتی ہے۔ یہ جھنجلاہٹ اور دل گرفتگی کے احساس سے بچو رہا۔“ جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہو وہاں حوصلے کی لٹکی کام آئے گی۔“

”مشکلات، مصائب اور پریشانیاں بھی تو انسانوں پر ہی پڑتی ہیں یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں، زندگی حصہ ہوا کرتی ہیں۔ ان سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے، اگر انے ایک راستہ کھول دیا ہے تو دوسرا بھی ضرور کھولے گا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے نا کہ ہم دستک دینا چھوڑ دیں۔ دوسرے معنوں میں اس کی ذات سے مایوس ہو جائیں۔“

وہ سلی کے سے انداز میں دھیرے دھیرے میرا کندھا چھلتی رسانیت سے بول رہی تھی۔ الفاظ دل پر مرمز رکھ رہے تھے یا نہیں اس سے قطع نظر اس کے ہاتھ کا لطیف اپنائیت آمیز لمس البتہ دکتے، سگے اعصاب پر چھیننے ڈالنے کا کام ضرور سرانجام دے رہا تھا۔

”ابھی تو تمہیں بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ ابھی سے تھکنے لگے ہو؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے تم پر جتنی ذمہ داریاں ہیں اس لحاظ سے تمہیں خود کو بہت مضبوط اور بہادر بنانا ہوگا۔ تم اتنی کم عمری سے اپنی ذات کی ضروریات کو پس پشت ڈال کر اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لیے پھر اپنی قیمتم بھانجیوں اور بھانجیوں کی پرورش کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے ہو یقیناً جانو خادریہ! یہ تمہاری ذات کا بڑا دلکش پہلو ہے۔ قربانیاں دینے کا عمل انسان کی شخصیت میں بڑا نکھار بڑا وقار لے آتا ہے۔ تمہارا دل جو اتنا خوب صورت ہے اس کا کوئی نعم البدل ہی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم اپنے فرائض سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہو جاؤ گے پھر تمہارے پاس بہت سارا وقت ہوگا صرف تمہارے لیے۔“

کی لوریاں دیتی ہوئی دھیمی خوب صورت نرم آواز میرے اندر سکون کے چشمے جاری کر رہی تھی۔ اس پینڈہ ملکی کرتے کرتے بالآخر قدرے ویران سی شاہراہ پر درخت کے قریب روک دی۔ میں بہت تھکنے لگا ہوں نیا یوں لگتا ہے صدیوں تک یونہی تنہا آبلے پانی کرتا رہوں گا اور منزل پھر ملے گی۔“ اتنے دنوں کی ذہنی توڑ پھوڑ اور سوچوں کے خلفشار نے میری قوت حیات گویا ختم ہی کیا۔ بڑے دل شکستہ سے انداز میں سر جھکا دیا۔

نہیں خادریہ! تمہیں ہرگز بھی نہیں تھکانا نہیں چاہیے اور تم اکیلے بھی کب ہو، اگر دیکھو سمجھو تو کتنے آشنا مارے ارد گرد نظر آئیں گے۔ اکیلا تو وہ شخص ہوتا ہے جس کو بھری دنیا میں کوئی سننے سمجھنے والا نہیں کی سلاستی کے لیے کوئی ہاتھ خدا کے حضور نہیں اٹھاتا۔ جس کی پکار پر کوئی لپک کر نہیں آتا۔ تم تو قسمت ہو۔ دیکھو تو تمہارے ارد گرد کتنے لوگ ہیں۔ تم سے محبت کرنے والے، تمہارے لیے فکر کرنے والے، دعاؤں کی سوغات دینے والے، تمہارے دکھ درد کی دوا کرنے والے، ہم سب ہیں نا۔ ساتھ خادریہ! تم اکیلے نہیں ہو، خود کو بھی تنہا مت سمجھنا۔ ہم جو ہیں تمہارے اپنے۔“
 وہ دھیرے دھیرے مجھے جوڑتی بناتی رہی۔ میرے حوصلوں کی عمارت بلند کرتی رہی، تاریکیوں وں میں چاندنی کی جھلک دکھلائی رہی۔
 ششدر تو میں اس دن رہ گیا جب اس نے میں ہزار کی خیر رقم میری جھولی میں ڈال دی۔

”کیا۔۔۔؟“ میں ہلکا سا دھچکا رہ گیا تھا۔
 ”تمہیں پتا تو ہے، یو اے ای کی سائینڈ پر سونا بہت سستا ہوتا ہے بلکہ والدین بچے کی کسی خوشی پر کے طور پر سونے کی چھوٹی موٹی چیز دے دیتے ہیں، عزیز رشتہ دار بھی بڑی فراخ دلی سے گفت کے ہونے کی بلکی پھلکی چیز تحفہ دینے میں گریز نہیں کرتے۔ میرے پاس بھی بہت سے ایسے تحائف ہیں۔ ظاہر ہے سب کے سب تو نہیں پہنچ جاتے نا میں نے اپنی ہر تھوڑے کی گولڈ کی چین، بی اے زلٹ پر مایا کی طرف سے دی گئی انگوٹھی اور بریسلٹ اور ایک کسی عزیز کا دیا ہوا لاکٹ بچ دیا۔ بھئی تو فائدہ ہو جب پہننے نہیں تو بے کار میں پاس جمع رکھنے سے کیا حاصل، اتنے بہت سے جو پڑے ہیں۔“ وہ اس قدر عام سے سرسری سے انداز میں صفائی دے رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ میں سمجھ گیا تھا وہ حسب سابق مقابل کو شرمندگی سے بچانے کے لیے اپنے لہجے اور انداز کی ازلی دوائی کو بروئے کار لا رہی تھی۔

کچھ لوگ لے کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے اور کچھ سر پھرے دیتے ہوئے بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے طرف کی بات ہوتی ہے۔ میں نے کشمکش کے عالم میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

”پلیز خادریہ۔۔۔!“ وہ بغد منت بولی۔ ”کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جس پر مجھے اپنے کیے پر ندامت ہونے لگے۔ یقیناً کرو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ تو محض خراج ہے تمہارے اس جذبے پر جس کے تحت تم اپنی ذات کے تقاضے فراموش کر کے اتنے سارے لوگوں کی خوشیوں اور خوش حال زندگیوں کے

لیے جدوجہد کر رہے ہو۔ اگر تمہارے مستقبل کے ساتھ اتنے سارے لوگوں کا مستقبل مشروط نہ ہو شاید میں تمہارا ساتھ نہ دیتی کہ اس صورت میں تمہارا یہ اقدام تمہاری ذاتی آسائش کے لیے ہوتا تھا۔ پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں تمہیں اپنے بہن بھائیوں کا مستقبل سنوارنا ہے۔ معذور بیوہ بہن کے بچوں پرورش کرنا ہے۔ قربانی اور ایثار کے اس سمندر میں میرا حصہ تو اک قطرے کی مانند ہے۔ اصل مرہ نہیں ہی ملے کرتا ہے نا۔“

”نیا۔۔۔“ ایک عجیب سے جذبے سے مسحور ہو کر میں اٹھا اور اس کے مقابل آکر اس کے دروازے پر ہاتھ تھام لیے۔

”بس بس اب ڈائلاگ جھاڑنے کی کوشش مت کرتا میں جانتی ہوں تمہیں اس کی الفبہ نہیں آتی، میں دیکھوں ذرا یہ عمر کیا کر رہا ہے بھلا۔“ وہ اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں بات بدلتی ہاتھ چھڑا کر اندر بڑھ گئی تھی۔

پیسہ تو بہر حال اپنی جگہ ایک مسلم ضرورت ہے مگر سچ بات ہے پیسوں کی مدد کے علاوہ بھی جس طرح اس نے مجھے بلڈاپ کرنے میں، اپنی ہمتیں جمع کرنے میں اور پر عزم بنانے میں مدد دی تھی اس کا جواب ہی نہیں تھا۔ کس کس طرح سے مجھ جیسے شکستہ حال تقدیر کے مارے بندے کو کول ڈاؤن کر سبب بنی تھی۔

ایئر پورٹ تک وہ میرے ہمراہ تھی۔ عمر اور اطہر کے ساتھ انماں جی اور آپا لوگوں سے الوداع ملاقات بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اماں جی رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں اور میرا دل ان کی ہر سسکی پر ڈوب جاتا تھا۔

ایسے میں وہی تھی جو سب کوتلیاں دے رہی تھی، حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ میں کبھی دور نہیں رہا تھا گھر والوں سے اور اب تو اتنی دور جا رہا تھا جہاں سے واپس لوٹنے کا بھی کچھ یقین نہیں تھا۔ بڑے ضبط اور جبر سے کام لے کر اپنے اندر اٹھتے شور مچاتے آنسوؤں کو اندر ہی محصور کر کے ماں بہنوں سے رخصت لی تھی۔

”تم بالکل فکر مت کرنا ادھر کی، میں موجود ہوں نا، سب سنبھال لوں گی۔ پھر ماشاء اللہ عمر بھی اچھا خاصا سمجھ دار ہے۔ دیکھو گھر امت جانا شروع شروع میں تمہیں وہاں کا ماحول اجنبی لگے گا۔ یہاں تک خیال بہت ستائے گا۔ مگر آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے اور دیکھو جتنے اچھے یہاں سے جا رہے ہو، اس سے زیادہ اچھا بن کر واپس لوٹنا ہم سب تمہارے منتظر ہیں گے۔“

عمر اور اطہر کو گلے لگا کر پیار کیا، جاتے سے ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈالی۔ سفید سادہ سے کاشن کے شلوار سوٹ میں اس کا سادہ بے ریا مخلص اور ہمدرد وجود کتنا نمایاں، کتنا پرکشش آمیز لگ رہا تھا۔ اتنی عام سی ہوتے ہوئے بھی کتنی منفرد کتنا جاذب نظر لگ رہی تھی۔ جانے کیوں دل میں ایک عجیب دل گداز جذبے نے سزا بھارا، موع ہوتا تو اس وجود کو ایک بار بازوؤں میں لے کر اس پر مہر شکر ثبت کر دیتا۔

”اللہ حافظ خاور! پہنچ کر خیریت کی اطلاع ضرور دینا۔“ اس نے بڑے حوصلے سے مسکرا کر الوداع کیا۔

یہ اس کی باتوں، اس کے جذباتوں، اس کے خلوص کی روشنی تھی جس نے پرائے دیں میں مجھے بھٹکنے دیا۔ میرا عزم بے دار رکھا۔ جب کبھی تھک کر مایوس ہونا چاہا، وہ مہربان باتیں، وہ دلوں کے جگنا تاجہ ذوں میں گھل جاتا، کبھی ایسا بھی ہوا جب کڑی مسافت طے کرتے کرتے میں نے ایک جگہ تھک کر ڈالنے کا سوچا اور ادھر سے اس کا ”نامہ“ آ جاتا، میں پھر سے رخت سیر باندھ لیتا۔

نفیس اور عمر کے خطوط سے پتا چلتا رہا کہ وہ واقعی اپنا کہا پورا کر رہی تھی۔ گھر کے انتظام و انصرام اور والوں کے پرائیمر کے بارے میں برابر خبر رکھتی تھی۔ ایم اے کرنے کے بعد اس نے بینک میں بک کر لی تھی۔

نفیس کی شادی پر کوئی ڈیڑھ برس بعد میں واپس لوٹا تو بڑی حد تک معاشی بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ نفیس سارا جینز تیار تھا۔ بچوں کی پڑھائیاں ٹھیک ٹھاک چل رہی تھیں۔ گھر کا بجٹ نارمل ہو چکا تھا اور گھر والے کے چہروں پر خوشی کے عکس جگمگا رہے تھے۔ میرا دل بھی مسرور ہو گیا۔ اماں جی تیار ہی تھیں نیانے

ت ساتھ دیا یہ سب اسی کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ ہے۔ بہت خیال رکھا ہے اس نے۔

”وہ کہاں ہے؟ ہوٹل میں ہوگی؟“ میں نے گھڑی دیکھ کر قدرے بے چینی سے دریافت کیا۔

”ارے نہیں، اپنے بینک سے چھٹی لے گئی ہوئی ہے پرسوں سے جہلم، وہاں اس کے کوئی اتنے والے ہیں حال ہی میں ایف بی سی میں ایف بی سی سے آئے ہیں ان کا پتا کرنے کے لیے گئی ہے۔“

”تو کیا شادی میں شریک نہیں ہوگی وہ؟“ میرا دل جانے کیوں اسے رو رو دیکھنے کو چلنے لگا تھا۔

”کیوں نہیں شریک ہوگی۔ بھلا پرسوں شام تک آجائے گی واپس۔“

اور مجھے یہ دودن کا عرصہ بہت طویل لگا۔ میں خوش تو تھا کہ ایک ذمہ داری سے بحسن و خوبی فارغ ہو رہا ہوں مگر میری یہ خوشی نامکمل سی لگ رہی تھی۔ سب نے مجھے سرائیوں پر بٹھایا تھا۔ میری قربانیوں کو سراہا تھا مگر میرا دل ہنوز تشنہ تھا یہ کسی اور ہستی کی طرف سے خراج کا طالب ہو رہا تھا۔

”اسے کہتے ہیں ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی۔ ہمیں خبر ہی نہ تھی ورنہ کوئی استقبالی پروگرام ترتیب دینے کے لیے ضرور ٹھہر جاتے۔ اور سنائیے کیسے مزاج ہیں جناب خاور مغل صاحب کے۔“

اس کی زندگی سے بھرپور بٹاش آواز بہار کا جھونکا بن کر کمرے میں پھیل گئی تھی۔ اس کے اندر داخل ہونے پر جس بے قراری سے میری نگاہوں نے اس کے سراپے کو اپنے حصار میں لیا تھا میرے لیے بذات خود بڑا حیران کن تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹنا بھول گئی تھی۔

وہ ویسی ہی تھی، پہلے کی طرح سادہ رو، سادہ مزاج سادہ لباس اپنے مخصوص لا پرواہ انداز میں سب سے مخاطب کبھی ادھر آ رہی ہے تو کبھی ادھر یہاں وہاں ہر جگہ ایک کے ساتھ اور ہر طرح کی صورت حال میں ہم قدم۔

”نفیس کا معاملہ تو اللہ نے نبھا دیا بس اب اچھی سی بڑی سی کوٹھی خریدنا رہ گئی ہے اس کو بھرنے کے لیے سامان چاہے، پھر گاڑی بھی خریدنا ہے اور فریال کے لیے کچھ سامان چاہیے، اب یہ فلیٹ بھی چھوڑ دی

دینا ہے، کب تک اس کا بک میں رہیں گے۔“ اماں مستقبل کے منصوبے بنا رہی تھیں۔
”گو یا تین نئے ٹارگٹ ہیں ماموں کے لیے۔“ فریال شوخی سے منسکرائی۔

”گھر، گاڑی اور گھریلو سامان۔“

رات کو وہ حسب معمول جانے لگی تو بلیس آپا نے عمر کو پکارا۔

”عمر جاؤ دنیا کو چھوڑ آؤ نیچے تک۔“ اس کی گاڑی کی چابی تو تھی اس کے ہاتھ میں۔

”میں چھوڑ آتا ہوں۔“ میں عمر کے آنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا بھئی، اللہ حافظ کب تک ہو یہاں؟“ نیچے پہنچ کر اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے

خوش دلی سے دریافت کیا۔

”دو تین دن اور ہوں چابی مجھے دو، میں ڈرائیو کرتا ہوں۔“

”ارے نہیں، میں چلی جاؤں گی آرام سے، تم پھر واپس کیسے آؤ گے؟“

اس نے میری تکلیف کا خیال کرتے ہوئے منع کر دیا۔

”خیر ہے، آ جاؤں گا تم بیٹھو۔“ میں چابی لے کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

”اگلی بار آؤ گے تو ان شاء اللہ العزیز اپنی کروڑ لاکھ کا دروازہ کھول کر شان سے مجھے بیٹھنے کی آفر کرو

گے۔“

ہمیشہ سے دوسروں کا مان بڑھانے والی عادت اس کے خیر میں شامل تھی۔

سارے راستے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں وہ گھر کے معاملات ڈسکس کرتی رہی، یہاں کے

حالات بتاتی رہی۔

”اس۔۔۔ یہ کیا، یہ تو باطل نہیں ہے تم شاید راستہ بھول بیٹھے ہو۔“ گاڑی کے رکنے پر وہ حیرت

سے پلکیں جھپک کر مخاطب ہوئی تھی۔

”یہ آئس کریم پارلر ہے، یہاں آئس کریم کھائی جاتی ہے اور بے فکر ہو میں راستہ بھی ہرگز نہیں

بھولا۔“ میرے انداز میں حد درجہ اطمینان تھا۔

”آؤ چلتے ہیں مگر ایک منٹ ایک امانت ہے تمہاری میرے پاس۔“ میں نے کوٹ کی اندرونی

پاکٹ سے اپنا والٹ نکالا۔ ساتھ ہی سائیڈ کی دوسری پاکٹ کھنگال کر اندر سے ایک چھوٹا سا خوب

صورت سے ریپر میں لپٹا گفٹ باہر نکالا۔

اس نے میرے ایک ہاتھ میں رقم کے پھولے ہوئے لفافے اور دوسرے میں ننھے سے گفٹ کو کچھ

نہ بچھنے والے انداز میں دیکھا تھا۔

”تمہارا ایک حقیقت ہے کہ جو کچھ تم نے میرے لیے میری فیملی کے لیے کیا ہے اس کا بدلہ مجھ جیسا

بے فیض شخص چکا ہی نہیں سکتا میں خود کو کسی قابل نہیں پاتا کہ تمہارے احسانات، تمہاری مہربانیوں کے

صلے میں کچھ پیش کر سکوں تاہم رسم دنیا کو یہ تمہارا فرض۔“

میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رقم والا لفافہ اس کے پاس میں ڈال دیا۔

”ہاں اور یہ میری خوشی ہے، ایک چھوٹا سا معمولی سا تحفہ پلیز اور اب انکار نہیں کرنا۔“

مگر یہاں بھی وہ میرا مان بڑھا گئی، خوش دلی سے میرے ہاتھ سے گفٹ لے کر کھولتے ہوئے

لی۔ ”بھئی واہ! لینے سے انکار کون کافر کرتا ہے۔“ اس کے ہاتھ بڑی سرعت سے ریپنگ پیپر کھول

ہے تھے۔

”داؤز بردست۔“ گینگنوں جڑا خوب صورت ڈیزائن والا بریسلٹ دیکھ کر اس نے مسرت انداز

ن۔ کہا۔ میرا دل شادمان ہو گیا حالانکہ میں جانتا تھا اس کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک بیش قیمت اور

نوب صورت چیز ہی موجود تھی۔ مگر جس طرح اس نے میرے خلوص کی قدر دانی کرتے ہوئے نا صرف

خفیہ پسند کیا تھا بلکہ نہایت اشتیاق کے عالم میں اسی وقت پہن کر بار بار اپنا بازو دیکھ رہی تھی اس کے اس

عمل نے مجھے بڑی انوکھی سی سرشاری بخشی تھی۔

آئس کریم کھاتے ہوئے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے میں اسے وہاں کے قصے سناتا رہا۔

اس کی معیت میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

دوسری بار جب میں وطن لوٹا تو اتنا کما چکا تھا جس سے گھر والوں کے خوابوں کی تعبیر ممکن ہو سکی

تھی۔ اس بار میں امریکہ کو مکمل طور پر خیر باد کہہ کر لوٹا تھا۔ اس مختصر عرصے میں گھر کے افراد میں بہت سے

تبدیلیاں آچکی تھیں۔ انہیں پیسہ استعمال کرنے کا سلیقہ آچکا تھا۔ میرے آنے سے پہلے ہی ایک شاندار سی

کوٹھی اور نئی ٹیوٹا کروڑ لاکھ کی پسند کی جا چکی تھی۔ میرے آنے کی دیر بھی کہ بے منٹ کے بعد فلیٹ چھوڑ کر

نئے گھر میں منتقل ہو گئے اور عمر اور اظہر کی فرمائشی اشیاء سے مزین کرنے کے لیے رقم اماں جی اور فریال

لوگوں کے سپرد کردی انہوں نے اپنی مرضی سے گھر سیٹ کرایا۔

سب گھر والوں کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ جدید طرز کے قیمتی ملبوسات، اچھا کھانا پینا

اور آسائش و آرام نے گویا سب کی صورتیں ہی بدل دی تھیں۔ میں خوش تھا کہ گھر والوں نے جیسے سکھ کے

خواب دیکھے تھے بالآخر میں انہیں ان کی تعبیر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

رقم میرے پاس موجود تھی سو بسم اللہ کر کے بزنس شروع کیا۔ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر ہی پھاڑ

دیتا ہے۔ بزنس بہت جلد چل نکلا اور یوں گھر میں دولت کی ریل پیل بڑھتی ہی چلی گئی۔ میرے سیٹ

ہوتے ہی اماں اور آپا لوگوں کو میری شادی کی فکر ہوئی، میں چاہ رہا تھا پہلے فریال کی شادی ہو جاتی مگر

فریال کی ضد تھی ابھی وہ جاب کرنا چاہتی ہے۔ اماں نے بھی کہا۔

”چلو ایک آدھ سال اسے شوق پورا کر لینے دو، کون سا عمر نکلی گھارہی ہے یوں بھی اصولاً اب

تمہاری باری ہے۔ میں اپنے چاند سے بیٹے کے لیے بہت حسین پڑھی لکھی اور کسی اونچے گھر کی لڑکی

لاؤں گی۔ ایسی کہ سب دیکھتے رہ جائیں۔“

میں ان دنوں عمر کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھجوانے کے چکروں میں تھا۔ خیال تھا کہ ادھر ایک تو

نک کر بڑھ لے گا دوسرا جاب کی پراہم نہیں رہے گی۔

مجھے خبر بھی نہ تھی کہ اماں اور آپا مع بھانجیوں کے ان دنوں میرے لیے لڑکی تلاش کی مہم چلا رہی ہیں

اور کسی ایک کو منتخب بھی کر چکی ہیں۔ خبر تو تب ہوئی جب انہوں نے کسی شہرینائی لڑکی کے بارے میں

مجھے بتایا اور اس کی تصویر دکھا کر رائے لی۔

”بے انتہا خوب صورت ہیں شہرین، ماموں۔“ فریال بڑی خوش ہو کر اطلاع دے رہی تھی۔

”اور امیر بھی بہت ہیں، اتنا بڑا گھر ہے ان کا۔“ بلقیس آپا نے رائے دی۔

”کم عمر بھی ہے میرے بیٹے کے ساتھ خوب بچے گی۔“ اماں میری نظر اتار رہی تھیں میں ان لوگوں کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے جملے تو کان میں پڑ رہے ہوں مگر مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

گھر میں کافی چرچا رہنے لگا۔ شہرین کے حسن جہاں سوز کا، اس کے باپ کی امارت کا، اس کی نازک مزاجی کا۔ مجھے یہ سب کچھ بے زار کن اور ناگوار گزر رہا تھا۔ بالآخر ایک دن جب اماں نے سنجیدہ ہو کر میری رائے طلب کی تو میں نے بالآخر تامل کرتے ہوئے دل کی بات بتا ہی دی۔

”کیا۔۔۔؟“ اماں ہی کیا سارے گھر والے بھونچکا رہ گئے اور مجھے ان کی حیرت پر حیرت ہونے لگی۔ میرے خیال میں تو یہ سن کر انہیں خوشی سے کھل جانا چاہیے تھا۔

”لو بھلا بتاؤ کیا بے وقوفوں والی بات کرتے ہو، تم نیا شادی کرو گے؟“ بالآخر بلقیس آپا نے ابتدا کی۔

”کمال کرتے ہو بچے اتنے بڑے برنس مین ہوا تانا م ہے تمہارا۔ بھلا لوگ کیا خیال کریں گے کہ یہ ہے تمہاری پسند۔“ اماں جی کے انداز نے میرے خون میں کھوکھن پیدا کر دی۔

”مجھے آپ کی منطق سمجھ میں نہیں آئی اسے اپنانے سے میرے نام یا برنس پر کیا اثر پڑے گا۔ بلاشبہ اتنی اچھی ہے کہ اسے اپنانے والا اپنی قسمت پر رشک کرے گا اس میں کیا برائی ہے؟ کیا عیب ہے؟“

”ماموں کیا آپ انہیں ہماری ممانی بنائیں گے؟ میری دوستیں کیا کہیں گی۔“ فریال نے منہ بسور کر مایوسی کے عالم میں کہا۔

”کیوں، کیا کہیں گی۔“ مجھے سخت تاؤ آ رہا تھا گھروالوں کے انداز پر۔

اماں میرا غضب ناک موڈ دیکھ کر بڑے سہجاء سے بات بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہے بچے، نیا بہت اچھی لڑکی ہے بڑا ساتھ دیا ہے اس نے ہمارا۔ مگر وہ تیری لہن نہیں بن سکتی۔ دیکھ نا تو تو ایسے شہزادوں جیسے نقوش کا مالک ہے وہ عام سی شکل و صورت والی ہے۔ پھر عمر بھی اس کی اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ ماں باپ کا پچھلے سال ابولہبی میں انتقال ہو گیا اب اس کے پاس رہا ہی کیا ہے۔ اب ہمارا اتنے بڑے گھرانے کے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، شہر کے معززین میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ ایسی ویسی بہو لے آئے تو کیا دنیا والے تمہیں نہیں اڑائیں گے۔ سو سوتا میں بنائیں گے لوگ۔“

اماں جی کی بات سن کر میں نے نہایت بے یقینی اور تاسف کے عالم میں انہیں دیکھا تھا۔ باقی سب لوگوں کے چہروں کے تاثرات بھی اماں کی باتوں کی خاموش تصدیق کر رہے تھے۔

”اماں! ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ شکل و صورت اس کی جیسی بھی ہے مجھے پسند ہے۔ اور عمر میں تو وہ مجھ سے تین چار سال چھوٹی ہی ہوگی، امیر والدین کے انتقال کے بعد وہ خدا نا خواستہ غریب تو نہیں ہوگئی۔“ ان کی خود غرضانہ سوچ نے مجھے سلگا کر رکھ دیا تھا۔

”بچے! آج کل رشتے کرتے ہوئے یہی سب کچھ دیکھا جاتا ہے۔ شکل و صورت والی ہو، کم عمر ہو میر ہو، مرد کی عمر کو کون پوچھتا ہے۔ تو تو آج سے دس سال بعد بھی ماشاء اللہ اسی طرح جوان اور خوب رت دکھائی دے گا۔ مرد کی عمر کو رنگ نہیں لگتا۔ عورت چاہے اپنے مرد سے دس پندرہ سال چھوٹی ہو تو جوڑی چل جاتی ہے جب تجھے اتنی حسین، امیر، کم عمر لڑکیاں مل سکتی ہیں تو کیوں اس معمولی سی بے راء، بڑے ٹھکانا لڑکی کے لیے دل چھوٹا کرنا ہے۔“

مجھے لگا جیسے کسی نے یم میرے اعصاب پر پھوڑ دیا ہو۔ یہ میری ماں تھیں جو کل تک مجھے نیا سے بلاش رکھنے پر پھنکارا کرتی تھیں اس کے باپ کے بابا جان برا احسانات گنوا کر لٹاڑتی تھیں کل تک جس لی کی اعلا ظرفی، فراخ دلی اور محبت کرنے والی فطرت کے گن گنا کر جیا کرتی تھیں، آج وہ ان کی مردوں میں معمولی اور بے آسرا لڑکی بن گئی تھی۔ یا خدا یہ دہشت اس طرح بھی ذہنوں کی کاپی لٹ سکتی ہے۔ میں سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔

”اگر آپ کا حافظہ آپ کا ساتھ دیتا ہے تو ذرا یاد کیجیے اس معمولی لڑکی نے ہمارے گھر کے لیے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ آج ہم جو کچھ ہیں، اسی کی قربانیوں اور ایثار پسند طبیعت کے باعث ہیں۔ ذرا یاد کیجیے یہی معمولی لڑکی جب آپ کے گھر کے حسرت زدہ ماحول میں آ کر اجنبیت کا احساس منادیا کرتی تھی۔ جو غائف کے نام سے گھر گھر کے کپڑے اور کھانے پینے کا اہتمام کرتی تھی، جو آپ کی اولاد کی فیسوں اور کاپیاں کتابیں دے کر ان کی مدد کیا کرتی تھی جو بغیر احسان جتلانے آپ کے گھر کے بجٹ کو پورا کر دیا کرتی تھی۔ جو آپا کے علاج کے لیے مہنگی سے مہنگی دوائیاں خرید کر لاتی تھی۔ کوئی بیمار پڑتا تھا تو خود اپنی گاڑی پر اپنے پیلے سے خرچ کرتی تھی۔ جواتے امیر باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود آپ کے گھر کی روٹی سوکھی من و سلوکی سمجھ کر کھایا کرتی تھی۔ جس نے ایسے کڑے وقت میں مالی امداد کی جب میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ جس کی رقم سے میں اس قابل ہو سکا کہ باہر جا کر آپ لوگوں کو اس قسم کے ٹھاٹھ کراؤں۔“

غم و غصے سے میرا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔

”تو کیا ہوا تم نے واپس تو کر دی ہے اس کی رقم، رکھ تو نہیں لی نا ہم نے۔“

آپا کی بے حسی پر میرا دل کڑھ کر رہ گیا۔

”بات رقم کی نہیں ہوتی آپا! میں نے بمشکل تمام اپنا اشتغال ضبط کیا۔“ ایسی ہزاروں رقیں بھی میں اسے واپس کر دوں تب بھی اس کے احسانات کا بدلہ نہیں اتارا جاسکتا، مالی مدد کا بدلہ ہو سکتا ہے مگر جذباتی مدد کا کوئی بدلہ نہیں ہوا کرتا۔ اس کے جذبوں کے خلوص، محبت اور اس کی بیش قیمت ہمدردیوں کو سامنے رکھا جائے تو ہمارے گھر کا ایک ایک فرد کا بال بال اس کے قرضے میں جکڑا محسوس ہوگا۔“

”ابے تو ہم نے بھی تو اس کے لیے کچھ کم نہیں کیا۔ یہ تھوڑا ہے ہم نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی، ماں باپ سے اتنی دور بھی ہم نے اس کی عزت کی حفاظت کی اس کو اتنی محبت دی وہ تو رشتوں کی ترسی ہوئی تھی۔ بھلا اور کسی کے ہاں اسے اتنا آرام، اتنا پیار ملنا تھا۔“

اماں کے بے حسی اور خود غرضی کے لمبا دے میں لپٹے جملوں نے میرے اندر آگ سی دہکادی۔

”اب کیا ان کے احیاء کے بدلے میں ہم آپ کی زندگی تباہ کر دیں۔“ فریال نے بھی بڑا پین دکھاتے ہوئے لب کشائی کی تھی۔

”تم چپ رہو اور جا کر اپنا کام کرو۔“ میں نے شاید زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ اس طرح غرا کر بات کی تھی۔ وہ ماموں کے مشعل ہونے پر خائف سی ہو کر اندر چلی گئی۔

”ہاں تو صحیح ہی تو ہے۔ بھلا شادی کوئی گڈے گڈی کا کھیل تو نہیں ہوتا نا کہ جیسے بھی چلاؤ نہ جائے گی۔ یہ بات واضح ہے کہ نیا تمہارے ساتھ کسی لحاظ سے سوٹ نہیں کرتی اور تمہارے ساتھ تمہارے اسٹینڈرڈ اور اسٹینڈس کے مطابق کوئی خوب صورت سی امیر زادی ہی سیجے گی۔“

آپا کو اپنی بیٹی کی بے عزتی پسند نہیں آتی تھی سو جیسے بہ جیسے ہو کر بول پڑی تھیں۔

”زندگی مجھے گزارنا ہے اور میں نہ جان چکا ہوں کہ میرے ساتھ نیا کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی کسی بھی طبقے کی اور کوئی زہرہ جیس نہیں چل سکتی۔ نا صرف میرے ساتھ بلکہ آپ لوگوں کے ساتھ بھی کسی بڑے گھر کی خیرلی حسینہ کا گزارا نہیں ہوگا۔ نیا تو ہر لحاظ سے فٹ ہے یہاں۔“

”ہم کر لیں گے بھیا گزارا۔“ آپا چمک کر بولیں۔

”ہمیں تو بس شہرین جیسی خوب صورت اور نازک سی بھابھی چاہیے۔“

”تم دیکھ تو لو اسے ایک بار ملو تو سہی اتنی خوب صورت اور کم عمر ہے وہ کہ۔۔۔“ اماں مجھے لچاری تھیں۔ میں بے بسی سے سر پکڑ کر رہ گیا۔

”اماں! آپ کیوں نہیں سمجھتیں۔ کیوں آپ کی آنکھوں پر امارت اور حسن کی پٹی پڑ گئی ہے۔ میں جس قسم کا بندہ ہوں اس لحاظ سے میں نیا جیسے مزاج کی حامل لڑکی کے ساتھ ہی ایڈ جسٹ ہو سکتا ہوں وہ مجھے سمجھتی ہے اچھی طرح۔ میرے خیالات کا پتہ ہے۔ نہ مجھے حسن کی طلب ہے نہ امارت کی، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مجھے اپنے مزاج کے موموں کا سا بھی چاہیے اور وہ صرف نیا ہی ہو سکتی ہے۔“

میرے جتنی انداز نے اماں کو بھڑکا دیا۔

”مگر ہم ایسی معمولی صورتی شکل والی لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتے۔ آخر چار بندوں میں ہمیں بھی منہ دکھانا ہے۔ شہرین تمہیں نہیں پسند تو کوئی اور دیکھ لیتے ہیں مگر وہ نیا کی صورت بھی نہیں ہو سکتی۔ غضب خدا کا سارے جاننے والے لعن طعن کریں گے کہ بہو تو ایسی گری پڑی لاوارث ہم سے دوسروں کی باتیں نہیں سنی جاتیں۔ ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں، آخر ہمیں ماں بہنوں کو ناراض کر کے اپنی پسند کی دہن لانا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہمیں چھوڑ آؤ دوبارہ اسی فلیٹ میں۔ وہاں رہ لیں گے تم یہاں اپنی دل کی ملکہ کے ہمراہ ہی خوش رہنا اور ہم سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا۔“

اماں کا سرد مہر انداز مجھے اندر سے باہر تک بے بسی کی آگ میں جھلسا گیا۔ اسی لمحے کوئی اندر داخل ہوا۔

یہ نیا تھی۔ دھواں دھواں چہرہ لڑکھرائی ہوئی چال، بے اوسان انداز، وہ اندر داخل ہو کر گرنے کے سے انداز میں قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے بغور اس کے لرزتے کانپتے وجود کو دیکھا اور جیسے میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

مجھے عجیب سا احساس تو ہوا تھا جیسے کوئی دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑا ہو کافی دیر سے، مگر پھر سے بحث و مباحثے اور گرما گرمی میں دوبارہ دھیان نہیں گیا۔ تو کیا اس نے ساری باتیں سن لی ہیں۔

”نہیں میرے خدا۔ اس کو اپنی اپنا پسندی اور ہمدردی و نفرت کی اتنی کڑی سزا نہیں ملنی چاہیے۔“

میرا رواں رواں قرعش تھا مگر ہونی ہو کر رہتا تھا۔ اس کا ہر ہر انداز پکار رہا تھا کہ یہی بات تھی۔

”گر می میں آئی ہوں نا تو لو گننے سے اعصاب ہی الٹ گئے میرے۔“

کتنی دیر بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے وضاحت کی تھی، مگر اس کی آواز کی مخصوص کھنک کی ٹھوکلہ اپن اور لرزش مجھ سے پنہاں کیسے رہ سکتی تھی۔ جب سے نئے گھر میں شفٹنگ ہوئی تھی، گھر والوں اس کے ساتھ پندرہ رات کی وہ پہلے والی گرم جوشی اور والہانہ انداز نہیں رہے تھے وہ بھی شاید محسوس کر رہی تھی اس لیے بہت کم آتی تھی۔

حسب معمول وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی خود کو مصروف اور بے خبر ظاہر کرتی رہی مگر اس کے رویوں میں سے پھوٹی بے چینی اور اضطراب کی موجیں بغور دیکھنے پر واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھیں۔

”اچھا آئی! اب چلتی ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد وہ بیگ اٹھانی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاتیں تھوڑی دیر۔“ اماں نے رسماً کہا ان کے انداز میں بڑا ٹھنڈا پین اور بے مہری تھی۔ مگر مانے نہایت محل اور اعلا درجے کی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا۔

”ضرور رک جاتی آئی! لیکن کچھ کام ہے مجھے، دراصل ان دنوں میں اپنی جہلم ٹرانسفر کرانے کے رول میں ہوں۔ وہاں کچھ جان پہچان کے عزیز موجود ہیں دعا کیجیے گا۔ میرا کام ہو جائے۔“ پھر وہ ری طرف پلٹی تھی۔

”اور ہاں بھئی جناب خاور مغل! آپ شادیانے کب بجوار ہے ہیں۔ ذرا جلدی جلدی کر ڈالیے کام تاکہ ہم بھی جاتے جاتے آپ کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔“

میں نے سر اٹھا کر گہری نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔ وہی بے لوث، بے ریا مسکراہٹ آنکھوں میں کمال درجے کا ضبط، میں کچھ کہنا چاہتا تھا اسے روکنا چاہتا تھا اس کے پیچھے آکر ساری حقیقت منکشف کرنا چاہتا تھا مگر کسی نادیدہ طاقت نے میرے قدموں کو زمین میں گاڑ دیا تھا وہ چلی گئی اور میں اسے دروازے تک چھوڑنے کی ہمت بھی اپنے اندر پیدا نہ کر سکا۔

کتنے تو قیر کر دیا تھا اماں اور آپا لوگوں کے خیالات نے اسے، کس طرح اس کی عزت نفس کو روند ڈالا تھا۔ اس کی انا، اس کی خودداری پر کس طرح تازیانہ لگایا تھا۔ اسے خود اپنی نظروں میں کتنا گرا دیا تھا۔ میں پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جو سب کو جوڑنے والی تھی، مہر مہر رکھنے والی تھی جو ہمد و ہم راز اور چارہ گرد و ساز بھی سب کی، کس بے دردی سے اس کے خلوص اس کے ایثار کا مذاق اڑایا گیا تھا ان زہریلی ٹھوڑیاؤں کے ڈنک کس کس طرح اس کی روح کو جھنجھو کر رہے ہوں گے۔

بے چینی، اضطراب اور دکھ کی لامتناہی چادر نے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ محض دو ہفتے بعد وہ رخت سفر باندھے تیار تھی۔ میں اس عرصے میں ہتھیار ڈال چکا تھا۔

”ارادہ تھا کہ تمہاری شادی تک رک جاؤں مگر ٹرانسفر آرڈر زیادہ ہی جلدی آگئے۔ بہر حال میری

طرف سے بھی بہت سارا خوش ہو لیتا۔“

جاتے سے وہ الوداعی ملاقات کے لیے آئی تو سب سے مل کر بڑے بشاش سے انداز میں مجھے چھیڑا تھا۔

مکینوں کے دلوں کی کدورتوں اور بدگمانیوں سے آشنا ہوتے ہوئے بھی ان سے اتنی لگاؤٹ اور اتنے خلوص سے ملنا بڑے دل گردے والے لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے۔

”اماں جی! آپ لوگوں کے ہاں مجھے جو پیار محبت اور احساس تحفظ ملا میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتی آپ کو، آپ لوگوں کا بہت شکریہ کہ اتنا عرصہ مجھے غریب الوطنی کا اور بے آسرا ہونے کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ میں آپ سب لوگوں کو بہت مس کروں گی۔ مجھ سے اگر نادانستگی میں کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہو تو چھوٹی سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔“

سب سے مل کر وہ ہوا کے جھونکے کے مانند خاور ولا سے نکل گئی اور جیسے میری زندگی سے بھی خوشی اور سکون کی برکھا ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ جانے سے پہلے اس نے پورے گھر کا ایک چکر لگایا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو کھودینے کا ہولناک احساس میری رگ رگ میں انگارے دوڑا رہا تھا۔ یونہی سائیڈ ٹیبل پر رکھے سفید لفافے پر نظر پڑی، بھولا۔ عزیزم خاور!

قیمت نہ لگا جذبہ ایثار طلب کی
ہر شے کو فقط چشم خریدار سے مت دیکھ
میں اور کہیں صاف دکھائی نہیں دوں گی
ہٹ کر مجھے آئینہ کردار سے مت دیکھ

تمہاری خیر اندیش

☆☆☆

وہ کب کے خاموش ہو چکے تھے مگر تانیہ ہنوز جیسے کسی طلسم کے زیر اثر خود کو اسی ماحول میں جذب پارہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گزرا ہو وہ خود کو اس کہانی کا ایک کردار سمجھتے ہوئے شکست و ریخت کے ان جذبات کو مکمل طور پر محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر سر جھکا، خاور مغل کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل بند ہوتے ہوئے رہ گیا

ان کے چہرے اور آنکھوں میں کیا تھا؟

• تانیہ سے زیادہ دیر تک دیکھا نہیں گیا۔

ملاں، حسرت، تشنہ کامی، تاسف، دل گرفتگی اور شکستہ لپائی کی دھول نے ان کے چہرے کے سارے رنگ نچوڑ لیے تھے۔ ان کی سرخ وحشت زدہ آنکھوں میں دیرانیوں کے سائے رقصاں تھے۔ اس سے وہ اتنے ٹوٹے پھوٹے اتنے شکستہ نظر آ رہے تھے کہ تانیہ کا دل شدت غم سے بیٹھنے لگا۔ ”تو یہ تھا سارا قصہ بے بی۔ اب تم جان ہی چکی ہوگی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ اپنے رویوں میں

حق بجانب ہوں اور دیکھ لو ان کو ان کی ہوس زر اور ظاہری آل بان نے کتنا بے سکون کر کے۔ اب مجھ سے شام کیوں ہوتے ہیں۔ بھکتیں اب اپنا بھکتان۔ انہوں نے خود اپنے لیے یہ اکیا ہے۔ اپنے ہی جال میں پھنس چکے ہیں۔ اب وہ جذبات مجھ سے طلب کرتے ہیں جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ میرے اندر کیا باقی رہا ہے ان کو لیے، دل کے سارے خزانے تو لوٹ لیے۔ جذبات کے سارے الاؤ بجا دیے۔ اب میں اندر ف کے تو دے کی صورت اختیار کر چکا ہوں۔ کوئی چیز اب مجھے نہیں پکھلانی، نہ آنسو، نہ آہیں، نہ خلوص۔ مجھے خود اپنے آپ سے محروم کر ڈالا ہے ان لوگوں نے۔“

ہاکی آنکھوں کی وحشیتیں بول رہی تھیں۔ آؤ بے بی گھر چلتے ہیں۔“ پھر وہ اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے اسٹیرنگ وہیل کی جانب متوجہ سارے راستہ دونوں کم صم سے بیٹھے رہے۔

اڑی سے اترتے ہوئے پہلے اس کی نظری سیڑھیوں کے پاس کھڑی شہرین کی جانب گئی پھر بے نی پر بندھی گھڑی پر جا بٹھری اور وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ رات کے تقریباً ساڑھے درے تھے۔

مادر مقل تو چابی ہاتھ میں مٹھلاتے آگے بڑھ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی کچھ ہچکچا کر کے پاس سر جھکا کر مجرمانہ انداز میں کھڑی ہوگئی۔

”سوری بھابھی! کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی۔“
”دیر تمہیں نہیں مجھے ہوتی ہے جو تمہارا کھیل نہیں سمجھ سکی۔ میں تمہیں بہت معصوم اور سادہ مزاج کی بال کرتی تھی۔“

”خبردار شہرین! مزید ایک لفظ مت کہیے گا۔ کسی کی بے غرضی کو یوں سرعام نیلام نہیں کرتے۔“

وہ اسی لمحے پلٹ آئے تھے۔ تانیہ کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔
”دوسروں کا تو آپ کو بہت خیال ہے جس کا رکھنا چاہیے اس پر تو کبھی ایک لمحہ رک کر تفصیلی نظر

کی بھی زحمت نہیں کی۔“ شہرین کے سلگتے انداز اس کی اندرونی کیفیت کے غماز تھے۔
”خیال وہاں رکھا جاتا ہے جہاں دل رکھے جاتے ہیں، مان رکھے جاتے ہیں اور یہ کوئی جادو کا

نہیں ہوتا کہ چھڑی گھمانے سے مطلوب سامنے آجائے۔ اس کے لیے بڑی تپسیا کاٹنی پڑتی ہے۔
ل آپ کی تسلی کے لیے تباہوں کہ یہ وہ نہیں ہیں جس سے آپ کو خائف ہونا چاہیے۔“

وہ کہہ کر رے نہیں تھے۔ تیز تیز قدموں سے اندر بڑھ گئے تھے اور اسی لمحے تانیہ بھی فیصلہ کر چکی تھی
ماگھن زدہ بدگمان فضا میں زیادہ دیر نہیں رہ سکے گی۔ ڈیڈی پر زور دے کر وہ اپنا ترانسفر لاہور سے

مائیڈیکل کالج میں کرنا سکتی تھی۔ وہ بہلم سے ویسے بھی بہت نزدیک پڑتا تھا۔
”جاری ہی ہو بے بی تم بھی۔“ جاتے سے وہ ان کو دوش کرنے آئی تو انہوں نے تھکے تھکے انداز میں

اسے مسکرا کر کہا۔
وہ سوچنے لگی کیا جواب دے۔

”چلو تمہاری مرضی۔ لیکن یہ یاد رکھنا ہم تمہیں دوبارہ ضرور یہاں لائیں گے اور بہت جلد لاؤ گے۔“ انہوں نے ہلکے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہلاتا تھا۔

اس وقت تو وہ ان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی البتہ جب تین چار ماہ بعد وہ لوگ عمر کا پُر پوزل کے لیے لے کر آئے تب ان کی بات کا اصل مفہوم سمجھ میں آیا۔

عمر امریکہ سے آچکا تھا۔ اسٹڈی کمپلیٹ کر کے اور اب بزنس میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ روبرو تو تانیہ کی اس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ البتہ الہم میں اس کی تازہ ترین تصاویر بغور ملاحظہ کی تھیں۔ دیکھنے میں وہ خاور مغل ہی کی طرح دلکش نقوش اور بھرپور سراپے کا مالک تھا۔ مگر اصل چیز تو بندے کا مزاج اور عادات ہوا کرتی ہیں۔ اس ضمن میں خاور مغل نے اس کی تسلی کروادی۔

”فکر نہیں کرو میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔ بڑا سادہ مزاج، مخلص اور رشتوں کا احترام کرنے والا شخص ہے۔ اس کے ساتھ تمہارے جیسی نیک طور اطوار کی لڑکی ہی سوٹ کر سکتی ہے۔ ابتدائی بات چیت کے بعد جب تم مجھ پر کھل گئی تھیں اسی لمحے میں نے سوچ لیا تھا کہ میں عمر کو اپنی طرح زندگی کی تنہا کر دینے والی بھیڑ میں گم نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لیے اسٹینڈ ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ مگر اتفاق دیکھو کہ ایسی نوبت نہیں آئی۔ مجھ سے پہلے ہی اماں اور آلوگوں نے عمر کے لیے تمہارا نام لے دیا۔ وقت نے حالات نے انہیں بہت کچھ سکھادیا ہے۔ اب انہیں ٹھونے کھرے کی پہچان ہو چکی ہے۔ میرے معاملے میں تو دیر سے ہوئی لیکن صد شکر کہ عمر کے معاملے میں دیر نہیں ہوئی۔ کوئی ایک درجہ باڈی ہے جہاں سے تازہ ہوا اندر آ سکتی ہے، بے نی تمہیں وہاں قدم جانے کے لیے محنت تو ٹھیک ٹھاک کر پڑے گی کہ بدگمانیوں، کدورتوں اور رجش کا کوڑا سمیٹنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے لیکن میں جانتا ہوں تم نے ایک بار قدم جمالیے تو پھر ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گی بشرطیکہ کوشش جاری رکھو راہ کی مشکلات سے بٹنے کا ارادہ ٹھان لو۔“

تانیہ نے دھیرے سے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی جانب دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

”میں مشکلات سے نہیں گھبراتی خاور بھائی۔ نموائی کہا کرتی ہیں اگر آپ کے اندر عزم زندہ ہے۔ چلنے کا حوصلہ موجود ہے تو پھر ہم سفری کے لیے کہیں دور ٹھناتے ایک مٹی کے دیے کی لو، کسی مہربان یاد کے جگنو ہی بہت کافی ہوا کرتے ہیں۔ کسی کا خیال، کسی کی یاد بھی تو بہترین ہم سفر ہوا کرتی ہے۔ پھر میرے ساتھ تو آپ جیسے شفیق اور مہربان ہستی کی آ شیر باد شامل ہے۔“

”بھئی، یہ تمہاری نموائی کیا چیز ہیں جو تمہیں وہاں لاہور میں بھی اتنے فاصلے کے باوجود نہیں بھولیں۔ کبھی ملو آنا ہمیں بھی ان سے۔ اب تو سچ بڑا اشتیاق ہوتا جا رہا ہے جنہوں نے اتنی سی بچی کو اتنا شعور بخش دیا۔“

”ہاں ضرور ملو آؤں گی۔ بلکہ ہاتھ لنگن کو آری کیا۔ ابھی چلے چلتے ہیں۔ یہ ساتھ میں دو گھر چھوڑ کر تو ان کا ہنگامہ ہے۔“

وہ دنور شوق میں یونہی ہمراہ ہو لیے۔

”ارے بے بی! یاد آیا تمہاری تو بے تکلفی ہوگی آتی جاتی رہتی ہوگی ان کے ہاں، بھلا وہ میرے

یال کریں گی۔ ان کے گھر والے بھی تو کوئی ہوں گے نا۔“ وہ بوکھلائے تھے۔

ن کے ساتھ ان کے شوہر ہوتے ہیں، آرمی میں میجر ہیں اور دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ س کے دونوں جڑواں ہیں۔ ان کے شوہر شام کی جائے تک آ جاتے ہیں۔ آپ ان سے بات بڑی میٹھی طبیعت کے ہیں سجاد بھائی۔ آپ بہت خوش ہوں گے ان سے مل کر، ان کی فیملی بہت لوگ، بکیرنگ اور چار منگ۔“

رم کی ہمراہی میں گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو لان میں میجر سجاد اخبار پڑھتے مل گئے بڑے ملے۔

بڑے اچھے وقت پر آئے آپ لوگ۔ چائے بس آنے ہی والی ہے۔ بلکہ لیجیے آہی گئی۔ بھئی دیکھ کر دو کپ اور پٹیلیں اور منگوا لیجیے۔“

ورمغل نے بڑے تجسس سے نظریں اٹھائی تھیں اور پھر جیسے وہ پتھر کے ہو کر رہ گئے۔

بسم اللہ، مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔“ بڑے سہاؤ سے ٹرے میز پر رکھ کر وہ سیدھی ہوئی لے آسانی کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں وہی سادہ، شفاف چہرہ اور بشاش اپنائیت آمیز انداز مدد دیتی تھی۔

”آئی! یہ ہیں ہمارے گیسٹ خاور بھائی، جن کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان ہی کے ہاں لی تھی لاہور میں اور خاور بھائی یہ ہماری نموائی ہیں۔“

آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اس نے ہلکے سے مسکرا کر تانیہ کے مہمان کی طرف دیکھا اور پھر وہ ٹائیپ کو دنگ رہ گئی۔

”ارے خاور تم۔۔۔ آپ۔“

”کیا آپ جانتی ہیں خاور بھائی کو۔“ تانیہ، خاور مغل کی گم سم کیفیت پر کیا کم حیران پریشان تھی جو برا میز شناخت پر حیرت سے بت نہ بنتی۔

”ارے بھئی یہ وہی خاور تو ہیں سجاد! میں نے بتایا تھا نا آپ کو ایم اے کرنے کے لیے جب میں اسے پاکستان آئی تھی تو ان ہی کے ہاں تو ٹھہری تھی بڑے عرصے تک ان کا ساتھ رہا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ خاور پھر تو دوبارہ خوش ہوئی آپ سے مل کر۔ نیا اکثر ذکر کیا کرتی ہیں آپ کا کہ آپ کی فیملی نے ان کا بہت خیال رکھا۔“ میجر سجاد، بیوی کی خوشی پر اس سے زیادہ مسرت کا کر رہے تھے۔

”اور کیسے ہیں سب؟ اماں جی، بلقیس آپا، عمر، اطہر، فریال وغیرہ۔“ وہ بڑی بے تابانی سے ایک کا حال پوچھ رہی تھی۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کیسی ہیں؟ شادی کر لی اور ہمیں بتایا ہی نہیں۔“ خاور مغل بڑی س سے اپنے پتھر کے گرداب سے باہر نکل پائے تھے۔

”بس جلدی میں ہی سب کچھ ہو گیا۔ اس لیے آپ لوگوں کو مطلع نہیں کر سکے۔“

نیا کے بجائے میجر سجاد نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔ ”نیا کہ اور میرے والد صاحب

کی جان پہچان ابونہی میں ہو گئی تھی۔ یہاں آئے تو نیا کواپنے پاس بلالیا۔ ان دنوں ان کی جانب کا رہا تھا۔ جن دنوں ان کی ٹرانسفر ادھر جہلم ہوئی اس زمانے میں ابا جان بہت بیمار تھے۔ وہ مرنے سے میرے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے تھے۔ نیا کی جانب سے رضا مندی کے اظہار کے بعد سادگی سے ہو گیا۔ جو بچ پوچھے تو میں کہوں گا کہ نیا کے روپ میں بابا جان نے مجھے سب سے زیادہ قیمتی اور با تحفہ دے دیا ہے زندگی بھر کے لیے۔“

میر سجاد کے دھیمے پیچیدہ انداز میں بڑی محبت تھی۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات چیت اور دوبارہ ملاقات کے وعدے کے بعد وہ لوگ بالآخر کھڑے ہوئے۔

جب وہ واپس آ رہے تھے تو مغرب کی اذان ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے چلتے ہوئے خاور مغل کے قدموں میں بڑی سنگی تھی۔ چاروں طرف کی فضا ٹھنڈی چاندنی میر بھیگ رہی تھی۔ خشک ہوائ تانہ کے ریشمی ملائم بالوں سے چھیر خائیاں کر رہی تھی۔

”خاور بھائی“ بالآخر ایک جگہ رک کر تانہ نے گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لے کر پکارا۔
 ”تو کہ محبوب مجھے تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ۔“
 ”تو کہ محبوب مجھے تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ۔“

وہ اپنی ہی دھن میں دھیرے دھیرے گنگنا رہے تھے ارد گرد سے بے خبر، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بے گانہ سے ہو کر۔

”ہوں۔“ اس کی پکار پر ان کے قدم ٹھٹکے تھے۔

انہیں پکار تو لیا تھا مگر اب تانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ لفظ کہیں کھو سے گئے تھے۔ کئی عجیب بات ہے یا پھر دنیا بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کی نمونائی خاور مغل کی نیا نگلیں۔ اسے شروع سے ہی نمونائی بہت اچھی لگا کرتی تھیں جب میر سجاد کی دلہن بن کر نئی جہلم آئی تھی۔ ان سے بچی دوستی کرنے کے بعد وہ اکثر دل میں سوچا کرتی تھی بھلا نمونائی سے زیادہ مہربان ہمدرد اور پیاری فطرت کا اور کوئی ہو سکتا ہے؟

خاور مغل کی زبانی ساری کہانی سن کر نیا صدیقی کا روشن کردار اس کے سوچوں کے سمندر میں ایک عرصہ تک بالچل بچا تار ہوا تھا۔ وہ سوچتی بھلا نمونائی زیادہ اچھی ہیں یا نیا صدیقی اور جب وہ فیصلہ نہ کر پا تو جھجکا کر ذہن کو کسی اور سمت لگا لیتی۔ خاور مغل کو نمونائی سے ملانے کے لیے لے جاتے ہوئے بھی اس کے دل میں یہی کشمکش تازہ تھی۔

”کہیں ایسا نہ ہو خاور بھائی ان سے مل کر کہیں۔ نیا تمہاری نمونائی سے کہیں زیادہ اچھی تھی کیونکہ اس کی ایثار پسند فطرت کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

اس کے دل میں کہیں آرزو تھی کہ۔۔۔ نمونائی نیا صدیقی کے مقابلے میں اگر جیتیں تا تو کم از کم اس کے برابر ضرور ہیں۔ اور یہ تو اسے خاور مغل کا چہرہ پڑھ کر ادراک ہوا تھا کہ وہ لڑکی سر تا پا جیت ہی جیتی تھی۔ نیا صدیقی کے روپ میں بھی، نمونائی کے روپ میں بھی میر سجاد کے روپ میں بھی۔

قریبانیاں اور ایثار پسندی دل و روح کے ساتھ ساتھ روپ کو بھی نکھار دیتی ہیں۔ اک نور کا میز مالہ سا بنا دیتی ہیں۔

بے بی۔“ وہ جانتے تھے کہ اس نے کیا کہنے کے لیے پکارا ہے، اس لیے اس کے بولنے کا انتظار وہ ہی مہینے لگے۔

”تمہاری نمونائی سے مل کر میری ایک عرصے کی ذہن میں اب بھی ہوئی تھی سلجھ گئی ہے، میں بے لاہور سے جانے کے بعد اکثر اوقات سوچا کرتا تھا کہ آخر وہ کون سی شش تھی، کون سی بات تھی پنی زندگی کا سب سے بڑا راز ایک چھوٹی سی معصوم لڑکی کے سامنے کھول بیٹھا۔ آخر اس چھوٹی آنے میرے اندر کا بید کیسے پایا؟ کیسے میرے ماضی کے کواڑوں پر لگے رنگ آلود قفل کھول کر لیا۔ اب خبر ہوئی تمہاری باتوں میں، تمہاری گفتگو میں اس کی سوچ کی خوش بوجو شامل ہوئی تھی۔ یہ خیالوں کی اس کی ذات کی مہک مجھے تمہارے طرز کلام میں محسوس ہوتی تھی۔ اس کشش نے مجھے قریب کر دیا۔ یاد کرو ذرا تم بات بات پر نمونائی کا حوالہ دیا کرتی تھیں۔ تم سے باتیں کر کے میں دوسے بہت قریب محسوس کرتا تھا شاید اسی لیے تم سے اتنی جلدی بے تکلفی ہوئی۔ تمہارے مزاج اور بے انداز رہ رہ کر مجھے مانوسیت کا احساس دلاتے تھے۔“

”خاور بھائی!“ ان کے خاموش ہونے پر تانہ نے دھیرے سے انہیں دوبارہ مخاطب کیا۔

”کیا آپ انہیں بتائیں گے کہ آج بھی آپ کے دل میں ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکا۔“

”نہیں۔“ خاور مغل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں اسے خلش میں مبتلا کیوں کروں۔

نے بہت دکھ چھلے ہیں۔ بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ بہت غذا بولنے سے گزرنے کے بعد کھانے اور سکون پایا نصیب ہوئی ہے اسے، میں دبی ہوئی راہ کرید کر اس کی پرسکون زندگی میں زہریلوں گھولوں؟“

”کیا آپ یہ بھی نہیں جانتا جاپہیں گے کہ ان کے دل میں آپ کے لیے کیا جذبات رہے ہیں۔“

ان کے ٹونگ بدلتے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

”نہیں۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں سانس کھینچا۔ ”بے بی کچھ سوال ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر صورتی نوک زباں کے بجائے دل میں رہنے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ زبان پر آجائیں تو اپنا حسن الٹی کھو بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات اسرار بھی فرار کا ذریعہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔

نہ اسے اپنے شوہر اور بچوں کی محبت حاصل ہے۔ میرا دل اس بات پر بہت مطمئن ہے۔ میں کسی طرح ماضی کے کٹی تذکرے سے اس کو اس کا رخ اور کرب ناک ماضی یاد نہیں دلا نا چاہتا۔ اس کو خوش

تلاشتا دکھ کر میرے دل پر بڑی احساس جرم کی سل کچھ ٹھسک گئی ہے۔ بے بی وہ اتنی اچھی ہے کہ کے ساتھ بھی جہاں بھی رہے گی پھول کھلا دے گی۔ شرط یہ کہ کوئی ان پھولوں کا قدر دان بھی ہو،

نا طرح بے قدر نہ ہو۔ اور صد شکر کہ اسے ایسا قدر دان مل گیا ہے وہ خوش ہے۔ میں اس میں خوش

ما۔ سچی محبت کرنے والے سودو زیاں نہیں دیکھتے وہ محبوب کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ آؤ چلیں۔“

گے چل پڑے تھے۔

”تو کہ محبوب مجھے تھا۔ مجھے معلوم ہے یہ۔“

اپنا پسندیدہ مصرعہ گنگنا تے ہوئے۔
اور ست قدموں سے ان کے پیچھے چلتی ہوئی تانیہ کے ذہن میں ان کی سنائی ہوئی نظم کے فقر
چل رہے تھے۔

نمائش کی تحریر سے زندگی کی روایت نبھاتے بہت عمر گزری
بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندارنے
خاموشی کے کفن میں لیٹنا

بس اب راستوں میں، درختوں کی پرچھائیوں کا سندیہ سمجھ لو
وہ دیوار گرتی نظر آ رہی ہے
قربانی لازم ہے زندگی کی غمو کے لیے

ہمدردی اور ایثار پسندی لازم ہے انسانیت کا علم بلند رکھنے کے لیے۔ ہمارا پلے سے کیا جاتا ہے؟
گھڑی رک کر کسی کے دکھ سکھ سن لیں زندگی کو اس قدر خود غرض بھی نہیں بنادینا چاہیے کہ زندگی کا ہمارا
دھڑکنوں کے راگ بھی کانوں تک نہ پہنچ پائیں۔

ہوس زرا اور طلب حسن کے ماسوا بھی ایک شے ہوا کرتی ہے۔ انسان دوستی۔
انہی سوچوں میں گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ بیرونی لائٹس کی روشنی نے ان کے قدموں کو جگمگا
تھا۔ وہ دونوں روشنی سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

کچھ رنگ نئے ہیں

”ایک بھائی کا اپنی بہن کے ساتھ۔۔۔“

اعشاریہ بیس بور کا سیاہ چمکتا ہوا ریوالور اس کی کنپٹی تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا چہرہ جو کبھی چمکتی ہوئی
ن اور خوب صورت مردانہ دلکشی لیے ہوا ہوتا تھا، اس قدر سفید ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کا سارا خون
لیا ہو۔

اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔
مگر مقام حیرت تھا کہ اس کا دایاں ہاتھ بالکل پرسکون اور ساکت تھا اور بڑی دلجمعی کے ساتھ کنپٹی
ریوالور کی نال رکھ کر مناسب زاد یہ تلاش کر رہا تھا پھر وہ نال کو ایک جگہ بنا کر مطمئن ہو گیا۔
اس کی انگلی دھیرے دھیرے ٹرانسنگر کی طرف بڑھی۔

گہری براؤن پینٹ اور کربیم کلر کی شرٹ میں ملبوس خدا کی ودیعت کردہ تمام تر ظاہری آرائشوں
رکشش سے بھرپور وہ اونچا پورا کزیل مرد چتر کا مجسمہ بن کر آخری بار اپنے گرد و پیش کو دیکھ رہا تھا۔
بابا بہت امیر یا رئیس تو نہیں تھے۔ ایک درمیانے درجے کے سرکاری آفیسر تھے۔ ٹھیک ٹھاک
لزارا ہو رہا تھا۔ گھر بھی ملا ہوا تھا اور میڈیکل کی سہولیات بھی میسر تھیں۔ انہیں آفس لانے لے جانے
کے لیے آفس وین آئی تھی۔ لہذا بچوں کو کسی چیز کی تنگی نہیں رہی تھی۔ وہ خوش تھے، مطمئن تھے، ہشاش
بشاش تھے۔

اس نے بابا کے سرکاری گھر کی مہربان اور مانوس دیواروں کو آخری بار دیکھا۔ ٹریگر پر رکھی انگلی کا
دباؤ بڑھتا چلا گیا۔

اسی وقت کسی نے بہت عجلت میں دروازہ کھولا تھا۔

اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔
ریوالور چلنے کی آواز نے پورے گھر کے درود یوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

”کیا عذاب ہے، یہ بچن کا مہین آج پھر بند ہو گیا ہے۔ ہر دوسرے ہفتے یہی بیماری بڑی ہوتی ہے۔ اس گھر میں پائپ لائن ڈالنے والا کسی دن میرے ہاتھ آ جائے ذرا۔ آدھے آدھے انچ کے پائپ فٹ کر رکھے ہیں۔ چار دن نہیں گزرتے اور کٹر بند ہو جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے، میں نیچری چھوڑ کر پلمبری ہی سیکھ لوں اور اوپر سے یہ مسز احسن۔۔۔ بے انگ گیسٹ کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اسے کم دے کر دوبارہ اس کی خبر ہی نہ لو۔ ایک تو محترمہ چھ ماہ تک لندن میں رہتی ہیں وہاں سے واپس آ کر کبھی فلا نے فیٹیول کے لیے فرانس جا رہی ہیں اور بھی ڈھکھانے ایونٹ کے لیے دہلی کے ٹکٹ بک کر بیٹھی ہیں۔ مز تو جب آئے کہ ہر ماہ کرایہ لینا بھی بھول جایا کریں مگر کہاں وہ تو پکا یاد رہتا ہے۔ ہر ماہ پہلی کو ملازمہ دروازہ بجا رہی ہوتی ہیں۔“

شکا کا پارہ بری طرح چڑھا ہوا تھا۔ وہ برتن دھو کر رہی تھی، انہیں شیخ زیادہ رہی تھی۔ ”مس مزنا! ماہر سائیکا لو جسٹ، اسٹوڈنٹس آف ہوٹلنگ میڈیسن اسپیشلائز کورس، ہوٹلنگ میڈیکل سینٹر کے چیف ضرائح حسن کی چیتی کبسنٹنٹ۔ آپ ذرا اٹھ کر تھوڑی سی زحمت کریں گی، کہیں یہ ایک عدول پلیر بلوالیجیے۔“

اب اس کی مخاطب کیس کی فائل میں سر دیے بیٹھی مزنا تھی۔ ”اس سلسلے میں میری معلومات نہایت محدود ہیں۔ بہتر ہوگا تم غزل سے بات کرو۔“ وہ اس وقت کسی گوشہ آرام و عیش میں خلوت میں کسی کے ساتھ ”غزل سرا“ ہوں گی۔ ان کا ڈسٹرب کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔“ شا کے لہجے میں طنز کھل گیا۔

”ویسے مزنا! ایسی لڑکیوں کے بارے میں تمہاری نفسیات اور روحانی طریقہ علاج کیا کہتا ہے؟ اپنی روح کو ایسی گندگی میں تھیں لیتی ہیں۔“ وہ اس کے پاس بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ ”بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں اس کی۔ کہیں تسکین نفس، کہیں پیسے کی کشش، کہیں اپنے وابستہ رشتوں کی مجبوریوں اور کہیں مناسب ذریعہ روزگار حاصل ہونے میں ناکامی پر فزیشن مٹر لڑکیوں کے قدم اس طرف آنکلتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ہمارے ہاں اس کی شرح دوسرے ممالک کا نسبت بہت کم ہے۔“

”کبھی ہوتی ہوگی کم مگر اب تو پیسے اور چمک دمک کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک پار سا خوشی خود کو پیش کر رہی ہیں۔“ شاخنی سے گویا تھی۔

”جب میں اسٹار بن جاؤں گی تو کوئی نہیں پوچھے گا کہ میں نے کسیرہ مین، ڈائریکٹر یا ایکٹر کے ساتھ کتنے رنگین لمحات کیش کرائے ہیں۔“ سرخ کام والی دکتی ہوئی چولی اور گھاکھرے میں ملبوس اپنے قاتل بدن کے تمام شرسامان زاویے نمایاں کرتی غزل ابھی ابھی پچھلے گیسٹ سے کسی فوٹو گرافر کی گاڑی سے اتر کر اندر آئی تھی۔

”تو یہ۔۔۔ اس قدر بے ہودہ کپڑے زیب تن کر کے باہر جاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔“ اسے دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئی تھی۔

”ہمیں اخلاقیات کے سبق نہ پڑھاؤ۔ ہماری دنیا میں اخلاقیات نہیں ہوتی۔“ غزل تلخی سے کراتے ہوئے اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

یہ ایک بہت بڑا ہال نما کمر تھا، جہاں تین بیڈ فاصلے سے سیٹ کیے گئے تھے۔ ہر بیڈ کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبل تھے۔ کارپٹ گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ ہال کمرے کے دائیں جانب کچن تھا اور بائیں طرف باتھ روم۔

وہ ایف مین کی شاندار کونٹری کے پچھلے جانب بنے اس لکڑی گیسٹ روم میں مقیم تھیں۔ ظاہر ہے بچن اور باتھ دونوں ویسٹرن اسٹائل کے اور تمام تر تریش سہولیات سے مزین تھے۔ گیسٹ روم میں اگلے کاراستہ پچھلے گیسٹ سے بنایا گیا تھا تاکہ مالک اور گریہ دار دونوں کی پرائیویسی برقرار رہے۔ گیسٹ روم کا ماہانہ کرایہ آٹھ ہزار تھا جسے پچھلے ڈیڑھ سال سے تینوں شیئر کر رہی تھیں۔

”کیوں کرنی ہو ایسا تم؟“ مزنا نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تو پتا ہے کہ تمہارا بیک گراؤنڈ ایسا ویسا نہیں ہے کہ ”خون کا تقاضا“ سمجھ کر تمہیں تمہارے حال چھوڑ دیا جائے پھر خود کو کیوں گرائی ہو اتنا۔ کیا تم نے اللہ کو جان نہیں دینی؟“

”کون جانے ہم کہاں سے آگے اور کدھر جا کر پھیلیں پھولیں گے۔“ غزل نے اونچا سا قہقہہ لگایا۔ ”اور رہی بات جان کی تو اللہ کو تو ایک ہی بار دیں گے مگر جب تک زندہ ہیں، اس پر دوسروں کا بھی تو حق بنتا ہے۔“ غزل بڑے سکون سے مسکرائی۔

”اے نیک بیبیو! وہ فریج کھول کر بوتل نکالنے لگی۔

”ویسے ایک لحاظ سے تو اچھا ہے تاکہ میرے جیسے مزاج کی لڑکی تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے دیکھ دیکھ کے اور میری حرکتوں پر توبہ توبہ کرتے ہوئے میرے مقابلے میں تمہیں اپنا آپ بہت معتبر، نیک اور شریف لگتا ہے۔“ وہ پھر اونچے سروں میں ہنسی۔ ”دیکھ لو، میں نے مفت میں تمہیں اعلا درجے کا ذہنی سکون اور روحانی فخر عطا کر رکھا ہے۔“ وہ بچن کے سانچے کا مخصوص ساخت کا خوب صورت سا گلاس لے کر آئی تھی اور اب اپنا پسندیدہ مشروب انڈیل کر برف ملا رہی تھی۔

”دیکھیے میڈم! ہم ٹریٹ منٹ کے لیے آئے ہیں، پیسے دیے ہیں، اپنے مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ ہم آپ سے وعظ سننے نہیں آئے۔“ گرے پیٹ شرٹ اور بلیک ٹائی میں ملبوس مرد نے تیز اور چبھتے ہوئے لہجے میں مزنا کو مخاطب کیا تھا۔

”میں بھی مسئلے کا حل ہی بتا رہی ہوں مسٹر سفیان! تقریر کرنے کا شوق تو مجھے بھی کبھی نہیں رہا۔“ وہ نہایت پرسکون آواز میں گویا ہوئی۔

”اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے پیسے ضائع ہو رہے ہیں تو آپ کسی اور سائیکا لو جسٹ سے رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ رہا ہا ہر جانے کا راستہ۔“ مزنا کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ سفیان قدرے کھسیا گیا اور سر کے بالوں میں انگلیاں گھمانے لگا۔

”بات یہ ہے میڈم! کہ ہمیں یہاں ملک کے ایک بہت معروف سرجن نے آپ کی طرف ریفر کیا

پوچھا۔

”لاں ہی تو نہیں کاٹی۔“ مزے نے دل میں سوچا تھا۔ پچھلے پانچ سال سے یہ نام، یہ انجانا سارابطہ اور رشتہ برقرار تھا۔

پانچ سال ہو گئے تھے اسے خوار ہوتے ہوئے زیت کے جنگل میں تنہا بھٹکتے ہوئے مگر وہ جہاں بھی رہی بغیر کسی براہ راست ملاقات یا بات چیت کے وہ اس کی خبر گیری کر رہا تھا۔

وہ جانتی تھی وہ اس کی پروا کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ اسے بھول ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ بھی اس مانچ برس طول اور صبر آزمادمت میں اسے اکٹیل نہیں بھولی تھی۔ وہ بھول سکتی ہی نہیں تھی۔ ان کا اتنا

”سہ کبر سے ہے، اگر آ فارغ ہیں تو ان کے روم میں آ جائیں۔“ ضرار احسن کے بلانے پر وہ

”آئیے!“ ضرار حسن، اساتھ سال کے مارلیش خوش وضع، نہایت دین دار اور اپنے پیشے سے

عشق کی حد تک خلص تھے۔ انہوں نے ہی ہولسٹک میڈیسن میں فرانس سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد

سید پوریو روڈ پر اپنا بیچھونسا سا پتل ھولاھا، جہاں دماں وڈی امراض کے ماہرین کے ساتھ ساتھ روحانہ اور نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر تعینات کیے گئے تھے۔ ادارہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ تھا جس کے کچھ کچھ

مدت میں اپنی بہت اچھی ساکھ بنائی تھی۔

حالت اس درجہ مخدوش ہے کہ وہ کھر سے باہر نکلتا چھوڑ چلی ہیں وہ علاج کے لیے جی ہا پہلے اسے رضامند نہیں۔ آپ ذاتی طور پر ان کے گھر جا کر ان کے ساتھ شیٹن کریں۔ ان کے شوہر میرے کلاسٹرو کے

”اگر آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے سر۔“ گاڑی تو اس کے پاس تھی ہی۔ سو خاموشی سے کار ڈاٹھا کر

ان سے اجازت لے کر نکل آئی۔ یوں بھی اس کے ڈیوٹی آڈر پورے ہو چکے تھے۔

☆☆☆

”اتنی لیٹ آئی ہو آج؟“ مزہ کے ہارن بجانے پر شاگیت کھولنے آئی تھی۔ وہ گاڑی لاک کر پلٹی تو شبانے فکر مند سی سے استفسار کیا۔

”ہاں یار! وہ سرنے ایک ایسی ایمنٹ ذمہ لگادی تھی جسے اس کے گھر جا کر ڈیل کرنا تھا۔“
”مگر تم تو اس قسم کے کیس نہیں لیتیں۔“ دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر آ گئیں۔

”جیسی تو نہیں ہوں مگر سرنے کہا تو مجھ سے انکار نہیں ہوا۔ وہ میرے استاد بھی ہیں اور ایک لحاظ سے۔“

”ایک منٹ۔ سائیکالوجیکل ٹریٹ منٹ میں بعض اوقات ایک ایک ماہ تک سیشن کیے جاتے ہیں۔ یہ کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے کہ زخم بھر گیا تو ڈاکٹر صاحب ہاتھ جھاڑ کے فارغ ہو گئے۔ احساسات

گورنر کرنا اتنا آسان اور تیز رفتار نہیں ہوا کرتا۔ اب یہی مثال لے لیجیے سسٹمک ڈی سینس ٹرانزیشن کا پردس بعض اوقات مہینوں لے لیتا ہے کیونکہ ہفتے میں صرف دو یا تین بار آدھے گھنٹے کا سیشن کیا جاتا

ہے اور آہستہ آہستہ مریض کے فویا یا اینزائی کو کم کیا جاتا ہے۔ اب ایک دم سے تو کچھ نہیں ہوا کرتا نا۔
 ”میری سسٹر کا پراہلم یہ ہے کہ اسے بند جگہوں سے ڈر لگتا ہے۔ لفٹ میں سفر نہیں کر سکتیں۔ ٹیلی

فون بوتھ ایرجنسی میں بھی استعمال نہیں کریں گی۔ حتیٰ کہ باتھ روم جاتے ہوئے بھی خوف زدہ رہتی ہیں۔“

یہ۔ ”اے Clustrophobia کہا جاتا ہے اور اسی کو ختم کرنے کے لیے میں ڈی سینس ٹائزیشن، ایکسٹینک استعمال کر رہی ہوں۔“

”تو پھر آپ صرف ٹیلیفون کی ڈیل کیجیے انہیں۔ اذھر اذھر کے لیے چوڑے لیکچر نہ پلائیے۔ ان کے مسئلہ کا حل انما از اس اڑھنے سے نہیں ملتا والا۔“ وہ نے سروائی سے گویا تھا۔ مزہ نہ بہت گہری نظروں

سے اس کی طرف دیکھا۔

”نماز دل کا سنون ہے۔ بے شک دلوں کو سنون اللہ کو یاد کرنے سے ملتا ہے اور یاد کا سب سے اچھا ذریعہ نماز ہے۔ غالباً اسلام کی یہ تعلیمات اور احادیث آپ کی نظر سے کبھی نہیں گزریں۔ خیر میں سچ سچ ”عالم“ ہوں، مگر سچ کا لہجہ ہرگز آج کو گھڑا نہیں جاتا، کھنکھاتا ہے، آواز آتا ہے، آواز آتا ہے“

حج ”واعظ“ بن کر اُحمر کا ڈراودا لے کر آپ کے مزاج کو بگڑانا نہیں چاہی کیونکہ یہ بایں آپ نے دلچسپی کی نہیں ہیں، البتہ آپ کی سسٹر کو یہ مشورہ ضرور دوں گی کہ جھٹلے مذہبی فریضے کے لیے نہ سہی ٹریٹ کے خلاف یہ سہی نوازیت کے لیے کبھی سے متشدد مخالفت نہ کرے۔

منٹ کی خاطر ہی سہی نماز پڑھ کے دیھیں۔ ان کے منہ میں خیالات، بھڑے ہوئے دل و دماغ اور کسی سوچوں کو کنٹرول نہ مل جائے گا۔ جب اندر کا خوف نکل جائے تو باہر خود بخود عافیت دکھائی دے لگتی ہے پھر

بندہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس نے فلم بند کر کے فائل کے پیپر کے نیچے رکھا اور کرسی کی پشت سے سر نکالیا۔
 ”جی میں کوشش کروں گی، میں دوبارہ کب آؤں؟“ مریض خاتون نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ لیجیے اپنا کارڈ، میں نے تاریخ لکھ دی ہے۔“
 ”اوکے میڈم!“ سفیان کارڈ بہن سے لے کر دیکھتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔ مزمنہ نے ایک

گہری سانس لے کر سر کو اٹگے پیچھے بلایا اور پھر ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر کہنی میز پر ٹکائے کچھ سوچنے لگی۔

”میڈم! آپ کے لیے پھر فون ہے۔“ چپڑا سی نے دروازہ بجا کر اندر آ کر پیغام سنایا۔ وہ باہر

کاؤنٹر پر آگئی، جہاں ٹیلی فون آپریٹر رضوانہ اپنی خوش اخلاقی مسکراہٹ سمیت اس کی منتظر تھی۔
 ”ہیلو“ مزمنہ نے میز پر رکھے ریسیور کو کان سے لگا کر اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے پرسکون انداز

میں مخاطب کیا۔
 ”ہیلو“ اس کے لہجے میں استفہام تھا۔

”ہے۔۔۔ لو۔۔۔“ اب کی بار اس نے زور دے کر پوچھا مگر دوسری جانب بدستور خاموشی طاری

(218)

جائیں۔ نمود و نمائش کے لیے تو این جی او اور دیگر سماجی تنظیموں کے میلے ٹھیلے بہت ہیں، میں نے سمجھایا ہے کہ دولت کے اس بوجھ کو بہت تھوڑا سا اللہ کی مخلوق میں بانٹ کے دیکھیے، آپ کی بوجھل س خود بخود ہلکی ہو جائے گی مگر شرط یہ ہے کہ یہ تقسیم اس طرح ہو کہ دامن میں کوئی خیر نہ رہے۔ دوسری بات یہ کہ جو نعمتیں اللہ نے دے رکھی ہیں، ان کا شکر ادا کریں اور شکر اور ذکر کرنے کا بہترین یہ نماز ہے۔ لہذا نماز قائم کریں۔“

”جواب میں انہوں نے بڑبڑائیں کی؟“ ثناء نے پوچھا۔
”میرے سامنے تو نہیں کی البتہ دل میں ضرور کی ہوگی۔“

”ضرر احسن نے بہت پہلے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ بچپن نماز اس طرح قائم کرتے تھے کہ ان کے والدین نے ان کے ذہن میں ڈال دیا تھا، اگر کوئی نماز چھوڑ گئے تو ضرور تمہارے ساتھ کچھ برا ہو گا یا امتحان میں فیل ہو جاؤ گے یا استاد سے کسی بات پر ڈانٹ کھاؤ گے یا دوست تم سے روٹھ جائیں گے۔ اس لالچ اور خوف کی بنا پر وہ نماز کی پابندی کیا کرتے تھے پھر جوں بڑے ہوتے گئے ان کی یہ سوچ پختہ ہوتی گئی۔ وہ آج بھی اپنے ساتھ ہونے والے ناپسندیدہ نئے کو اس بات سے جوڑتے ہیں کہ آج فلاں نماز نہیں پڑھی یا بے دلی سے پڑھی تھی، اس لیے میرے ساتھ ایسا ہوا۔ اس طرح انسان لاشعوری طور پر اپنے فائدے اور بہتری کے لیے نمازوں کی پابندی رکھتا ہے۔ میں بھی کئی برسوں سے یہی کر رہی ہوں۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

گرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ پارکنگ ایریا میں آکر گاڑی کھول کر اندر بیٹھی تو ایک دم تپش کا احساس ملا تھا۔

”مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ وہ پارکنگ سے گاڑی نکال چکی تھی۔

”اس کو نوں کرنا چاہیے، یہ کہنے کے لیے کہ میرا یہ خاموش خیال کرنا چھوڑ دے۔ سمجھ لے کہ ہم میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ یوں بھی رشتہ کہاں ثابت ہوتا ہے۔ جو سمجھا تھا، وہ سراب نکلا، جھوٹ اور فریب نکلا پھر یہ بے وجہ کا تعاقب اور خبر گیری کیوں؟“

وہ خود سے الجھتے ہوئے بے دھیانی کے عالم میں اسلام آباد ہائی وے پر گاڑی دوڑا رہی تھی۔ عصر کے بعد کا ٹائم تھا۔ بڑا ٹھہرا ٹھہرا، دھیمسا سا اجالا اور نرم و لطیف ہوا بحر طاری کر رہی تھی۔

”وقت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے اطراف میں جلوہ گر ہے پھر مجھ میں صحرا جیسی پیاس اور سناٹا کیوں اتر آیا ہے۔“

اس نے کچھ سوچ کر آئی ایٹ تھری کی طرف گاڑی موڑ دی۔

”علی انکل گھر پر ہیں؟“ اس کے تیل بجانے پر ان کا نوکر باہر آیا تھا۔

”جی اسٹڈی میں ہیں۔“ وہ ان کے اسٹڈی روم ہی چلی آئی۔

”میں بہت پریشان ہوں علی انکل۔“ وہ بغیر کسی تمہید کے سلام دعا کے بعد بولی۔

علی انکل، بابا مرحوم کے گھر سے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کے تمام تر رازوں کے امین

محسن بھی کہ انہوں نے چار سال پہلے ایک قطعی انٹری لڑی کو اپنے ہاں جاب دی جس کا ایم ایس سی سائیکالوجی کا ابھی رزلٹ بھی نہیں نکلا تھا۔ آج چار سال بعد میں اپنے شعبے میں کتنا تجربہ حاصل کر چکی ہوں۔

اسپشلائز کرنے اور ایم فل مکمل کرنے میں بھی ان ہی کا ہاتھ تھا۔ یہ ان ہی کی شفقانہ حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ آج نہ صرف تعلیم اور اچھی پوسٹ حاصل کر چکی ہوں بلکہ ایک عدد گاڑی کی بھی مالک بن چکی ہوں۔“

”ارے بھئی! اتنے برسوں سے کما رہی ہو، کوئی آگے پیچھے تو ہے نہیں جس پہ لگاؤ۔ رقم کو جمع ہی ہونا تھا پھر تم نے جمع شدہ رقم کو گاڑی میں تبدیل کر دیا۔“

”کھانا کیا پکا پیسے۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ مزہ خلاف مزاج بے صبری کا مظاہرہ کر گئی تھی۔
ثنا جلدی آجاتی تھی اسکول سے، اس لیے رات کے کھانے کی ذمہ داری اسی نے اٹھا رکھی تھی۔
رہی غزل تو اس کا موڈ ہوتا تو کھانے میں ہاتھ بنا دیتی، نہیں تو اپنے اوٹ پٹانگ مشغلوں میں مست رہتی۔ ثنا کو ویسے بھی گھر کے کام کاج کا شوق رہا تھا، اس لیے غزل کے عدم تعاون کا گلہ یا غصہ نہیں کرتی تھی۔

”مسالے والی بھنڈی بنائی ہے۔“

ویسے محترمہ کو عارضہ کیا ہے؟“ ثنا اس کے کیمز میں ہمیشہ گہری دلچسپی رکھتی تھی۔

”ڈپریشن۔“ اس نے اختصار سے کام لیا۔

”کس چیز کا۔۔۔؟“

”کچھ نہ کرنے کا ڈپریشن۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ ثناء نے آنکھیں پٹیائیں۔

”اپنے Worth less (بے کار) ہونے کا ڈپریشن۔ ثنا! کام کرتے رہنا ہماری مادی ضرورت

ہی نہیں ہے، ذہنی ضرورت بھی بن چکا ہے۔ انسان جب کوئی کام کر رہا ہوتا ہے تو اسے اپنی اہمیت اور ذات پر اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہنر پر بھروسہ کرنا سیکھتا ہے۔ سچ پوچھو تو مصروفیت اور ہلکی پھلکی پریشانیوں زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنے کے لیے بہت ضروری ہوا کرتی ہیں کیونکہ مسائل سے لڑ کر ہم میں اپنی ذات کا فخر اور مضبوطی جاگتی ہے۔ کام کی ذمہ داری ہو تو ہمیں اپنا آپ معتبر اور کارآمد محسوس ہوتا ہے۔ سز و سیم کو سب کچھ حاصل ہے۔ بے پناہ دولت، پریش حال نما گھر، بے شمار نوکر چاکر اور ہر آسائش پھیلی کے نیچے منتظر پڑی رہتی ہے۔ شوہر دن رات بڑا س بڑھانے میں لگا رہتا ہے۔ نیچے آئے پال پوس کے اس قابل کر دیے کہ انہیں بورڈنگ میں ڈالا جاسکے۔ سو یہ موصوفہ فارغ کی فارغ۔ اتنی فراغت رہے گی تو ذہن تو اچھے لگتا۔ تم نے سنائیں خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ وہ بھی فضول اور بے کار سوچوں میں الجھ کر ذہنی مریض بن گئی ہیں، جسے سائیکالوجی میں ڈپریشن کہا جاتا ہے۔“

”تم نے ان کو کیا مشورہ دیا؟“ ثناء نے ٹھوڑی تھیلی پر ٹکا کے اشتیاق سے پوچھا۔
”کچھ ایسے کام کرنے کو جو صرف اور صرف اللہ کو خوش کرنے اور اس کی مخلوق کی بھلائی کے لیے

بھی رہے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی کے باپ تھے۔ تینوں شادی شدہ تھے لڑکے امریکہ میں سیٹل تھے اور بیٹی کراچی بیابانی گئی تھی۔ بیوی کو چند سال پہلے فالج ہو گیا تھا، سو وہ بستر اور اپنی خادمہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

”کمال ہے، ایک روحانی نفسیات کا معالج بھی پریشان ہو سکتا ہے۔“ وہ ازراہ تفسن چھیڑ خانی کر رہے تھے۔

”جی ہاں کیونکہ وہ بھی انسان ہوتا ہے۔“ وہ خفگی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”اچھا۔۔۔ یہ آج کی تازہ خبر ہے۔ ویسے اس پریشانی کا نام مزہ علی تو نہیں ہے؟“

”بڑی گہرائی تک پہنچ کر کھوج لگایا تھا۔ مزہ اضطرابی انداز میں ابھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”مجھے بھی فون کرتا رہتا ہے وہ۔“ چند لمحوں کے مکمل سکوت کو علی انکل کی سنجیدہ آواز نے توڑا تھا۔

”کیوں؟“ بے اختیار اس نے سراٹھایا۔

”تمہارے بارے میں ہدایات نشر کرنے اور تم سے باخبر رہنے کے لیے۔“ انہوں نے سگار منہ

میں دباتے ہوئے کہا۔

”اور میں پوچھتا ہوں بر خوردار! جب کوئی رشتہ نہیں رہا تو کیوں اتنی دور بیٹھ کے بے تاب رہتے

ہو۔ ویسے تم نے بھی حماقت کی مزہ!“

”نہیں انکل!“ اس نے تڑپ کر کہا۔

”میں سر کر بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ۔۔۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”وہ بات مرینے کی نہیں جینے کی تھی، زندگی گزارنے کا ڈھنگ تھا۔ کسی طرح کی کوئی قانونی و

معاشرتی رکاوٹ نہیں تھی۔ رکاوٹ تمہارے جذبات بنے تھے۔ تم دونوں کے غیر عملی نظریات نے یہ دن

دکھائے۔ کیا کچھ انوکھا ہونے چلا تھا؟ سب کچھ ایسا ہی تھا جو ایسے کیسز میں ہوا کرتا ہے۔ ہو جاتا ہے۔“

”میں آپ سے اپنی پریشانی شیر کرنے آئی تھی، ڈانٹ کھانے نہیں آئی تھی۔“ وہ بسورتے ہوئے

بولی۔

”دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلیں گی۔ اس وقت میرے ساتھ کچن تک چلو، میں نے ایک بڑی

مزے دار ڈش بنائی ہے۔ یہ نہایت خوش گوار اتفاق ہے کہ تم ادھر چلی آئیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کھانا بنانے اور اس میں ورائٹی لانے میں علی انکل کو کمال حاصل تھا۔ آئے دن نت نئے تجربے

کرتے رہتے تھے۔

”بات یہ ہے بیٹا جانی کہ!

یہ زندگی ہے تو پھر اس کو بسر بھی کرنا ہے

قیام کرنے سے پہلے سفر بھی کرنا ہے

کچھ احترام بھی کرنا ہے اس گلی سے ہمیں

کسی بہانے ادھر سے گزر بھی کرنا ہے

وہ بھی بھی کر رہا ہے اور تم بھی۔ حالانکہ دونوں ہی یہ بات سمجھتے ہو کہ یہ تعلق ٹوٹنے والا نہیں ہے۔

س کا کوئی انجام ہونا چاہیے۔“ وہ شیشے کا باؤل فریج سے نکال رہے تھے۔

”یہ کیا ملغوبہ ہے؟“ اس نے پنک کریمی سے آمیزے کو شوق سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”بد ذوق لڑکی! یہ فروٹ ٹرائفل ہے اور میری ہاتھ کی وہ اسٹیشل چیز ہے جسے ہر کوئی پسند کرتا ہے اور

مان آتے ہیں، ضرور اس کی فرمائش کرتے ہیں۔“

وہ چھوٹی سی شیشے کی خوب صورت پیالی میں ٹرائفل نکالنے لگے۔

”بتایا کیسے ہے؟“ اس نے چکھا تو بے اختیار پوچھ لیا۔

”تمہیں پسند آیا؟“ وہ خوش ہو گئے۔

”بہت بڑی لذیذ چیز ہے۔ اس میں سیب، کیلا اور انار ڈالے ہیں نا۔“

”ہاں۔“ پھر وہ اسے مکمل ترکیب سمجھانے لگے۔

”یہ تو بہت آسان ترکیب ہے۔ میں بھی ٹرائی کروں گی۔“ شاکو بتاؤں گی۔ اسے فارغ وقت میں

ربات کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔“

”یہ شادی لڑکی ہے نا جس کی اپنے خاندان سے علیحدگی ہو گئی ہے؟“ وہ علی انکل سے ہر بات ڈسکس

رہتی تھی۔ یہ بھی اسی نے بتایا تھا۔

”جی انکل! آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں جس کے پاس جاتی یا رہتی۔ زندگی گزارنے کے لیے کوئی

مکان نہ تو چاہیے تھا۔ کیا آنٹی نے ٹرائفل چکھا ہے؟“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں انہیں دے آتی ہوں اور مل بھی لیتی ہوں۔ اس کے بعد واپس چلوں گی۔“

”ذرا دیر تو رکو۔۔۔“

”نہیں، شاکا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس نے اسکول سے بھی چھٹی کی ہے آج۔ غزل تورات کو دیر

سے آئے گی۔ شاکا کیلی ہوگی۔“ وہ اس کی تیمارداری کے خیال سے غلٹ میں وہاں سے نکلی تھی۔ گھر آئی تو

شاکا بخار سے تپ رہی تھی۔

”ارے، تمہیں تو اچھا خاصا ٹیپر پچر ہو رہا ہے۔“ وہ قہر مایہ میٹر چیک کرنے کے بعد پریشان ہو کر شاکا

کو دیکھنے لگی۔

”ہم جیسوں کو نزلہ بخار کیا کہتا ہے مزہ بی بی!“ شاکا مت کر کے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا

کے بیٹھ گئی۔

”دو پینا ڈول کھائی ہیں، چائے تم پلا دو۔ دو تین گھنٹوں میں پسینہ آجائے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔

ہم تو عادی ہیں ایسی معمولی بیماریوں کے۔“ وہ نقاہت سے بولی۔

”تمہیں پتا ہے مزہ! جب میری اور ایاز کی شادی ہوئی تو اس وقت میرے کیا خواب تھے؟ ایک

پرسکون اور پیار بھرا گھر، مناسب سہولتیں، ذمہ داری نبھا کر سکون کی بے فکر نیندیں اور رشتوں کا تحفظ۔ تم

تو جانتی ہو میری اور ایاز کی لومیرج تھی۔ اچھا یہ ہوا کہ والدین بھی مان گئے۔ یوں شادی ہو گئی۔ بے انتہا

خوشیوں اور خواہشوں کے جھرمٹ میں۔“

وہ ماضی کے مرغزاروں میں اترنے لگی۔

”جانتی ہو پھر کیا ہوا؟“

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ تم خواخواہ اپنا دماغ نہ الجھاؤ۔ چلو شایاش لیٹ جاؤ۔۔۔“ مزنہ چاہتی تھی وہ ماضی کی نتخیاں یاد کر کے خود کو کھلی نہ کرے لیکن وہ کہیں اور جا پہنچی تھی۔ اس کی نظریں خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بکھرے ہوئے بالوں کی لٹیں گلے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ وہ ملگجے سے سبز شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ سانولا چہرہ اس وقت بڑا پھیکا اور بے رنگ ہو رہا تھا۔

”پھر میرے ہوا کہ ایک ایک کر کے ایاز کے چہرے کے سارے نقاب اتر گئے۔ میں سمجھتی تھی وہ بہت حساس، محتاتی اور ذمہ دار مرد ہے۔ ایک عورت ایسے ہی بھرپور مرد کے خواب دیکھتی ہے۔ لیکن وہ تو کچھ اور ہی نکلا۔ دنوں میں اس کی حساسیت بے حس میں بدل گئی۔ اس کا سختی پن، کابلی و آرام طلبی کے روپ میں ڈھل گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ مرد عورت کے دل شکار کرنے کے لیے بڑی ہوشیاری سے اس کی پسند کا چولا پہنتا ہے۔

پھر جب اس عورت کو حاصل کر لیتا ہے تو اپنے اصلی رنگ ڈھنگ میں آجاتا ہے۔ عورت سمجھتی ہے مرد بدل گیا ہے۔ حالانکہ وہ بدلتا نہیں ہے۔ اپنے اصل سے واپس لوٹتا ہے۔“ وہ خنکی سے ہنسی۔

”سسرال والوں نے اس پر دباؤ ڈالا تمہاری نوکری تو چھٹ گئی ہے مگر تمہاری یہ ایم اے پاس بیوی کس دن کام آئے گی۔ اس سے کہو نوکری کرے۔ سو میں نے نوکری کر لی۔ کیونکہ ایاز پر ماں باپ کے علاوہ تین جوان، بہنوں اور چار بھائیوں کی ذمہ داری تھی۔ میں نے اس اسکول میں نوکری کی جہاں دو شفٹیں لگتی تھیں۔ صبح اور شام کی۔ زیادہ کمائے کے چکر میں میں نے دونوں شفٹوں میں جاب کر لی۔ تنخواہ گنی ہو گئی۔ ایاز جو عارضی طور پر چھوٹی موٹی نوکری کر رہا تھا وہ مزید ریلیکس ہو گیا۔ بس ہوا یوں کہ میری جان شکنجے میں آگئی۔ ایسی حالت میں عورت کا جی اور سا ہو جاتا ہے۔ خواخواہ بھگتی ہے۔ ذہنی و جسمانی طور پر کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایک طرف دو شفٹوں کی لمبی ڈیوٹی پھر گھر آکر ایاز کی جلی جلی اور سسرالیوں کے طعنے کہ صبح سات بجے نکلتی ہے رات کے سات بجے گھر میں قدم رکھتی ہے۔ گھر کا کچھ ہوش ہی نہیں ہے۔ حالانکہ میں واپس آکر جتنا مجھ سے ہوتا تھا گھر کے کام نبھاتی تھی۔ اکثر رات کو دیر تک ڈسٹنک، واشنگ اور برتن جھاڑو وغیرہ کے کام نبھانے کے بستر پہ آتی تھی۔

چلو سسرالی کہیں تو دکھ نہیں ہوتا، مگر اپنا خاندان ہی اپنی ذمہ داریاں نہ سمجھے تو کس کو کہیں۔ بعض اوقات پوری پوری رات ہماری بحث و مباحثے میں گزر جاتی تھی۔ تنخواہ آتی تو میں اسے سو نکھے بغیر ایاز کی ہتھیلی پہ رکھ دیتی تھی۔ مگر پھر بھی میرا مقام اس گھر میں ایسا تھا جیسے کوئی بے کار استعمال شدہ پیٹا ہوا کپڑا، خاوند سمجھتا تھا گویا میں عیاشی کر کے آئی ہوں باہر سے۔ نتیجہ اس ٹینشن کا یہ ہوا کہ وقت سے پہلے میرے ہاں بچے کی ولادت ہو گئی مگر وہ زندہ نہ بن سکا اور پھر کچھ ایسی پیچیدگی ہوئی کہ میں دوبارہ ماں بننے کے قابل نہ رہی۔“

”ہاں، ہاں سب جانتی ہوں میں۔ کیوں یاد کر کر کے اپنے زخم کریدتی ہو۔ اچھا کہو تو نی دی لگا دوں؟“ مزنہ اس کا دھیان بنانا چاہتی تھی۔

”ڈیڑھ سال مزید گزرا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایاز کا دہائی کا دیزالگ گیا۔ میں نے سارا زور بچ

کے ٹکٹ ویزے کے پیسے پورے کیے۔ وہ دہائی چلا گیا۔ میں پیچھے اپنے سسرال کو پالتی رہی۔ ایاز کا کام جم گیا اور گھر میں پیسے آنے لگے تو میں نے ارادہ کیا کہ اب یہ ڈبل شفٹ کا کام چھوڑ کر میرے ساس سسرنا راض ہونے لگے۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ اب مجھ سے اتنی مشقت نہیں ہوتی تھی۔ ایاز اچھی خاصی رقم بھیجتا تھا جو گزارہ کرنے کے لیے بہت کافی تھی اس لیے میں نے دوسری لی جاب چھوڑ دی۔“ وہ سانس لینے کو رکھی۔

مزنہ متاسفانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کچھ ہی عرصہ بعد اطلاع آگئی کہ ایاز نے دہائی میں کسی پاکستانی فیملی میں شادی کر لی تھی۔ وہ پس آیا تو اس حسینہ کو ساتھ لے کے آیا اور اپنے والدین کے کہنے پر مجھے طلاق دے کر فارغ کر دیا۔ اب میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے کہا ”تم بانجھ ہو۔ اولاد تو تم سے ہو نہیں سکتی پھر اب باندھنے کا فائدہ۔“ یوں میں چار سال بعد طلاق کا ٹیکہ ماتھے پہ سجائے اس گھر سے نکل آئی۔ ماں ہاتھ ہٹا کر چلا گیا۔ گھر کرائے کا تھا۔ کس کے پاس جاتی سوا دھڑ چلی آئی۔ نوکری تو شکر ہے جاری۔ ہاں دوبارہ سے سیکنڈ شفٹ بھی جوائن کر لی۔ جتنی فرصت ملتی دکھاتے ہی دل کو چھیدتے تھے اس۔۔۔“ شاتھک کر چپ ہو گئی۔

مزنہ نے ٹی وی لگا دیا تھا۔ کوئی دلچسپ سا ڈرامہ آرہا تھا جسے دنوں عدم دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔ ”بعض اوقات کسی بھی چیز میں دل نہیں لگتا۔ ہے نا؟“ شتا نے دوبارہ مزنہ کو مخاطب کیا۔ ”کوئی ہکوئی منظور دل پہ چھائی یاسیت اور مایوسی کو دور نہیں کر پاتا۔“

”اگر تم پسند کر دو تو میں تمہارے لیے گرم گرم سویاں بنا دوں؟ تمہاری طبیعت ایک دم سنبھل جائے۔“

وہ جان بوجھ کر اس موضوع پر دھیان نہیں دے رہی تھی تاکہ شتا مزید بددلی اور رنجیدگی کا شکار نہ

”مرضی ہے تمہاری، میرے نزدیک تو یہ خواخواہ کا تکلف ہو گا۔ میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔“ ”میرے ہاتھ کی بنی سوتیاں کھاؤ گی تو خود بخود جی چاہنے لگے گا۔“ مزنہ اٹھ کے کچن میں چلی گئی۔ سویاں بنانے لائی تو غزل بھی آچکی تھی۔ اس کی اور شتا کی نوک جھونک حسب معمول عروج پر تھی۔ ”کیوں خواخواہ ٹکے ٹکے کے لوگوں کے آگے اپنا آپ گردی رکھتی ہو۔ اپنی عزت نفس کو ان کے زور قدموں کے نیچے پکڑاؤ گی۔“ مزنہ نے غزل سے کہا۔

غزل کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

”سال ڈیڑھ سال ہونے لگا ہے، تمہیں ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو میں رولتے اور بے دل ہوتے ہوئے۔ کیا حاصل ہوا ہے بھلا۔“ شتا آج اسے کھری کھری سنانے پر تلی ہوئی تھی۔

”تم دونوں مل کر کیوں مجھے ذہنی مار چرکتی رہتی ہو۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھنے لگی۔

میک اپ کی تہوں کے پیچھے کچھ چھپ رہا تھا۔

”ہونہہ خلیس۔۔۔ خواخواہ چڑیلوں کی طرح میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں دونوں۔“ وہ بڑبڑاتے

ہوئے ٹیپ آن کرنے لگی۔
”ہر کام کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“ مزہ نہایت غور سے غزل کو تیز میوزک پر قہقہہ پرکیش کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”میرے کسی فعل کی کوئی وجہ نہیں ہوا کرتی۔“
غزل تھک گئی تو کیسٹ بند کر کے دھم سے اس کے پاس آگری۔
”تم اپنے سوتیلے باپ کی مذموم حرکت کا انتقام خود سے لے رہی ہو۔“ مزہ نے آہستگی سے کہا۔
غزل کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے کانپتے ہاتھوں کے ناخن چبانے لگی۔

”مت یاد دلاؤ مجھے کچھ بھی۔“ اس کی آواز مرتعش تھی۔
”مجھے بھی نہیں پتا تھا، مجھے تمہاری زبانی پتا چلا سب کچھ۔“
”کب۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا پتا چلا۔۔۔“ وہ اس سے رخ پھیر کر پوچھنے لگی۔
”کل تم رات کو اپنے لاشعور میں بھٹک گئی تھیں۔ اسی دوران تم نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں انکشافات کیے۔“

”کیا انکشافات کیے میں نے؟“ وہ بری طرح گھبرا گئی۔
حیرت کی بات یہ تھی کہ اپنے غیر شرعی اور غیر اخلاقی افعال پر فخر اور ڈھٹائی سے ہنسنے والی لڑکی اپنے ماضی کے اس شرم ناک حادثے پر نظر نہیں ملتا رہی تھی۔ جس میں اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔

”تم نے بتایا کہ تمہاری ماں نے دوسری شادی جس آدمی سے کی تھی وہ پرلے درجے کا عیاش اور شرابی انسان تھا۔ تمہاری امی کو بھی شادی کے بعد ہی پتا چلا۔ پھر ایک حادثے میں تمہاری امی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تم سینکڑا ایئر میں تھیں۔ تمہارے سوتیلے باپ نے ایک دن شراب کے نشے میں دھت کر تمہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنالیا۔ اس حادثے نے تمہیں ذہنی و روحانی طور پر تباہ کر دیا تم کئی ہفتے ہسپتال میں رہیں پھر صحت یاب ہوئے ہی سوتیلے باپ کا گھر چھوڑ کر دارالامان چلی گئیں اور وہاں جا کر تمہیں ایسے بہت سے سوتیلے باپ ٹکرائے جن کو ادارے کے مالکان کے حکم اور زور و بردستی پر تمہیں خوش کر پڑا۔ پھر کافی جدوجہد کے بعد ایک ٹریولنگ ایجنسی میں نوکری حاصل کی اور پھر دارالامان چھوڑ دیا۔ یہاں کرایہ پر رہنے لگیں۔ پھر جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تم نے اس کا انتقام خود سے لینا شروع کر دیا۔

غزل! پہلی بار ظلم معاشرے کے افراد نے تم پر کیا اور اس کے بعد متواتر ظلم تم کو اپنے وجود اور روح پر کر رہی ہو۔ ماضی کے بھانک اور اذیت ناک پرچھائیوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ طریقہ سراسر اور گناہ ہے۔ ہم نے بھی اپنا ماضی پھولوں کے بستر پر نہیں گزارا۔ جانے کون کون سے پل صراط عبور کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ راستے کی مشکلات کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انہیں دور کرنے کی بجائے راہ ہی بدل لیا جائے۔ سیدھی پڑی چھوڑ کے پیچھتاوے کی ٹرین پکڑ لی جائے۔

”تمہارا مطلب ہے وہاں رہ کر ان کی مرضی سے اپنا آپ فردخت کرتی رہتی؟“ وہ سرخ چہرہ آگ برساتا لہجہ لیے مزہ کی طرف پلٹی تھی۔

نہیں۔۔۔ تم ان کے چنگل سے آزاد ہو کر یہاں رہ کر ایک شریفانہ اور باوقار زندگی کا آغاز اس غلاظت میں نہ دھنستیں۔“

مگر کس برتے پر؟“ استہزاء بولی۔
”ٹریولنگ ایجنسی میں مجھے نوکری میری اعلیٰ تعلیمی اسناد کی بنا پر نہیں ملی تھی، مالکان کو بھانپنے اور ادائیں دکھانے پر ملی۔ وگرنہ ایف اے پاس لڑکی جاب کے میدان میں کس جگہ فٹ بیٹھتی بی جانتی ہو۔“

”یہ ضروری تو نہیں تھا کہ تم کسی آفس میں ہی جاب کرتیں۔ کوئی اسکول دیکھ لیتیں۔“
”ہاں اور وہاں سے ملنے والے اٹھارہ سو یا زیادہ سے زیادہ دو ہزار میرے لیے بہت کافی رہتے۔“
خیز انداز میں سر ہلانے لگی۔

”ڈھائی ہزار تو اس جگہ رہنے کا کرایہ ہے۔ پھر کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، اور ہزار ضروریات زندگی یہاں سے پوری ہوتیں۔“

”تم اپنے گناہ کو جائز فعل قرار دینے کے لیے فضول دلیلیں دے رہے ہو۔ اگر خواہ کم ملتی تو تم کسی نے موٹے علاقے میں رہائش پذیر ہو جاتیں۔ جہاں کرایہ بھی کم ہوتا پھر بتدریج بی اے کر کے کسی سکول میں ایلائی کر دیتیں۔“

”ہاں تمہاری جیسی مصلح اعظم کے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے۔۔۔“ وہ تلخی سے بولی۔
”خود پیہ پتی ہوتی تو پتا چلتا۔“

”خود پر تو جانے کیا کیا بیت چکی ہے۔ اب میں تم سے کیا بحث کر دوں۔“ مزہ کے چہرے پر ایک سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر معدوم ہو گئی۔

”بہر حال تو بے کار آٹھ بند ہونے سے پہلے تک ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔“
”کون سا وقت؟ میرے لیے اب کوئی وقت نہیں ہے۔“ وہ یاسیت سے گویا ہوئی۔

”بے عصمت اور بے نام و نشان لڑکی ہوں۔ مشہور زمانہ ہو چکی ہوں۔ اپنا قیمتی سرمایہ پانی کی بے دریغ بہا چکی ہوں۔ اب اس معاشرے میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں بچی۔ مجھے خواہ وہ کسے سے نہ دو۔۔۔“ اس کے لہجے کی شکستہ سی اس کے اندر کی توڑ پھوڑ عیاں کر رہی تھی۔

”مگر جبکہ تو وہ بھی تمہارے لیے نہیں ہے، جہاں جا کر تم اپنا آپ خوار کرتی ہو۔ اس اندھیر نگری کا پھوڑ دو۔ اس میں تمہارے بھلائی ہے۔“

مزہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔
”میری بھلائی تو کسی چیز میں بھی نہیں رہی بھولی لڑکی۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔

”میری فلاخ کے راستے تو کب کے بند ہو چکے۔ بہر حال اس لا حاصل بحث کو جانے دو۔ ثنائی کی گروسی کا سامان لانا ہے۔ گاڑی تو ہے تمہارے پاس چلو چلتے ہیں۔ مجھے اپنے لیے کچھ ڈریسز دیکھنے ہیں، بلکہ تم لوگوں پہ کچھ فیاضی کرتے ہوئے میں ”ٹریپرز“ سے ہلکا بھلکا ڈرنج بھی بیک کرالوں۔“

رحماد میری دو شرطیں ہیں۔ ایک تو وہ صرف چند دنوں یا ہفتوں کا ہو۔ دوسرا جس کے بارے یقین ہو کہ وہ شریف ماں باپ کا خون ہے، اور اس کے ماں باپ یا والی وارث اس دنیا میں ہے ہوں مجھے وہی بچہ چاہیے جو میری شرائط پر پورا اترتا ہو۔“

ایک ہے۔ میں علی سے بھی مشورہ کروں گا۔ اسی نے مجھے یہ حل بتایا تھا۔“

بالآخر ایڈمی ہوم میں انہیں مطلوبہ بچہ مل گیا۔ مگر وہ چھوٹی سی تھی سی پری تھی۔ ایک سینڈ میں ماں باپ ہلاک ہو گئے، بچی معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ دس دن تک ماں باپ سر خانے میں پڑی رہیں اخبار میں ان کے آئی ڈی کارڈ بھی چھاپے گئے مگر کوئی پوچھے نہیں آیا۔ سمجھ کر دفنا دیے گئے۔ کچی کچھ دن پہلے ہمارے پاس آئی ہے۔ اس کی عمر اندازاً تین مہینے غلامیہ کے سربراہ نے آگاہ کیا۔

رئی نے نازک سے نقش و نگار والی اس گلابی گل گوتھنا سی بچی کو دیکھا تو اس کا جی قابو میں نہ رہا۔ دین اٹھا کے سینے سے لگا لیا۔

سریہ بچہ کسی طرح نہیں بہل رہا۔“ آیا ڈھائی سالہ دکش صورت اور سنجیدہ تاثرات کے حامل ایک وقتاً سے عاجز ہو کر اندر آئی تھی۔ بچے کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

’ہر طرح سے کوشش کر لی ہے مگر اس کا ردنا ختم نہیں ہو رہا۔“ آیا تفصیل سے اپنا دکھنا سنا رہی ’کون ہے یہ۔۔۔‘ حماد بہت غور سے اس کو دیکھ رہے تھے۔

’جناب پچھلے ہفتے پنڈی میں بم دھماکا ہوا تھا۔ بچہ کار میں تھا۔ جو کہ اس شاپنگ ایریا سے کافی دور لگتی تھی۔ اس لیے بچہ گیا۔ اس کا باپ اور ایک دوسرا لوگ اس دھماکے میں ختم ہو گئے۔ ماں تو اب ہی انتقال کر گئی تھی۔ باپ بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ یہ بہت سہا ہوا ہے۔“

’اسرئی غور سے دیکھو تو ذرا۔‘ حماد جیسے خواب میں بول رہے تھے۔ ”کتنا پیارا اور من موہنا چہرہ

”اس کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں حماد!“ اسرئی ان کی بیوی تھی کیسے خاندان کی سوچ نہ پڑھتی۔ بے وہ بھی ہو گئی تھی۔

”ٹھیک تو ہے نا ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ ہمارے دو بچے ہو جائیں گے، فیملی مکمل ہو جائے گی۔“ وہ لڑھکی۔

”اللہ آپ کو آپ کے نیک ارادوں کی جزا دے۔“

انتظامی سربراہ نے مختلف سپر زپر سائن لینے کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔ گھر میں بچے کیا آئے جیسے درو دیوار سے رونقیں، چہکریں اور زندگی کے تمام رنگ پھوٹنے

ان کو ذرا سی تکلیف ہوتی تو وہ ہلکان ہو جاتی تھی۔ کبھی تھک جاتی تو حماد سے شکایتیں کرتی۔

مزمنہ سر ہلاتے ہوئے گاڑی کی چابیاں ڈھونڈنے لگی۔

غزل بیگم جو شاپنگ کے لیے لور لور پھرنا شروع ہوئی تھیں تو مزمنہ کو بری طرح تھکا مارا۔

”یار خدا کا واسطہ ہے جلدی میٹھو جو لینا ہے کرنا ہے جلدی کرو۔ کون سی خاص چیز ڈھونڈ رہی ہو؟ مل کے نہیں دے رہی۔“

وہ آخر میں تقریباً برس پڑی۔ غزل کئی اور طرف متوجہ تھی۔

”اے مزمنہ! ذرا اس پینڈم کی طرف دیکھو۔ یار یہ کیا غضب کا آدمی ہے۔ کیا ڈریسنگ ہے۔ او چہرے پہ کیسی بے نیازی اور رعب دار ہے۔ میں تو گئی مزمنہ۔۔۔!“

وہ اتنی دیر سے ایک ٹک دیکھ رہی تھی تو مجبوراً مزمنہ کو بھی دیکھنا پڑا۔

دیکھتے ہی اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔

”مزمنہ علی!“ اس کے لب بے آواز متحرک ہوئے تھے۔ وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

پھر وہ اچانک مڑا اور تیز تیز چلتا ہوا دوسرے بلازے میں کہیں غائب ہو گیا۔

غزل اپنی دنیا میں گم تھی وہ اس کے چہرے کا تغیر محسوس نہیں کر سکتی۔ مگر مزمنہ کے لیے ایک قد آگے اٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل کھینٹتے ہوئے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

اس کے قدم آگے اور ذہن پیچھے بہت پیچھے جا رہا تھا۔ وہاں جہاں ایک حماد اور ایک اسرئی کرتے تھے۔

☆☆☆

”تمہاری خوشی کے لیے میں کیا کروں میری جان! کہو تو جان دے دوں۔“

حماد بہت دھکی ہو کر اسرئی کے گلابی رخساروں پر چپکتے موٹی جیسے آنسوؤں کو پونچھ رہے تھے۔

”خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔“ اسرئی نے تڑپ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

”بس کہیں سے مجھے صبر لا دیں حماد! بہت بڑا خسارہ ہوا ہے میرا۔ مجھے قرآن نہیں آرہا ہے۔ دل آ

بھی چہرے سے نہیں بہلتا حماد! میں کیا کروں۔ بتائیں کہاں جاؤں۔ یہ سونا آنگن، یہ دل دہلا دینے وا

خاموشی، یہ سرد سپاٹ دیواریں، یہ تنہائی، یہ سب مل کر میری جان لے لیں گے ایک دن۔ زندگی ہر را

ایک جیسی لگتی ہے۔ پھر ایک سی شامیں، ایک سی راتیں، میرا دل گھٹ جائے گا اس گہری کالی تنہائی میں۔

حماد اسے روتا دیکھ کر بری طرح بے چین ہو رہے تھے۔ وہ بہت محبت کرنے والے صابر و قانع

کے شوہر واقع ہوئے تھے، شادی کو نو سال بیت چکے تھے مگر آنگن ہنوز خالی تھا، اب تو امیدیں بھی ا

توڑتی جا رہی تھیں۔

”پھر اس کا ایک ہی حل نکلتا ہے اگر تم آمادہ ہو تو۔۔۔“ بہت سوچ سمجھ کر حماد نے اسرئی سے ا

موضوع پر بات کرنے کی ٹھانی تھی۔

”ہم کوئی بچہ گود لے لیتے ہیں۔“

”لے پاگ۔۔۔“ ایک لمحے کو اسرئی کی سونی ممتا کی کوکھ سے ہوک سی اٹھی لیکن پھر اس نے خوا

سنجبال لیا۔

”افوہ، تھکا مارا ہے آپ کے لاڈلوں نے۔ حمزہ اپنا ہوم ورک نہیں کر رہا۔ اور مزہ صلیب بھرنے
کہ وہ ان کی کاپی پر اپنے گل بوٹے بنا لیں گی۔ ابھی صرف دس ماہ کی ہیں اور گھٹنوں کے بل کھڑکی
حمزہ کے پاس پہنچ جاتی ہیں اور وہ کام چھوڑ کر اس سے کھیلنے میں مگن ہو جاتا ہے۔“

”ماشاء اللہ بہت پیار کرتا ہے اپنی بہن سے۔“ حماد محبت سے کہتے۔
”کس ماں کا بیٹا ہے۔“ اسری خیر یہ کہتی اور حماد بے ساختہ تہہ لگانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔
دونوں میاں بیوی نے بچوں کی تربیت اتنی اچھی کی تھی کہ لوگ رشک کرتے تھے۔ مزہ، حماد،
تین کلاس پیچھے تھی مگر پڑھے دونوں ایک ہی اسکول سے تھے۔ دونوں نے ہمیشہ فرسٹ کلاس فر
پوزیشن لی۔

بچوں کے باشعور ہونے پر اسری اور حماد نے انہیں یہ بتانے میں حرج نہیں سمجھا تھا کہ وہ ان
حقیقی اولاد نہیں تھے بلکہ ایک ادارے سے لائے گئے تھے مگر تب تک مزہ اور حمزہ کی شخصیات اتنی مضبوط
اور پراعتاد بنیادوں پر کھڑی ہو چکی تھیں کہ انہیں کوئی خاص جذباتی دھچکا نہیں لگا۔ تھوڑا سا دکھ اور جھو
فطری تھی مگر بہر حال انہیں کسی شدید ذہنی توڑ پھوڑ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”امی! مزہ ایم ایس سی میں آگئی ہے۔ اب آپ اس کی شادی کی فکر کریں۔“ حمزہ کے انداز میں
بڑے بھائیوں والی فکر مندی اور احساس ذمہ داری تھا۔ وہ ماسٹر مکمل کرنے کے بعد دو سال پہلے ایک
بہت اچھی جگہ جاب حاصل کر چکا تھا۔ دونوں بچے جوان ہو کر ایسے گھرے تھے کہ دونوں میاں بیوی ا
کی نظر اتارنے نہیں تھکتے تھے۔

”سچ پوچھو تو بیٹے! میرا دل ہی نہیں چاہتا اسے خود سے دور کرنے کو۔“ انہوں نے مزہ کے دل
سراپے کو دیکھتے ہوئے اداسی سے کہا۔

”خبردار بھائی! چیئنگ کرنے یا لگائی بھجائی کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ آپ مجھ سے تین
سال بڑے ہیں اس لیے پہلے آپ کی ہوگی۔“

”خوانخواہ۔۔۔“ حمزہ نے ہمیشہ کی طرح اسے ستایا۔

”پہلے میں اپنی ہونے والی کے لیے میدان صاف کروں گا پھر لاؤں گا اس بیوٹی کو مین کو۔۔۔“

”اچھا امی! ایک کام کرتے ہیں۔ میرے ”ہونے والے“ کو آپ اس گھر میں رکھ لیں۔ اس طر
مجھے آپ سے دور بھی نہیں جانا پڑے گا اور۔۔۔“ مزہ نے شرارت سے حمزہ کو دیکھا، ”اور لوگوں کی کوئی
کے سینے پر مونگ دلنے کا موقع بھی مل جائے گا۔“

”شرم کرو، مشرقی لڑکیاں اپنے منہ سے اپنے ہونے والے کا نام نہیں لیتی ہیں۔“ حمزہ نے بہ
کے لائے خوب صورت بالوں کو کھینچا تھا۔

”بھائی! پہلے بھابھی آئے گی سن لیجیے۔“ وہ لاڈ سے پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ج
ہوئی تھی کہ مسز علی چلی آئیں۔

انہوں نے قدرے ناگواری سے یہ نظارہ دیکھا تھا مگر اس وقت کچھ نہیں بولیں۔

وہ ادھر ادھر ہوئے تو بہت خشکی سے اسری کا گھبراؤ کیا۔ یہ کیا ماجس اور تیلی کا کھیل شروع کر رہا

”اسے حماقت ہی قرار دیا جاسکتا ہے کہ آپ ایک ساتھ دو مختلف گھرانوں کے بچے بہن بھائی بنا کر اڈاپٹ کر لیں۔ بہر حال ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اور حماد بھائی طریقے سے دونوں بچوں کو حقیقت بتا دو تاکہ وہ احتیاط اور فاصلہ برقرار رکھیں۔“ اسری ٹرپ کر رہ گئی۔

”میں مزہ جاؤں گی اس سے پہلے۔“ وہ تو یہ سوچ کے ہی لرز رہی تھی کہ وہ مزہ اور حمزہ کو اس تلخ حقیقت سے کیسے آشنا کرے گی۔

”نہ صرف بتاؤ بلکہ دنیاوی مسائل سے حل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم دونوں کی آپس میں شادی کر دو۔ نہ بیٹی کی جدائی برداشت کرنی پڑے گی نہ بیٹا کسی دوسری عورت کو سونپنا پڑے گا۔“

”خدا کے لیے، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“ اسری ہول کر رہ گئی۔

”بچے اپنی جان دے دیں گے۔ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور حمزہ، حمزہ کو میں جانتی ہوں وہ بطور بھائی کے مزہ سے اس قدر اچھے اور اتنا جذباتی ہے کہ یہ تجویز سننے ہی وہ خود کو گولی مار لے گا۔ میرے منہ میں خاک۔۔۔“ وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

”بہر حال اس مسئلے کا کوئی حل سوچو اس سے پہلے کہ بات باہر نکلے تم یہ قصہ نہ بنا دو۔“ مرنعلی مخلصانہ مشورہ دے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

محلے میں شادی تھی۔ سارا اہل محلہ مدعو تھا۔ اسری کی طبیعت کچھلے دو دونوں سے سخت خراب تھی اس لیے صرف حماد، حمزہ اور حمزہ وہاں گئے تھے۔ حسب معمول مزہ اور حمزہ میں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی۔ دونوں میں اتنی ذہنی قربت اور یگانگت تھی کہ اپنا ہر احساس ایک دوسرے سے شیئر کیے بنا چین نہیں پڑتا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔ حضرت پہنچانا مجھے؟“

”شلوار میس پر و اسٹ پہنے ایک بارش اور معزز شخص نے لوگوں کی بھیڑ میں حماد تک رسائی حاصل کی تھی۔“

”اوہ معاف کیجیے گا، مجھے صحیح سے یاد نہیں آ رہا۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہم صرف ایک دفعہ ملے ہیں اب تک، آپ کو ضرور میری صورت بھول گئی ہوگی، مگر حضرت میں آپ کو ہزاروں کے جمع میں بھی الگ پہچان سکتا ہوں۔ میں اس ادارے کا منتظم ہوں جہاں سے آپ دو بچے لائے تھے۔ یہ وہی بچے ہیں نا؟“

”جی۔ جی۔۔۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے۔“ حماد نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

”بالکل ٹھیک۔۔۔ جناب میں تو اکثر آپ کی مثال دیتا ہوں کہ ایسے خدا ترس اور نیک نفس انسان بھی ہوتے ہیں۔ آئے تھے ایک بچہ لینے مگر دوسرا بچہ روتا ہوا دیکھا تو اس کا خاندان یا حیثیت کو بچھے بغیر اس کو بھی ساتھ ہی گولے لیا۔ دونوں بچوں کے والدین کی روحیں آپ سے بے پناہ خوش ہوں گی کہ آپ نے ان کے بچوں کو اتنے پیار سے رکھا۔ ویسے حیرت کی بات ہے دونوں بچوں کی شکلیں آپ میں

بے مل رہی ہیں جیسے سچ سچ کے بہن بھائی ہوں۔“

کچھ کھڑے حمزہ اور مزہ کو جیسے سکتے ہو گیا تھا اور ارد گرد کھڑے ان دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے محلے والے، حماد کی پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطرے ان کی شدید گھبراہٹ اور بے بسی کی علامت تھے۔

☆☆☆

حمزہ تین دن سے لا پتا تھا۔

مزہ تین دن سے اپنے کمرے میں بند تھی۔

حماد تین دن سے آفس نہیں گئے تھے۔

اور اسری تین دن سے جلے پیر کی لمبی کی طرح گھر میں یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہی تھی۔

”پہلے ہم سمجھتے رہے ہم آپ کی اولاد ہیں، باشعور ہوئے تو پتا چلا ہم تو لے پا لک ہیں۔ ہم نے ن بات کو نظر انداز کر دیا کہ اس سے رشتے میں فرق نہیں پڑتا۔ پھر آج انکشاف ہو رہا ہے کہ ہم تو ایک ن باب کی اولاد ہی نہیں ہیں۔ آپ دھوکا دیتے رہے ہمیں؟ تماشا دیکھتے رہے ہمارا۔ مجھے بتائیے آخر وہ کون سی مصلحت تھی جس نے آپ کو حقیقت بتانے سے روک رکھا؟“

”ہم تم دونوں کو دھکی نہیں دیکھ سکتے تھے بیٹا!“ اسری عاجز انداز میں گویا تھی۔

”دکھی۔۔۔ ہونہ۔۔۔“ وہ طنز آبوللا۔ ”اور اب۔۔۔ اب تو جیسے ہم بہت سکون اور سکھ میں آ گئے ہیں؟“ وہ پیر پختا جنونی انداز میں باہر نکل گیا۔

تین دن بعد آیا مگر ایسے جیسے وہ کسی سرائے میں آیا ہو۔

اور جس دن وہ آیا اسی شام اسری کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ جانبر نہ ہو سکی اور اگلے تین دن بعد اس کی میت گھر میں پڑی تھی۔

حماد آفس میں تھے جب انہیں اسری کے انتقال کی خبر ملی۔ گزشتہ دو دنوں سے وہ گھر میں رہے تھے۔ صرف آج کچھ ضروری فائلز دینے کے لیے آفس آئے تھے اور ان کے پیچھے موت کا فرشتہ اسری تک پہنچ گیا۔

وہ دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے آفس سے نکلے تھے اور کچھ کبھی گھر واپس نہ آ سکے۔ ایک بس تیز رفتاری کے عالم میں انہیں پکیتی ہوئی زندگی سے بہت دور کر کے خود آگے بڑھ گئی تھی۔

یوں وہ دونوں نئے سرے سے ”یتیم“ ہو گئے۔

”آپ کی وجہ سے ہوا ہے یہ سب کچھ، صرف آپ کی وجہ سے۔“ مزہ پاگلوں کی طرح حمزہ کو جھنجھوٹنے لگی۔

”میری، میری وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ حمزہ نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں۔ کچھ میری بھی غلطی ہے کہ تین دن ان سے منہ موڑے ان کا دل تو زنی رہی اور بہت بڑا گناہ آپ سے سرزد ہوا ہے، آپ انہیں دھتکار کے ان کے جذبول کو چل کے تین دن تک گھر سے غائب

رہے۔ ان ظالم تین دنوں نے امی کو ختم کر دیا تھا اندر سے۔ پھر بابا بھی چلے گئے۔“ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور حمزہ برسوں بعد وہی خاموش آنسو بہا رہا تھا جو اپنے حقیقی باپ کی موت پر بہائے تھے۔ مگر اب اس دنیا میں کوئی اور حماد یا اسری نہیں رہے تھے جو ان آنسوؤں کی گہرائی اور کرب سمجھ کر اس کو اپنی محبت و تحفظ بھری آغوش میں چھپا لیتے۔

☆☆☆

”دیکھو بیٹے! میری بات تحمل سے سننا۔“ علی انکل اور مسز علی بڑی مشکل سے تمہید باندھتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آئے تھے۔

”تمہاری امی اور بابا کے انتقال کو دو ماہ گزر چکے ہیں۔ کچھ بھی ہے یہ تو بہر حال طے ہے کہ مرنے والے کے ساتھ مرنا نہیں جاتا۔ زندگی کی سڑک ایک موڑ پر نہیں ہوتی بلکہ دوسرے موڑ سے پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اصل میں اب لوگ باتیں کر رہے ہیں۔“

علی انکل نے بہت احتیاط سے ہنچکاتے ہوئے حمزہ کو مخاطب کیا تھا۔

”کس قسم کی باتیں؟“ وہ حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم دونوں کے ساتھ رہنے پر۔۔۔“

”مگر ہم تو گزشتہ چوبیس سالوں سے ساتھ رہ رہے ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولا۔ گہرائی تک ابھی بھی نہیں پہنچا تھا۔ اب کے علی انکل نے مدد طلب نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھا تھا۔ مسز علی اٹھ کر حمزہ کے قریبی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”دیکھو بیٹے! پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ دونوں حقیقی بہن بھائی نہیں ہو۔ دونوں کو شرعی و معاشرتی اور اخلاقی حدود کا خیال کرتے ہوئے۔۔۔“ بات اتنی بڑی تھی کہ ایک لمحہ بھر کو مسز علی کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔

”بہتر یہ ہے کہ تم دونوں آپس میں نکاح کر لو تاکہ۔۔۔“

”خاموش ہو جائیں۔ پلیز خاموش ہو جائیں۔“ حمزہ تھڑا کر ہاتھ سے انہیں اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

”آگے کچھ نہ کہیں، میرا دل بند ہو جائے گا۔“ وہ بری طرح کھڑ گیا۔

”ارے مزہ نہ بنی کو کیا ہوا؟“ علی انکل نے پردے کے پیچھے سے دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی تھی، لیکر گئے تو حمزہ کو فرش پر بے ہوش گرایا تھا۔

حمزہ کے کمرے میں بری طرح ادھر سے ادھر چکر لگانے کی رفتار میں بلا کی تیزی آتی جا رہی تھی۔ اس کی مٹھیاں بچھی ہوئی تھیں اور کنبیوں کے پاس گویا لادہ رکھا تھا۔

”ایک بھائی نے اپنی بہن سے شادی کر لی۔ معاذ اللہ میں نکاح کروں، اس لڑکی کے ساتھ جس کو آنکھ کھولنے سے لے کر اب تک اپنی سگی بہن کے روپ میں دیکھتا رہا ہوں۔“

”دیکھو بیٹے! یہ لڑکی انہونی بات نہیں ہے۔ منہ بولے بہن بھائی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ پھر میں تمہیں ایک مثال دوں، ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لے پالک بیٹے کی مطلقہ بیوی سے

نادی کی اور دنیا والوں کو بتایا کہ شادی صرف حقیقی محرم رشتوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جو نامحرم ہو اس سے نادی جائز ہے۔ تم ہمیشہ سے مزہ سے محبت کرتے رہے ہو۔ اس کا خیال رکھتے آئے ہو۔ اب بھی وہی سب کچھ تمہارے درمیان رہے گا۔ صرف اتنا فرق ہوگا کہ رشتے کی نوعیت اور تقاضے بدل جائیں گے۔ کچھ میں زیادہ اصرار نہ کرتا مگر تمہاری امی نے اپنی موت سے ایک دن پہلے یونہی باتوں باتوں میں میری سز سے ذکر کیا تھا کہ وہ صحت یاب ہو کر تم دونوں کو آپس میں حقیقی شرعی رشتے میں باندھ دیں گی۔

بات تو کھل ہی چکی ہے۔ تکلیف تو تم دونوں اٹھا ہی چکے ہو پھر خواہ خواہ کی آنا کافی کیوں۔ کیونکہ اب یہ بات سب کو پتا چل چکی ہے اور جہاں مزہ یا تمہارا رشتہ کیا گیا وہ ضرور اس بات پر معترض ہوں گے کہ ایک نامحرم رشتے کو محرم کے طور پر کیوں رکھا اور اگر ایسا کر ہی لیا تھا تو لڑکائی کو بتایا کیوں نہیں، کیا پتا دونوں میں کیا رشتہ رہا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب کیا تم اپنی مری ہوئی ماں کی خواہش بھی پوری نہیں کرو گے؟“

علی انکل کی باتوں نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

”انکار بھی نہیں کر سکتا اور اقرار بھی نہیں کر سکتا۔ بس پھر آخری حل یہی ہے کہ میں خود کو بیچ میں نکال دوں۔“ اس نے ایک دم فیصلہ کیا اور اپنے کمرے میں جا کر الماری کی دراز سے ریو اور نکالا اور اپنی کپڑی پر رکھ کر نشانہ لے لیا۔

ٹرانسنگر دبانے کو تھا کہ مزہ ناچک اس کے کمرے میں آنکلی اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ریو اور والا ہاتھ نیچے گرا دیا مگر جب تک ٹرانسنگر دب چکا تھا، گولی کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”فساد کی جڑ میں ہوں ناں، خود کو کیوں مارتے ہیں۔ مجھے ماریے۔ مجھے ختم کر دیجیے۔“ وہ قالین پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

وہ تھکے ہوئے شکست خوردہ انداز میں ریو اور دوبارہ الماری میں بند کر کے باہر نکل گیا تھا۔ پھر یہ کارروائی بہت خاموشی سے ہوئی۔

علی انکل اور مسز علی نے کچھ معزز لوگوں کو جمع کر کے دونوں کا نکاح پڑھوا دیا۔

اس کاغذی نکاح کے بعد حمزہ صرف دس دن اس چھت کے تلے رہا تھا پھر وہ باہر چلا گیا۔

مگر وہاں رہ کر بھی وہ اس کی خبر گیری کرنا نہیں بھولا تھا۔ حماد صاحب کا مکان سرکاری تھا لہذا تین ماہ بعد خالی کر لیا گیا۔ حمزہ نے خاموشی سے گھر کا کچھ سامان بیچا اور کمرہ کرائے پر لے لیا۔ جاب تو وہ گزشتہ ماہ سے شروع کر ہی چکی تھی۔

اور پھر زندگی نے خاموشی سے پانچ سالوں کا طویل سفر طے کر لیا۔

☆☆☆

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا میں کیا کروں، کس طرح کسی اور رشتے سے تمہیں مخاطب کروں انتہائی دباؤ کے تحت میں نے یہ کاغذی رشتہ تو تم سے جوڑ لیا ہے لیکن میں گزشتہ دس دنوں سے ہر لمحہ خود سے نفرت محسوس کر رہا ہوں۔ تمہاری موجودگی میں، اس گھر میں، اس محلے میں بلکہ اس ملک میں میرا دم

گھٹنے لگا ہے۔ میں باہر نکلتا ہوں تو لگتا ہے ہر آنکھ مجھ پر ہنس رہی ہے کہ یہ دیکھو جس نے اپنی بہن سے نکاح کر لیا۔ میں تم سے بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں اس رشتے کے ساتھ تمہارا سامنا نہیں کر سکتا نہ ہی تم ایسا کر سکو گی۔ مجھے نہیں پتا میں حج کر رہا ہوں یا غلط، مگر میں فی الوقت فرار چاہتا ہوں۔ ان سب لوگوں سے اور جگہوں سے جو مجھ سے آشنا ہیں۔ شاید بھی لوٹ آؤں یا شاید کبھی نہ لوٹوں۔“

یہ وہ خط تھا جو مزہ کو اس کے امریکہ فلائی کر جانے کے بعد ملا تھا۔

اس کے بعد پانچ سال تک ان میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

”جو کچھ ہوا اس میں قصور یا خواہش تو بہر حال میری بھی نہیں تھی۔ پھر تم حل نکالنے کی بجائے بیچ منجد ہار میں مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ بے سہارا کر کے یوں غائب ہوئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ایک کمزور لڑکی معاشرے کے ان بے رحمانہ پیٹھروں سے کیونکر لڑے گی۔“

مزہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

رات کا چھپلا پہر تھا۔ گھور سناٹا اور تاریکی، فقط اس کے آنسوؤں کے چراغ روشن تھے۔

”میں نے بھی تم سے یہ بندھن نہیں باندھنا چاہا تھا۔ میرے لیے بھی یہ موت سے برتر سزا تھی۔ تم نے تو اس سزا سے فرار کے لیے ملک بدل لیا۔ مگر میں کیا کرتی۔ میں تو کہیں کی بھی نہ رہی تھی۔ تم بزدل تھے حمزہ علی! اتنی جرأت ہوتی تو ڈنڈ کر یہ رشتہ جوڑنے سے انکار کر دیتے۔ معاشرہ بھلے جو مرضی کہتا رہتا۔ مگر تم ایسا نہ کر سکے۔ مجھے کاغذی چھت تو فراہم کر دی مگر عملی میدان میں میرا ساتھ دینے اور میری حفاظت کرنے کے بجائے آرام سے فرار ہو گئے۔ میرا کیا قصور تھا اس میں؟ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ احساسات صرف تمہارے ہی مجروح نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پر بھی اتنی ہی قیامت ٹوٹی تھی میں بھی نکاح کے فارم پہ سائن کر کے بارہا خود سے نفرت کی تھی۔ تمہارا سامنا کرنے کا سوچ کر ہزار مرتبہ جیتی مرتی تھی۔ مگر میں نے تو بہر حال میدان نہیں چھوڑا۔“

صبح کی اذانیں ہونا شروع ہوئیں تو وہ اپنے پرانگندہ خیالات سمیٹ کر ہمتیں جوڑتے ہوئے وضو کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

علی انکل پر بڑا تم ٹوٹا تھا۔

ان کی بہو اور پوتا سمندر کی سیر کے دوران بوٹ الٹ جانے کے باعث ڈوب کر ہلاک ہو گئے تھے۔

ان کا بیٹا عباس بیوی اور بیٹے کی لاش کے ساتھ دو بیٹیوں سمیت لٹا پٹا وطن واپس آیا تھا۔

مزہ کو اطلاع ملی تو وہ ان کے دکھ کے احساس سے آبدیدہ ہو گئی۔

وہ دس دن تک باقاعدہ ان کے ہاں انفسوس کے لیے جاتی رہی۔ بیٹے اور بیوی کی حادثاتی موت نے عباس بھائی کو پتھر بنادیا تھا۔ مزہ ان کی دونوں بچیوں کو سہاوارا ہوا اور افسردہ دیکھتی تو اس کا دل کٹ کے رہ جاتا۔ بڑی بیٹی کی عمر چار سال اور چھوٹی کی تین سال تھی۔

علی انکل سے پتا چلا تھا کہ حمزہ بھی باقاعدگی سے آ رہا تھا۔ وہ پاکستان آچکا تھا اور انکل سے ملا بھی

تھا مگر ان کے اصرار کے باوجود وہ مزہ کے گھر نہیں گیا تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ دونوں کا آئنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اور مزہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا۔

☆☆☆

”میں کیا کروں۔۔۔؟“ بہت عرصے بعد غزل اپنا مصنوعی روپ اتار کر بے بسی و سادگی سے اس کے سامنے اپنا آپ کھولے بیٹھی تھی۔

”مجھے سکون نہیں ملتا، میرا ضمیر، میرے احساسات میری روح کا ہر تار مجھ پر کوڑے برساتا ہے۔ میں کتنی غلیظ ہو چکی ہوں، شاید میں بھی نہیں جانتی اس کی گہرائی کو۔ مجھے پاک ہونے کا طریقہ بتا دو مزہ۔“ وہ ہار کر رو پڑی تھی۔

”اللہ سے رجوع کرو غزل! اس سے مانگو، وہ تمہیں سب کچھ دے گا دل کا سکون بھی اور روحانی پاکیزگی بھی۔“

”میں بہت دور جا چکی ہوں مزہ! میں کیسے اس پاکیزگی تک پہنچ سکتی ہوں۔“ پچھتاوے کے ناگ اسے بری طرح ڈس رہے تھے۔ وہ بہت دنوں سے بری طرح بے چین تھی۔ اس کے اندر کوئی الاؤ بھڑک رہا تھا۔

پھر کچھ دن گزرے اور غزل اچانک لپٹا ہو گئی۔

”میرا خیال ہے وہ گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا چکی ہے کیونکہ وہ اپنی چیزیں بھی ساتھ لے جا چکی ہے۔“ ثنائے خیال ظاہر کیا تھا اور وہ کہاں گئی تھی یہ بھی کچھ عرصے بعد معلوم ہو گیا۔

اس نے جسمانی طور پر معذور لاوارث بچوں کے ادارے میں جاب کر لی تھی۔ رہائش کی سہولت اسی ادارے میں موجود تھی اس لیے وہ خاموشی سے گیسٹ روم چھوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اس دن وہ علی انکل کے ہاں گئی تو انہیں کسی گہری سوچ میں ڈوبے پایا۔

”انکل! خیریت ہے۔ کس سوچ میں گم ہیں آپ؟“

اس نے ان کی نزدیکی کر سی سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔

”عباس کی چھوٹی چھوٹی بچیاں، ان کی دیکھ بھال، بچوں کو ماں چاہیے اور اس کے لیے عباس کو دوسری شادی بہر حال کرنی ہی پڑے گی۔ اس سلسلے میں تم کوئی مشورہ دو۔“

”میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں انکل!“ وہ پھینکی سی مسکراہٹ لیے گویا ہوئی۔

”کوئی مناسب رشتہ تلاش کرو۔ میرا خیال ہے تم یہ کام بہت اچھے طریقے سے کر سکتی ہو، تمہاری آنٹی کو تم جانتی ہو مسلسل بیماری کے باعث زیادہ نہیں آتی جاتی ہیں۔“

”اور عباس بھائی، ان کی بھی تو کوئی مرضی ہوگی۔ وہ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟“

”اللہ کا شکر ہے، میرے بچے ماں باپ کے کہے کو مان دیتے ہیں۔ وہ ہمارا کہا نہیں ٹال سکے گا۔ تم بس اپنا کام کرو۔“ مزہ نے سر ہلا دیا۔

اس کے ذہن میں ایک چہرہ آیا تھا۔

نے جان بوجھ کر ذل اندازی کی تھی۔

”نہ دور جاپاتا ہوں، نہ قریب آنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔“ وہ پیشانی مسلنے لگا۔

”خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔ کچھ وقت دو ایک دوسرے کو اور فی الوقت یہ کرو کہ مزہ کو اس کے لیٹ ہاؤس تک چھوڑ دو، اس کی گاڑی کی مجھے ضرورت ہے۔ میری کار کی بیٹری ڈاؤن ہے اسے کون ہلکے لگا کے اشارت کرے گا۔ میں شام کو تمہاری کار گیٹ ہاؤس پہنچا دوں گا۔“ وہ مزہ سے مخاطب دے۔

کیا زبردست بہانہ ڈھونڈا تھا انہوں نے ان دونوں کی یکجائی کا۔

”آؤ بیٹھو۔۔۔“ حمزہ خاموشی سے اسے لے کر گاڑی تک آیا اور فرنٹ ڈور کھولا اس نے مزہ کی ریف ہیلی بار سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

اور جگر کے سفید کڑھائی والے سوٹ میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ حسین تو وہ پہلے بھی بہت نمی گراب جیسے اس کے حسن کے سارے ہی رنگ کھل چکے تھے۔ ایک باوقار حسین عورت کے روپ میں وہ اس کے مقابل تھی۔

”کس طرف کو ہے گھر۔۔۔؟“ وہ گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

”جب آپ ٹھکانہ جانتے ہیں تو پوچھ کیوں رہے ہیں؟“ وہ قدرے طنز سے جواب دے کر باہر بیکھنے لگی۔

”آپ نے خواجہ زحمت کی۔ آپ کی خبر گیری یا بے خبری سے میری ذات پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔“

”مگر مجھ پر تو پڑتا تھا۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

مزہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے چکلتے ہوئے خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔

”پچھلے سال سے پاکستان میں ہوں، مگر ابھی تم سے سامنا کرنے اور حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے تھا اس لیے کتر اتار رہا۔“

وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔ نظریں ونڈا سکرین پر جمی ہوئی تھی۔

”تم کیسی ہو، کتنا عرصہ ہو گیا ہے تم سے کوئی بات کیے۔ کیا کیا اتنے سال؟“ اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

مزہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

”جانے دیجیے، جو بیت گیا سو بیت گیا۔“ اس کا لہجہ گلو گیر تھا۔

”آپ نے ساتھ چھوڑ دیا تو کیا ہوا۔ اللہ نے مجھے آسرا دینا تھا سو وہ مشکل راستے آسان بناتا گیا۔“

”مجھے اب اپنے اس جذباتی فیصلے پر سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔ کچھ بھی تھا مجھے تمہیں یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ جو دکھ میرا تھا، مجھ سے بڑھ کر تمہارا بھی تو تھا۔ امی اور بابا کی رحمتیں کتنا ترپتی ہوں گی تمہیں تنہا پا کر۔“ وہ کرب سے بولا۔

شنا کا چہرہ۔ اس میں ہر خوبی تھی۔ ماسوائے اس کے کہ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ مگر عباس بھائی پہلے ہی صاحبِ اولاد تھے انہیں اولاد کی ضرورت نہیں تھی۔ ثنا ان کے لیے بہترین جیون ساتھی ثابت ہو سکتی تھی۔

”میں چلتی ہوں انکل!“ مزہ پرس سنبھال کر ابھی، پلٹی، مگر پھر ٹھٹک کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

گرے سفاری سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں بریف کیس پکڑے آنکھوں میں عجیب سے کرب آمیز تاثرات لیے وہ حمزہ علی ہی تھا۔

”رک جاؤ دونوں یہیں۔ کیوں چوروں کی طرح صحنہ چھپا رہے ہو۔ کیا پڑا کے بھاگے ہو ایک دوسرے کا۔“ علی انکل اٹھ کر دونوں کے بیچ میں کھڑے ہو گئے اور حتیٰ سے دونوں سے مخاطب ہوئے۔

دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور نظریں اپنے جوتوں پر تھیں۔

”بلی چو ہے کا یہ کھیل آخر کب تک جاری رہے گا؟“ علی انکل کی سنجیدگی بدستور تھی۔

”برخوردار ہمارے زمانے میں ایک حویلی میں چار چار خاندان آباد ہوتے تھے۔ سب کے بچے بھی اکٹھے پل کے جوان ہوتے تھے۔ سب ایک دوسرے کے بہن بھائی ہی کہلاتے تھے اور وہی عزت اور محبت ہوتی تھی دل میں۔ بعد میں بزرگ پکڑ کے کسی کا جوڑ کسی سے ملا دیتے اور یوں وہ عزت و محبت از دو اچی رشتے میں بدل جاتی تھی۔ میں مانتا ہوں تمہارے معاملے میں کافی کچھ مختلف ہوا۔ جو بیس سال تک تم لوگ خود کو بہن بھائی سمجھتے رہے۔ پھر انکشاف ہوا کہ خون کا کوئی رشتہ بیچ میں کبھی تھا ہی نہیں۔

تم دونوں کا رد عمل قدرتی تھا۔ تمہارے بابا نے اور امی نے تمہیں معاشرتی دباؤ اور مسائل سے بچانے کے لیے مجبوراً یہ تجویز کیا تھا کہ تمہیں ایک شرعی رشتے میں جوڑ دیا جائے تاکہ تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہو۔ اس میں ایسا کیا غلط تھا جو اتنا شدید رد عمل ظاہر کیا کہ پانچ سال گواہی اور اس کے بعد بھی کوئی احساس نہیں جا گا؟“

حمزہ پیر کے انگوٹھے سے لان کی گھاس کر پیدر ہاتھ۔ مزہ بت بنی کھڑی تھی۔

”اور حمزہ! میں تمہیں اتنی فیصد قصور وار ٹھہراؤں گا کہ تم بجائے رشتے کو مضبوطی اور تحفظ فراہم کرنے کے یہاں سے فرار ہو گئے۔ اس بے چاری لڑکی کو معاشرے کے مسائل سے نپٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ نیا رشتہ نہ نبھاتے، پرانے رشتے کے ناتے جو تم پر اس کی معاشرتی و معاشی ضروریات اور تحفظ کا حق بنا تھا وہ تو پورا کرتے۔“

”میں شرمندہ ہوں۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

پانچ سال بعد مزہ نے اس کی آواز سنی تھی۔

”اگر شرمندہ ہو تو پھر باز آ جاؤ مزید وقت برباد کرنے سے اور یوں ذہنی عذاب سے گزرتے رہنے سے کیا حاصل ہے۔ نارمل انسانوں والی زندگی چو۔“

”مجھے اتنا عرصہ گزار کر بھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح زندگی کا آغاز کروں۔“ وہ بہت بھجا بھجا اور شکست خوردہ تھا۔

”تم کچھ مت کرو۔۔۔ زندگی کو خود موقع دو کہ وہ تمہیں آغاز و انجام سے آگاہ کرے۔“ علی انکل

”چھوڑے، یہ بتائیے آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟“
 ”پہلے تو ہوسٹل میں وقت گزارتا رہا۔ پھر کچھ ماہ پہلے ایک گھر خریدا ہے۔ اپنے اور تمہارے لیے۔“
 ”مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس انتظام ہے گھر کا۔“ مزنہ نے فوری ردِ عمل ظاہر کیا۔
 ”یہ تو مجھے بھی بتا ہے، مگر تمہارا اصل ٹھکانہ تو وہ گھر ہی ہے جو میں تمہیں دوں گا۔ بہت کرلیئر
 حماقتیں۔ اب زندگی منطقی انداز میں گزرے گی۔ اور مزنہ! مجھے یقین ہے ہم ساتھ رہیں گے تو خود بخود
 سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہمارے درمیان نارمل رشتہ قائم ہو جائے گا۔ مگر مجھے
 یقین ہے ایک دن ہم نارمل لوگوں کی طرح جینا ضرور سیکھ لیں گے۔ بات تو ساری احساس کی ہوتی ہے۔“
 تا۔

اس نے آہستگی سے اس کی جانب مڑتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
 مزنہ کا جی بھرا آیا۔ بہت مدت بعد کسی کے شانے پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے کو دل چاہتا
 تھا۔
 ”قصور نہ تمہارا تھا نہ میرا۔ قصور ہمارے والدین کا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے نیک نیتی کے جذبے
 کے تحت ہمیں ہمارے رشتے کی اصلیت سے آگاہ نہیں کیا۔ لیکن ایک بات اس سے ثابت ہو جاتی ہے کہ
 کسی بے اولاد میاں بیوی کو اپنے لے مالک بچوں پہ یہ ستم نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو ایک ہی گھر کے دو
 لیں یا پھر صرف ایک بچہ لیں۔ دو مختلف گھرانوں کے بچوں کو بہن بھائی بنا کر یکجا کرنا اور دنیا کے سائے
 پیش کرنا بہت گہیر اور بھیانک مسائل کا باعث بن جاتا ہے۔“
 حمزہ آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

”کیا تم اب بھی مجھ سے ناراض ہو؟ رشتہ ضرور بدلا ہے مگر میں آج بھی تمہاری بہت کیئر کر
 ہوں۔ تم سے جو محبت اور وابستگی ہے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ تم کیا کہتی ہو؟“ حمزہ نے ابا
 ہاتھ کا دباؤ اس کے کندھے پر بڑھا دیا۔
 جواب میں مزنہ نے خاموشی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

